دامن امید کے ساتھ معرکہ آرائی....... الطاف حسن قریشی کا چشم کشا تجزیہ
رمضان مبارک
اپریل 2023ء
اردو ڈائجسٹ
www.youtube.com/urdudigest
urdudigest.pk
www.urdudigest.pk
امریکی بینکنگ فلاش
عوام کا اپنے بینکوں سے اعتماد اُٹھ گیا
svb

قرشی
گیسٹوفل
گیس، سینے کی جلن اور بدہضمی کیلئے
سحری ہو یا افطاری...
طبیعت نہ ہو بھاری!
قرشی
گیسٹوفل
www.qarshi.com
QarshiNaturalHealth

بانی۔ ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی ۱۹۲۸ء-۲۰۲۰ء

اُردو ڈائجسٹ

اپریل 2023
رمضان/شوال 1444ھ
جلد 63 شمارہ 2

www.urdudigest.pk
urdudigest.pk
www.youtube.com/urdudigest
www.urdudigest.dukan.pk

تفصیلات خریداری (اندرون و بیرون ملک)

		Rs	بذریعہ ڈاک
قیمت فی شمارہ		290 علاوہ محصول	
سالانہ	12 پرچے	2425	USD 130
ششماہی	6 پرچے	1270	USD 70

گزشتہ شمارے بھی دستیاب ہیں

Subcription@urdudigest.pk
+92-42-35290707 0333-4713631

رقم کی ترسیل بذریعہ منی آرڈر/آن لائن/جاز کیش
آن لائن ادائیگی Current A/c No.
UrduDigest Publications
PK 34 BPUN 6010 0527 0140 0011
Bank of Punjab (Samanabad Lahore)
Branch Code No.110

بکنگ اشتہارات (ڈیجیٹل/پرنٹ میڈیا)
0320-4437564
urdudigest1961@gmail.com

نگارشات و خطوط
+92-42-35290738-39
editor@urdudigest.pk

ادارتی آفس (برائے تجارت و منی آرڈر)
325-G-III، جوہر ٹاؤن لاہور۔ طابع و ناشر الطاف حسن قریشی نے اردو ڈائجسٹ پرنٹرز 24-ہر گوبند روڈ سے چھپوا کر کے دفتر سے شائع کیا

ایگزیکٹو ایڈیٹر نوٹ

امریکی بینک بھونچال کی زد میں

امریکا معاشی و عسکری طور پر دنیا کا سب سے طاقتور ملک ہے مگر اللہ تعالیٰ بھی وقتاً فوقتاً اُسے جھٹکے دے کر آشکارا کرتے رہتے ہیں کہ وہ اپنی حدود میں رہے، ورنہ پیوندِ خاک ہو جائے گا۔ روس اور چین سے اس کا زبردست ٹکراؤ تو جنم لے چکا، اندرونی طور پر بھی امریکا بتدریج کمزور ہو رہا ہے۔ اس امر کی تازہ مثال امریکی بینکاری نظام میں زلزلہ آنا ہے جس نے عالمی معیشت پر بھی اثرات مرتب کیے۔

عالمی لین دین کی کرنسی، ڈالر کا مالک ہونے کی بنا پر امریکا کے بینک بھی بین الاقوامی معیشت میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ معاشیات میں اصطلاح ''منظم اہم مالیاتی ادارہ'' (Systemically imoportant financial institution) مروج ہے۔ یہ ایسے مالیاتی اداروں خصوصاً بینکوں کے لیے استعمال ہوتی ہے جن کے دیوالیہ ہونے سے عالمی معیشت میں بھونچال آ سکتا ہے۔ دنیا کے ایسے دس بڑے منظم اہم مالیاتی اداروں میں چار امریکا اور دو اُس کے حواری برطانیہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ حقیقت بین الاقوامی سطح پر امریکی بینکوں کی اہمیت واضح کرتی ہے۔ یہ امریکی بینک بھی امریکا کی عالمی طاقت کا استعارہ ہیں۔

یہی وجہ ہے، پچھلے ماہ کے دوسرے ہفتے یکے بعد دیگرے تین امریکی بینکوں کا جنازہ نکلا، تو دنیا بھر میں کھلبلی مچ گئی۔ جنوبی امریکا سے لے کر آسٹریلیا تک کی اسٹاک مارکیٹوں میں بینکوں کے حصص کی مالیت میں گراوٹ آ گئی۔ اور ممالک کے سنٹرل بینک اپنے اپنے بینکوں کو دیوالیہ ہونے سے بچانے کی خاطر مختلف اقدامات کرنے لگے۔ حیرت انگیز امر یہ کہ امریکی حکومت نے شعبہ بینکاری میں از خود زلزلے کو جنم دیا۔ اِس کا سنٹرل بینک (فیڈرل ریزرو) شرح سود بڑھا رہا ہے۔ اِسی عمل نے امریکی بینکوں کو ملیامیٹ کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ کچھ حصہ سام بینک مین جیسے احمق اور لالچی امریکیوں نے ڈالا۔ اِسے کہتے ہیں اپنے پیروں پر خود کلہاڑی مارنا!

امریکی بینکوں میں بھونچال کا آغاز ۱۰ مارچ سے ہوا جب ریاست کیلیفورنیا میں واقع سلور گیٹ بینک دیوالیہ ہو گیا۔ یہ کرپٹوکرنسی کے صارفین کو خدمات مہیا کرتا تھا۔ جب سام بینک مین کا ایف ٹی ایکس اسٹاک ایکسچینج دیوالیہ ہوا، تو بینک کے کئی کلائنٹس اُس کا ساتھ چھوڑ گئے اور اُسے خاصا مالی نقصان ہوا۔ بینک نقصان برداشت نہ کر سکا اور اُس کا دیوالیہ نکل گیا۔

اِس کے بعد امریکا کے سولھویں بڑے بینک، سلیکون ویلی بینک کی باری آئی۔ یہ ادارہ اندرون و بیرون ملک ''ابھرتی'' (سٹارٹ اپ) کمپنیوں کو قرضے دینے میں شہرت رکھتا تھا۔ نیز امریکا، برطانیہ، آسٹریلیا، بھارت وغیرہ سے تعلق رکھنے والی سینکڑوں کمپنیوں کی بھاری رقومات اُس میں جمع تھیں۔ ڈیپازٹس کی کُل مالیت ۲۰۰ ارب ڈالر سے زائد تھی۔ اِس رقم کی وسعت کا اندازہ یوں لگائیے کہ پاکستان کا کُل بیرونی قرضہ ۱۵۰ ارب ڈالر ہے۔

سلیکون ویلی بینک نے اپنا بیشتر سرمایہ امریکی حکومت کے طویل المعیاد بانڈز خرید کر لگا رکھا تھا۔ اِسی دوران ڈالر کی شرح سود بڑھ گئی۔ کمپنیوں نے قرضے لینے بند کیے اور بینکوں میں محفوظ اپنے سرمائے نکال کر روزمرہ اخراجات پورے کرنے لگیں۔ اِس صورتِ حال میں سلیکون ویلی بینک مصیبت میں پڑ گیا کہ اُس کے پاس نقد رقم کم تھی۔ اُسے پھر مجبوراً بانڈ بیچ کر سرمایہ حاصل کرنا پڑا۔

بینک نے چونکہ قبل از وقت بانڈ فروخت کیے، لہٰذا اُسے خسارہ برداشت کرنا پڑا۔ (اگر وہ وقتِ مقررہ پر بیچتا، تو اُسے بھاری منافع ہوتا)۔ یہ خسارہ معمولی نہیں دو ارب ڈالر پر مبنی تھا۔ یہ خبر بینک سے باہر نکل گئی اور یہ اطلاع بھی کہ بینک مزید بانڈ بیچ کر ایک ارب ڈالر حاصل کرنا چاہتا ہے۔ محض بیس سال قبل کا زمانہ ہوتا، تو یہ خبریں گاہکوں میں پھیلتے ہوئے کئی دن لگا دیتیں۔ مگر اب سوشل میڈیا کے دور میں خبریں جنگل کی آگ کے مانند کلائنٹس میں پھیل گئیں۔ اُن خبروں نے یہ تاثر دیا کہ بینک دیوالیہ ہونے والا ہے۔ لیجیے، ہر کوئی بینک سے اپنا سرمایہ نکالنے دوڑ پڑا۔ بینکاری کی اصطلاح میں یہ انوکھا عمل ''بینک دوڑ'' (Bank run) کہلاتا ہے۔ اس عمل کی بنیاد اپنی جمع پونجی سے ہاتھ دھونے کا خوف ہے جو انسان کو سکون سے بیٹھنے نہیں دیتا۔

بے چارا سلیکون ویلی بینک تو ایسی زبردست ''بینک دوڑ'' کا شکار ہوا کہ متفکر گاہکوں نے صرف ایک دن میں اُس سے ''۵۵ ارب ڈالر'' نکال لیے۔ آخرکار وہ لمحہ آن پہنچا کہ بینک میں رقم نہ رہی۔ تبھی ۱۰ مارچ کو اُس نے اپنے دیوالیہ ہونے کا اعلان کر دیا۔ رقم کا حجم دیکھتے ہوئے یہ امریکی تاریخ میں بینک دیوالیہ ہونے کا دوسرا بڑا واقعہ ہے۔ اِس طرح بینک نے غصیلے کلائنٹس سے جان چھڑائی۔

دو دِن بعد سگنیچر بینک (Signature Bank) کا نمبر آیا۔ اِس بدقسمت کو تو پہلے دو دیوالیہ شدہ بینک لے ڈوبے۔ اُن کی موت کا سندیسہ عام ہوا، تو بینک کے کلائنٹ عالمِ پریشانی میں اپنی جمع شدہ رقوم نکالنے لگے۔ چند دن میں ۱۰ ارب ڈالر نکل گئے۔ اُس کے پاس بھی نقد رقم نہ رہی، تو وہ اپنی دکان بند کرنے پر مجبور ہو گیا۔ اگلے دن انکشاف ہوا کہ چوتھا امریکی بینک، فرسٹ ریپبلک بینک، سان فرانسسکو بھی قدم بہ قدم موت کی جانب گامزن ہے۔ تب گیارہ بڑے امریکی بینکوں نے اُس میں ۳۰ ارب ڈالر ڈال دیے تاکہ وہ ''بینک دوڑ'' کا مقابلہ کر سکے۔ اِس مدد نے اُسے دیوالیہ ہونے سے محفوظ رکھا۔

ظاہر ہے، ایک ہفتے میں چوتھا امریکی بینک بھی چل بستا، تو اندرون و بیرون ملک پریشان حال لوگ امریکی بینکوں سے اپنا سرمایہ نکالنے دوڑ پڑتے۔ تب ممکن تھا کہ دیوالیہ ہونے والے امریکی بینکوں کی لائن لگ جاتی اور حکومت امریکا کو زبردست مالیاتی بحران سے نبردآزما ہونا پڑتا۔ واضح رہے، امریکا میں چھوٹے بڑے بینکوں کی تعداد چار ہزار سے زائد ہے۔ تاہم صرف ایک سو بینک ہی ۱۵ ارب ڈالر سے زائد کے اثاثے رکھتے ہیں اور انھیں بڑا بینک کہا جاتا ہے۔ مورگان چیز سب سے بڑا امریکی بینک ہے۔ یہ ۷۷ء۳ ارب ڈالر کے اثاثے رکھتا ہے۔

شرح سود بڑھنے، روس یوکرائن جنگ، کساد بازاری اور ایندھن و خوراک کی مہنگائی کے باعث دنیا بھر میں بینکوں کا کاروبار متاثر ہے۔ صورت حال کی سنگینی کا اندازہ یوں لگایئے کہ امریکی صدر جو بائیڈن کو قوم سے مخاطب ہو کر کہنا پڑا، "گھبرانے کی ضرورت نہیں، امریکی بینکوں میں کلائنٹس کا سرمایہ بالکل محفوظ ہے۔" تاہم امریکی بینکاری نظام پر خطرات کے بادل منڈلا رہے ہیں۔ اب تک کئی امریکی بینک اپنے سینٹرل بینک سے ۱۶۰ ارب ڈالر سے زائد رقم بطور قرض لے چکے۔ اس سے قبل بینکوں نے کبھی اتنا زیادہ قرضہ نہیں لیا۔

امریکی بینکوں کے دیوالیہ ہونے سے یورپی بینکوں پر بھی منفی اثرات پڑے۔ وجہ یہی کہ ان کے کلائنٹس کو اپنے سرمائے کی فکر لاحق ہوئی کہ وہ محفوظ ہے یا نہیں! سب سے زیادہ دباؤ سوئٹزرلینڈ کے دوسرے بڑے بینک، کریڈٹ سوئیس پر پڑا جو پہلے ہی مختلف مسائل میں گھرا تھا۔ اس کے دیوالیہ ہونے کی افواہ پھیلی، تو سوئس اسٹیٹ بینک نے کریڈٹ سوئیس میں ۵۰ ارب فرانک ڈال کر اسے سہارا دیا۔ تب بھی بات نہ بنی تو سب سے بڑے سوئس بینک، یو بی ایس نے اسے خرید لیا۔

دیوالیہ شدہ امریکی بینکوں کا نمایاں ترین عالمی اثر یہ تھا کہ دنیا بھر کی سٹاک مارکیٹوں میں بینکوں کے حصص کی قیمتیں گر گئیں۔ سرمایہ کار اُن سے رقم نکال کر دوسرے شعبوں میں سرمایہ کاری کرنے لگے۔ مثلاً سونے کی خریداری بڑھ گئی اور اُس کی قیمت میں اضافہ بھی ہوا۔ پاکستان میں بھی بینکوں کی صورت حال امید افزا نہیں۔ خاص طور پر بینک ایل سی کھولنے سے کترا رہے ہیں کہ ڈالروں کی کمی ہے۔ مگر اس عمل نے ٹیکسٹائل اور دیگر شعبوں میں بحران پیدا کر دیا جو درآمدات پہ انحصار کرتے ہیں۔

امریکا و یورپ میں بینکوں کا دیوالیہ ہونا تشویش ناک بات مگر پاکستان کے لیے بحران میں امید کی کرن بھی پوشیدہ ہے۔ اگر پاکستانی حکومت غیر ملکی سرمایہ کاروں کو سہولتیں دے، بجلی سستی کرے اور خصوصاً سیاسی ماحول کی گرم بازاری ختم ہو جائے، تو وہ بینکوں سے نکالی رقم پاکستان میں لگا سکتے ہیں۔ آخر انھیں بھی پاکستان جیسی بڑی منڈی کی تلاش ہے جہاں مواقع زیادہ ہیں۔ چین، بھارت، برازیل اور انڈونیشیا میں تو پہلے ہی سرمایہ کاروں کی کھپ موجود ہے۔ بیرونی سرمایہ کاری بڑھنے سے وطنِ عزیز میں ترقی و خوشحالی کا نیا در کھل جائے گا۔

فہرست

اپریل 2023ء

دامنِ امید کے ساتھ معرکہ آرائی

ہم بہت خوش نصیب ہیں کہ ایک ایسے وقت میں جب ہم تنازعات کے ہاتھوں بری طرح نڈھال ہو چکے تھے، ہمیں ماہِ رمضان کی رحمتوں اور برکتوں سے فیض یاب ہونے کا موقع مل گیا ہے۔ امید پیدا ہوئی ہے کہ ہم تہِ دل سے اپنے گناہوں کی معافی مانگیں گے، ہمسایوں کے لیے اپنے دل صاف کریں گے اور اپنے رب کریم سے رحمتوں کے طلب گار ہوں گے۔ اس مہینے کی شانِ امتیاز یہ ہے کہ اس میں قرآنِ حکیم نازل ہوا جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت کی آخری کتاب ہے۔ اس میں انسانی فلاح کے تمام بنیادی اصول بیان کیے گئے ہیں۔ ان کی تعلیمات پر عمل پیرا ہو کر عرب کے صحرا نشین ایک ایسی اخلاقی طاقت کے حامل بن گئے تھے کہ ان کے سامنے دونوں عالمی طاقتیں سرنگوں ہو گئی تھیں اور عدل و مساوات کا نہایت اعلیٰ نظام قائم ہو گیا تھا۔ اہلِ پاکستان اس بے مثل نظام کے وارث ہیں اور ان پر لازم آتا ہے کہ وہ 'اُمتِ وسطیٰ' کی خوبیوں سے پوری دنیا کو فیض یاب کریں۔

یہ بات بڑے دکھ سے کہنا پڑتی ہے کہ وہ مسلمان جنھیں دین کی امامت کا فریضہ سونپا گیا تھا، خود ہی انتشار اور اُفراتفری کا شکار ہو کر غیر مسلم طاقتوں کے محکوم بن گئے۔ ہندوستان میں انھوں نے چھ صدیوں سے زائد حکومت کی اور اُسے زندگی کی اعلیٰ قدروں سے روشناس کرایا، لیکن ذاتی رنجشوں اور آپس کی دھڑے بندیوں نے انھیں انگریزوں کا غلام بنا دیا۔ غلامی کا یہ عہد ۱۸۵۷ء سے شروع ہو کر ۱۹۴۷ء تک قائم رہا۔ اس دوران حکیم الامت ڈاکٹر محمد اقبال اور قائدِ اعظم محمد علی جناح نے مسلمانوں کے جداگانہ وطن کے لیے سیاسی اور آئینی جدوجہد کی اور سخت مایوسی کے دنوں میں اُمید اور یقین کے چراغ روشن کیے اور یہی چراغ آزادی کے چراغ بن کر ماہِ کامل ثابت ہوئے۔

ہمارے درمیان جب تک امید کے چراغ جلتے رہے، پاکستان بساطِ عالم پر اپنے نقوش ثبت کرتا گیا۔ اب ہم اندھیروں کے پجاری بن گئے ہیں اور بڑے بڑے تنازعات اُٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ بعض اوقات یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہم انسان کم اور وحشی زیادہ ہیں۔ ہماری اشرافیہ نے ملک پر بڑے بڑے ستم ڈھائے جن کی وجہ سے بے اطمینانی اور سرکشی کی تحریکیں اٹھی ہیں اور بے قابو ہوتی جا رہی ہیں۔ پاکستان کے دشمن اس صورتِ حال سے پورا پورا فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔ پاکستان کے معاملات میں بیرونی مداخلت میں حیرت انگیز تیزی آ گئی ہے۔ باہر کا پیسہ عوام کو تقسیم کرنے اور اُنھیں آپس میں دست و گریباں رکھنے کے لیے استعمال ہو رہا ہے۔ پروپیگنڈے کے ذریعے ہٹلر اور میسولینی کی طرح قوم کے 'مسیحا' تیار کیے جا رہے ہیں اور اس امر کی پوری پوری کوشش کی جا رہی ہے کہ نوجوان عقل و

ہوش سے مکمل طور پر کام لینا چھوڑ دیں اور اَندھے جذبات میں بہتے چلے جائیں۔ جذبات میں آگ لگانے کا کام بھی
سیاسی قیادتیں حتی المقدور سرانجام دے رہی ہیں۔ مثبت اور ٹھوس کاموں پر پوری توجہ دینے کے بجائے الزام تراشیوں
اور گالم گلوچ کا بازار گرم ہے جو خوفناک تصادم کی طرف بڑھ رہا ہے۔
ملک میں جو دہشت کی فضا قائم ہوگئی ہے، اُس میں کوئی ادارہ بھی اپنے فرائضِ منصبی غیر جانب داری اور دیانت
داری سے انجام دینے کے قابل نہیں رہا۔ قانون بار بار زورآوروں کے مقابلے میں شکست کھا چکا ہے۔ عدالتیں اُس
کے حق میں فیصلے دینے پر مجبور دِکھائی دیتی ہیں جو اَپنے ساتھ جتھے لاسکتا اور جذبات بھڑکا سکتا ہو۔ قانون نافذ کرنے
والے ادارے پسپا ہوتے جارہے ہیں جو غالباً اندر سے تقسیم بھی ہیں۔ حالات ایک ایسا رخ اختیار کر گئے ہیں کہ حکومت
کے لیے شہریوں کے جان و مال اور آبرو کا تحفظ دشوار ہوتا جارہا ہے۔ اِس لیے بھی کہ وہ قوتِ فیصلہ اور مربوط حکمتِ عملی
سے محروم ہے اور اُس کی ناقص پالیسیوں کے باعث عوام بڑی بڑی مشکلات سے دوچار ہیں۔ اُس نے مہنگائی کا مقابلہ
کرنے کے لیے ایک پروگرام ترتیب دیا ہے، مگر اُس کے عمل درآمد میں تاخیر نظر آتی ہے۔ امیروں پر بھاری ٹیکس لگانا
اور اُس رقم سے غریبوں کو ریلیف مہیا کرنا بظاہر ایک عمدہ پالیسی ہے، مگر طاقت ور عناصر اس حکمتِ عملی پر عمل ہونے نہیں
دیں گے۔ البتہ مستحقین کو مفت آٹا تقسیم کرنے کی اسکیم اچھے اثرات پیدا کر رہی ہے۔
قوم کی قوتِ مدافعت پر کاری ضرب لگانے کے لیے پاکستان کے بدخواہ یہ ثابت کرنے میں ہمہ تن مصروف ہیں
کہ ملکی حالات میں امید کی کوئی رمق باقی نہیں رہی۔ ہر شے ڈوب رہی اور ہر امکان ختم ہوتا جارہا ہے۔ اب قومی زندگی
کا تمام تر انحصار اِنتخابات کے انعقاد پر محدود ہوگیا ہے۔ سپریم کورٹ کے جس بینچ نے نوے دنوں کے اندر اَندر انتخابات
کرانے کا حکم صادر کیا تھا، اُس کے دو فاضل ججوں نے یہ سوال اٹھایا تھا کہ ہمیں اِس نکتے پر بھی غور کرنا چاہیے کہ دو
صوبائی اسمبلیاں آئینی تقاضوں کے مطابق تحلیل کی گئی تھیں یا نہیں۔ فاضل چیف جسٹس اِس نکتے کو زیرِ بحث نہیں
لائے۔ اِس کا نتیجہ یہ ہے کہ پاکستان الیکشن کمیشن نے پنجاب اسمبلی کے انتخابات بھی قومی اسمبلی کے انتخابات کے ساتھ
منسلک کر دیے ہیں۔ اب اِس پر ایک اور تنازع اٹھ کھڑا ہوا ہے جو زِندگی اور موت کا مسئلہ بنتا جارہا ہے۔ اب امید کے
دامن کے ساتھ ساتھ معرکہ آرائی کا سلسلہ بھی چل نکلا ہے۔ ہر آس کسی نہ کسی طرح یاس میں تبدیل کی جارہی ہے۔
منصفانہ اور شفاف انتخابات کا اوّلین تقاضا یہ ہے کہ حالات معمول پر ہوں اور رائے دہندگان اپنا ذہن استعمال کرنے
میں پوری طرح آزاد ہوں۔ 'بیانیے' کی جو خوفناک جنگ جاری ہے، اُس میں یہ دونوں بنیادی اجزا معدوم ہو جائیں
گے اور وَسیع پیمانے پر افراتفری پھیلے گی جس کے سبب اُمید کا رشتہ ٹوٹ جائے گا۔ ۱۹۷۰ء کے قومی انتخابات میں بھی یہ
حادثہ پیش آیا تھا۔ ہماری سیاسی قیادت ہی کو ایک محفوظ راستہ نکالنا ہوگا کہ پاکستان کا چین اور خلیجی منطقے کے تعاون سے
اِس خطے میں ایک اَہم کردار اَدا کرنے کا وقت آپہنچا ہے اور ہمیں اپنی کشتِ ویراں سے مایوس نہیں ہونا چاہیے کہ یہ مٹی
بڑی زرخیز ہے۔

الطاف حسن قریشی

ربِ عرشِ عظیم کا انعامِ خاص

ہم اللہ تعالیٰ کا شکر بجالاتے ہیں کہ نومبر ۱۹۶۰ء میں
ہمارے والدِ گرامی ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی (مرحوم)
کی زیرِ قیادت جاری ہونے والے ماہنامہ اردو ڈائجسٹ کے مدیرِ اعلیٰ

جناب الطاف حسن قریشی

کی قومی خدمات کے اعتراف میں مملکتِ پاکستان کی جانب سے
صدرِ پاکستان جناب ڈاکٹر عارف علوی نے
۲۳ مارچ ۲۰۲۳ء کو **ہلالِ امتیاز ایوارڈ** عطا کیا

کے پوتے افنان کامران نے وصول کیا

ہم اِس اعزاز پر اپنے رفقائے کار، قلمی معاونین اور قارئین کو مبارک باد پیش کرتے ہیں اور ہماری
دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اہلِ وطن کی مزید خدمت بجالانے کی توفیق عطا فرماتا رہے۔

طیب اعجاز قریشی، ایگزیکٹو ایڈیٹر

اُردو ڈائجسٹ، ۳۲۵۔جی تھری، جوہر ٹاؤن، لاہور

سرسیّد احمد خاں کی دوررس آئینی جدوجہد

کانگریس برطانوی حکومت سے پُرزور مطالبہ کر رہی تھی
کہ برطانیہ کے جمہوری نظام اور مرکز میں اعلیٰ سرکاری
ملازمتوں کے لیے مقابلے کے امتحانات کا فریم ورک نافذ کر
دیا جائے۔ یہ دونوں صورتیں ہندو راج قائم کرنے میں کلیدی
کردار اَدا کر سکتی تھیں۔ مسلم قیادت کو برطانوی راج کے آغاز
ہی میں یہ احساس ہو گیا تھا کہ مغربی جمہوریت ہندوستان میں
مسلمانوں کے لیے سمِ قاتل کی حیثیت رکھتی ہے جہاں
ہندوؤں کی بھاری اکثریت ہے۔ کونسلوں کے انتخابات نے
اُس کے خدشات درست ثابت کر دیے تھے۔ یوپی، جس کی
مسلم آبادی ۱۴ فی صد تھی، اُس کی کونسلوں میں ایک بھی
مسلمان ممبر منتخب نہیں ہو سکا تھا۔ یہی حال دوسرے صوبوں،
شہروں اور اَضلاع کا بھی تھا۔ سب سے پہلے سرسیّد احمد خاں
نے اِس تشویش ناک صورتِ حال کے خلاف ہر محاذ پر آواز
اٹھائی۔ ... انڈیا کمپنی میں ملازمت سے ترقی کرتے
ہوئے عدلیہ کے اعلیٰ منصب تک جا پہنچے تو ... لانا ...

منتخب کالم الطاف حسن قریشی

حسین حالی نے اُن پر 'حیاتِ جاوید' کے نام سے ایک معرکتہ
الآرا کتاب لکھی جس میں قوم پر اُن کے عظیم احسانات کو
زبردست خراجِ تحسین پیش کیا گیا تھا۔ سرسیّد نے غیر معمولی
ریاضت سے انگریزی زبان پر عبور حاصل کر لیا تھا اور وُہ
شیکسپیئر کے لہجے میں گفتگو کر سکتے تھے۔

اُن کی نگاہ دُوررس نے بھانپ لیا تھا کہ مسلمانوں اور
انگریزوں کے درمیان بے اعتمادی اور دُشمنی کا سلسلہ دیر تک
قائم رہنے سے مسلمان انگریزوں اور ہندوؤں کا تر نوالہ بن
سکتے ہیں، چنانچہ وہ ایک طرف انگریزوں کے ساتھ مفاہمت
کی راہ اَپنائے رہے اور دُوسری طرف ہندوؤں کی سفاک
آمریت سے محفوظ رہنے کا منصوبہ ترتیب دیتے رہے۔ اِن
عملی تدابیر سے مسلمانوں کو ایک نئی زندگی ملی اور اُنھیں ایسے
وسائل میسّر آنے لگے جن کی بدولت وہ فرنگی شکنجے اور ہندوؤں
کی بالادستی سے نجات پانے میں بھی کامیاب رہے اور آگے
چل کر آزادی کی نعمت سے بھی سرفراز ہوئے۔

سرسیّد احمد خاں گورنر جنرل لیجسلیٹو کونسل کے رکن کی
حیثیت سے مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ میں سرگرداں
رہے۔ ہندوؤں کی اکثریت سے محفوظ رہنے کا سب سے مؤثر
ذریعہ جداگانہ انتخابات تھے، چنانچہ اُنھوں نے انگریزوں کو
اِس امر پر قائل کرنے کی بھرپور کوشش کی کہ ہندوستان میں
سیاسی امن قائم رکھنے کی خاطر حکومت کے لیے ہر سطح پر
جداگانہ انتخاب کا اصول اپنانا ازبس لازمی ہے۔ علاوہ اَزیں
وہ اَپنے ہم وطنوں پر بار بار وَاضح کرتے رہے کہ اُن کی سلامتی
اور فلاح مغربی علوم حاصل کرنے اور کانگریس سے الگ
تھلگ رہنے میں ہے۔ اُن کا بہت عظیم کارنامہ دلائل سے یہ
ثابت کرنا تھا کہ نمائندہ حکومت ہندوستان کے لیے یکسر
غیر موزوں ہے، کیونکہ یہاں دو مختلف قومیں ہندو اَور مسلمان
آباد ہیں۔ اِسی طرح مقابلے کے امتحانات بھی یکسر غیر منصفانہ

ہیں، کیونکہ مسلمان انگریزی زبان اور مغربی علوم میں ضروری
مہارت حاصل نہیں کر سکے ہیں، لہٰذا اعلیٰ ملازمتوں میں اُن کا
الگ کوٹا ہونا چاہیے۔

سرسیّد احمد خاں نے کمال عرق ریزی سے 'اسبابِ
بغاوت' کے عنوان سے کتاب لکھ کر ثابت کیا کہ فوجی بغاوت
کی اصل ذمے داری ایسٹ انڈیا کمپنی پر عائد ہوتی ہے جو اُن
بدگمانیوں کو دور کرنے میں بری طرح ناکام رہی جو بعض عناصر
فوج کے اندر پھیلا رہے تھے۔ ہندوستانی فوج کو جو نئے
کارتوس فراہم کیے گئے تھے، اُنھیں لوڈ کرنے سے پہلے
دانتوں سے کھولنا پڑتا تھا۔ ہندو سپاہیوں میں یہ بے پَر کی
اڑائی گئی کہ کارتوس گائے کی چربی سے بنے ہیں جبکہ مسلمانوں
میں یہ تاثر پھیلایا گیا کہ یہ چربی خنزیر کی ہے۔ اعلیٰ فوجی
افسروں نے اِس پروپیگنڈے کی روک تھام پر کوئی توجہ نہیں
دی اور فوج میں بغاوت سر اٹھاتی چلی گئی۔ سرسیّد احمد خاں کی
اِس کتاب کا برطانوی حکمرانوں پر اچھا اثر ہوا جس کا انگریزی
میں ترجمہ برطانوی پارلیمنٹ کے ہر اہم رکن، سیاسی جماعتوں
کے اعلیٰ عہدے داروں اور میڈیا کے ذمے داروں تک پہنچا
دیا گیا تھا۔ اِسی نوع کی پیہم مصالحانہ کوششوں سے انگریز
مسلمانوں کے بارے میں کسی قدر مطمئن ہو گئے تھے کہ وہ
اُن کی حکومت کے وفادار رہیں گے۔ سخت کشیدہ حالات میں
یہ بہت بڑی سیاسی پیش رفت تھی جس نے آگے چل کر
مسلمانوں کو اپنی جداگانہ حیثیت قائم رکھنے اور اَپنا سیاسی وزن
بڑھانے میں ایک گونہ مدد فراہم کی۔

سرسیّد احمد خاں نے مسلم سوسائٹی میں تازہ رُوح پھونکنے
کے لیے 'تہذیب الاخلاق' کے نام سے ایک مجلّہ جاری کیا جس
نے ایک نئے دبستان کی بنیاد رَکھی۔ یہ دبستان سادہ اور
سیدھے انداز میں اظہارِ خیال کا موجد تھا۔ یہی اسلوب مولانا
حالی نے اپنایا۔ اِس طرزِ تحریر سے ذہنوں کے بند دریچے وا
ہوتے گئے۔ 'تہذیب الاخلاق' میں تواتر سے بتایا جاتا رہا کہ
مغربی اقوام نے کس طرح ترقی کی ہے اور مسلمانوں کو اَپنی
انفرادی اور اِجتماعی زندگی میں کون کون سی تبدیلیاں لانا ہوں
گی۔ اُن کے خیالات سے اختلاف کرنے والے خاصی بڑی
تعداد میں موجود تھے کہ اُنھوں نے انگریزوں کو خوش کرنے
کے لیے معجزات کی عجیب و غریب تاویلات کی تھیں، تاہم اُن
کی مخلص کوششوں کے نتیجے میں نوجوانوں کے اندر مغربی تعلیم
کے حصول کا شوق اور اَپنا مستقبل سنوارنے کا شعور پختہ ہوتا
گیا۔

سرسیّد احمد خاں نے ذہنی اور فکری تبدیلیوں کی راہ ہموار
کرنے کے ساتھ ساتھ تعلیمی میدان میں تاریخ ساز کارنامہ
سرانجام دیا۔ وہ مغربی علوم و فنون کی تحصیل پر غیر معمولی زور
دَے رہے تھے اور علی گڑھ میں نہایت اعلیٰ درجے کا کالج
قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے جس نے آگے چل کر مسلم
علی گڑھ یونیورسٹی کا مرتبہ حاصل کیا۔ سرسیّد انگلستان گئے اور
کیمبرج یونیورسٹی میں کئی ہفتے ٹھہرے۔ وہاں سے علی گڑھ
کالج کا نصاب لے آئے اور عالمی شہرت کے اساتذہ بھی۔
اُن کی شہرت سُن کر پورے ہندوستان سے مسلم طلبہ علی گڑھ
کالج تعلیم حاصل کرنے آتے اور معاشرے میں مسلم قومیت کو
فروغ دینے میں اہم کردار اَدا کرتے رہے تھے۔ یہ بلاخوف و
تردید کہا جا سکتا ہے کہ علی گڑھ یونیورسٹی نے بڑے سیاسی زعما،
اچھے منتظم، بے مثل ریاضی کے ماہرین، سائنس دان اور فلسفی
پیدا کیے۔ اِس یونیورسٹی کے طلبہ نے ۱۹۴۵-۴۶ء کے اُن
انتخابات کی مہم میں اسلامیہ کالج پشاور اَور لاہور کے طلبہ کے
ساتھ بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا جن کی بدولت پاکستان وجود میں
آیا۔

ہم کہاں آ پہنچے؟ الطاف حسن قریشی صفحہ نمبر 20

ڈاکٹر صائمہ ذیشان

مشرقی پاکستان ٹوٹا ہوا تارا

ایک منشور اور تاریخیت پر مبنی نتائجیت کے اظہار کا ایسا مجموعہ جس میں جذباتیت قطعی نہیں

خورخے لوئیس بورخیس (۱۸۹۹ء-۱۹۸۶ء) نے کہا تھا کہ ''تخلیق کار کے منصب پر موجود شخص کا فرض ہے کہ وہ پیش آنے والے واقعات کے بیان سے کسی تبدیلی کا خواہاں ہو، یا واقعے اور کردار کی قرار واقعی تصویر کشی کے ذریعے نظریہ سازی کا عمل انجام دے اور سوادِ اعظم کو متاثر کرلے، اور فرض کی ادائیگی کے بغیر کون خوش رہ سکتا ہے۔'' معروف اور حب الوطن صحافی الطاف حسن قریشی صاحب نے بھی اپنی تخلیقی صلاحیتوں کی ادائیگی کے لیے کتاب ''مشرقی پاکستان: ٹوٹا ہوا تارا'' پیش کرنے کی ضرورت محسوس کی۔

نئی کتاب کی دلیل اور جوازیت یہی ہونی چاہیے کہ وہ ذہنوں میں بیداری و فکر کی نئی لہریں پیدا کرے۔ قریشی صاحب کی تخلیقی دیانت داری کے ثبوت میں اُن کی مذکورہ کتاب میں شامل ''محبت کا زم زم بہہ رہا ہے'' کے عنوان کے تحت خود اُن کے یہ الفاظ اہم ہیں جو اُنھوں نے ایک بصیرت افروز تجزیے کی شکل میں پیش کیے ہیں کہ ''مجھے بعض محتاط [illegible] مسئلہ [illegible] سے مراد یہاں شیخ مجیب الرحمٰن کے پیش کردہ چھ نکات کا تجزیہ تھا) زیرِ بحث نہ لاؤں، لیکن مَیں سوچتا ہوں کہ کبوتر کے آنکھیں بند کرلینے سے بلی کا وجود ختم نہیں ہوجاتا۔ گریز کی راہ اِختیار کرنے کا صاف مطلب یہی ہے کہ آپ کا ذہن شکست کھا گیا ہے۔ پیارے وطن سے میری محبت مجھے اِس بات پر مجبور کررہی ہے کہ مَیں جن حقائق تک پہنچنے میں کامیاب ہوسکا ہوں، اُنھیں بے کم وکاست قوم کے سامنے پیش کردوں، تاکہ اُس میں اپنے مسائل پر غور وفکر کرنے اور اُن کا حل تلاش کرنے کی صلاحیت پیدا ہو۔ پاکستانی قوم ذہنی طور پر بانجھ تو نہیں۔''

الطاف حسن قریشی صاحب کے مذکورہ الفاظ آپ کی تخلیقی زندگی، جو صحافیانہ دیانت داری اور حب الوطنی کے تقاضوں کے عین مطابق گزری، کی نہایت صریح، اعلیٰ ترین معنویت اور تکثیری بنیادوں پر تشریح وتوضیح کرتے ہیں۔

''مشرقی پاکستان: ٹوٹا ہوا تارا'' ایک کتاب، اہم دستاویز، ایک منشور اور تاریخیت پر مبنی نتائجیت کے اظہار کا ایسا مجموعہ ہے جس میں جذباتیت اور لمحاتی زاویہ فکر قطعی نہیں

ہے، بلکہ یہ دُور بینی، سائنسی خطوط پر تحقیق، معروضیت، بازیافت اور حقائق کا جانب دارانہ ومنصفانہ تجزیات پر مشتمل ایک مستند وتاریخی جدوجہد وکاوش ہے۔ الطاف حسن قریشی صاحب نے واقعات کا تجزیہ، مشرقی پاکستان سے میلوں دور رہتے ہوئے طے نہیں کیا ہے بلکہ آپ نے تمام تر ممکن الحصول تفصیلات کو جمع کرنے کے لیے، اُنھیں استناد فراہم کرنے کے لیے اور ایک بدلتی ہوئی تاریخ کے مطالعے کے لیے مشرقی پاکستان کا بارہا سفر وسیلہ ظفر بھی کیا ہے۔ سفر کی صعوبتوں اور ممکنہ خطرات، ہردو کو پس پشت ڈال کر آپ نے وہاں کے عام افراد بشمول سیاست دانوں، عوامی رہنماؤں، معاشیات کے ماہرین اور سیاسیات پر عبور رکھنے والوں سے لے کر دکان داروں، عام رکشہ چلانے والوں اور جامعات کے طالب علموں سے فرداً فرداً ملاقات کی اور عصری ماحول میں اُن تمام افراد کی جملہ سرگرمیوں اور خیالات کی اُنہی کی اصل شکل و صورت میں وضاحت کی کوشش کی ہے تاکہ آپ کی یہ جستجو، نیک نیتی پر مبنی ہونے کے ساتھ ساتھ معروضیت کی بھی قائل ہو۔

دستاویز یا کتاب، عصری تقاضوں کی عکاس ہوتی ہے جس میں ملک و معاشرت اور قوم کے درد، آرزوؤں، خواہشات، اُس قوم کی جہد وجستجو اور اُن میں موجود ہیجانات کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ یہاں یہ نکتہ غور طلب ہے کہ دستاویزات اور کتب، محض افرادِ قوم کی آرزوؤں وجستجوؤں اور اُن کے ہیجانات جیسے عناصر پر ہی موقوف نہیں ہوتیں بلکہ معاشرے وملکی تاریخ پر اثرانداز ہونے والے صاحبِ اختیار واقتدار کے عملاً اظہارات بھی پیش کردہ کتب ودستاویزات میں مختلف پہلوؤں کی وضاحت کے ذمے دار ہوتے ہیں۔ اُن حقائق کے ارتباط کی نوعیت، اُن کی پاس داری اور اُن کی مظہریت کو قرار واقعی صریح ثابت کرنے کے لیے الطاف حسن قریشی صاحب کی اِس کتاب میں ابواب کی تقسیم، زمانیت ومکانیت ہردو حوالوں سے کی گئی ہے تاکہ تاریخ کے اِس خون آشام انقلاب و عہد کی تصویر کشی، مستند تاریخی بنیادوں پر اپنے ارتقائی انداز میں سامنے آئے اور وقت کی پرورش میں ملحوظ اُن تمام عناصر کا ذکر کتاب میں شامل رہے جنھوں نے اِس سانحے کو جنم دیا تھا۔

''مشرقی پاکستان: ٹوٹا ہوا تارا'' وجودیت کے اعتبار سے تاریخ اور فرد کا تصادم ہے جو اپنی معنویت کے اعتبار سے وقت کے ریاضیاتی تصور کو فنا کرتا ہے کیونکہ ٹوٹے ہوئے تارے کے سبب تاریخ کی یہ کہانی جو ۱۹۴۷ء سے اپنا دم بھرتی چلی آرہی تھی، خطِ مستقیم میں اپنا سفر آگے نہ بڑھا سکی۔ اِس کتاب کے ابتدائی صفحے پر ایک مصرعہ تحریر ہے ع ''قصۂ درد سناتے ہیں کہ مجبور ہیں ہم۔'' اِس قصۂ درد کے بیان میں انسانی رشتوں اور اقدار کے انہدام کا نظارہ، وجودی سطح پر ہمت ہارنے والے تضادات کا تجربہ اور جذباتی وروحانی عدم مرکزیت کا کرب ہے۔ اِن سب کے بیان میں الطاف حسن قریشی صاحب پہلو بہ پہلو آگہی کے اُس تریاق کی تلاش میں بھی ہیں جو اِن تمام اجتماعی المیوں کو سہارنے کے لیے لازم ہے۔ اِس قصۂ درد میں ابھی بھیانک اور دِل چیر دینے والا کشت وخون، جلاوطنی اور دُوسری ہجرت کا احوال کچھ فاصلے پر اپنی باری کا منتظر ہے۔

سلسلہ ''محبت کا زم زم بہہ رہا ہے'' اردو ڈائجسٹ میں اگست تا دسمبر ۱۹۶۶ء شائع ہوتا رہا۔ زمانی اعتبار سے یہ مضامین سقوطِ ڈھاکہ سے تقریباً پانچ برس پہلے شائع ہوئے تھے۔ گویا الطاف حسن قریشی صاحب نے وقت کے تسلسل (Time Sequence) کے مابعد الطبیعاتی تصورات کو وُسعت دیتے ہوئے اپنی دور بینی وخود شناسی کے خودکار نظام کے تحت مشرقی پاکستان کی سرزمین پر واقع ہونے والے بے زمینی وبے مکانی کے پروپیگنڈے کے نتیجے میں سرگرداں

شورش بھانپ لی تھی۔ آپ نے اِس باب میں اپنا نہایت
عالمانہ و دیانت دارانہ تجزیہ پیش کیا ہے۔ بالخصوص چھ نکات
کے وہ مضمرات جو عام افراد کی نگاہوں سے اوجھل تھے،
الطاف حسن قریشی صاحب اُن میں مخفی ذاتی مفادات و اِختیار
کی بے لگام خواہشات پر مبنی خطوط کو ملکی و بین الاقوامی معاشی و
سیاسی نظام کو مدِنظر رکھتے ہوئے قارئین کے سامنے لے کر
آتے ہیں۔ آپ اُس زمانے میں مشرقی پاکستان کی سرزمین
پر شائع ہونے والے اخبارات کا تجزیہ بھی نہایت عمدگی سے
کرتے ہوئے اُن کے پوشیدہ عزائم کی تہہ تک پہنچتے ہیں اور
اَپنے تخلیقی شعور کو بروئے کار لاتے ہوئے وقت کی جڑوں میں
پیوست اُن سیال نظریات و رُجحانات کا سراغ لگاتے ہیں جو
تہذیب کے ایک ہی سلسلے کی کڑی تھی، تاہم بیشتر مقامات
سے ٹوٹی ہوئی تھی اور وقت کی روانی اور تسلسل اُس کی شکستگی کو
مہمیز کرتا اور اُس کی بقا کو معدوم کرتا جا رہا تھا۔

الطاف حسن قریشی صاحب بھی اپنے صحافیانہ تجزیات کو
دیانت داری اور ذمے داری کے ساتھ عصرِ حاضر کے جس
نقطے پر موجود رہ کر واقعات، تجربات، مشاہدات، مبنی بر
حقیقت تخیل اور اَپنے فہم و اِدراک کے دائرے میں لے کر
آتے ہیں، وہ مستقبل کا نہایت واضح اور صریح عکس بناتا ہے۔
''محبت کا زم زم بہہ رہا ہے'' کے عنوان کے تحت آپ نے جتنے
مضامین تحریر کیے، وہ تاریخ کا ایسا باب بیان کرتے ہیں جس
کے لفظوں کی معنویت سچائی پر قائم ہے اور جسے آنے والی
نسلوں تک رسائی اِس لیے بھی دینی چاہیے کہ وہ اِس عالمی
حقیقت کو سمجھ سکیں کہ قومیں اگر زندہ قومیں ہوں، تو وہ آنے
والے حالات کی پرکھ کن خطوط اور کن خطرات کی بنیاد پر کر سکتی
ہیں۔

''محبت کا زم زم بہہ رہا ہے'' کے صفحہ نمبر ۱۲۷ پر آپ
نے تحریر کیا کہ [illegible] بنگال کی طرف آتا ہوں

جس پہ عموماً گفتگو نہیں ہوتی، لیکن مشرقی پاکستان کے حالات
بگاڑنے میں اِس کا سب سے زیادہ حصّہ ہے۔ میری مراد ہندو
اَقلیت سے ہے جس نے پچھلے اٹھارہ، انیس برسوں میں وہاں
کی سیاست، معیشت اور معاشرت میں جو زہر گھولا ہے، اُس
کے خاموش اثرات انتہائی بھیانک ہیں۔'' الطاف حسن قریشی
صاحب نے چیدہ چیدہ واقعات اور اُن واقعات کی روشنی
میں اُس صورتِ حال کی بہتری کے لیے اِس ضمن میں سر آغا
خان کی کوششوں کا ذکر بھی کیا ہے۔ اِسی طرح کے خدشات کا
اظہار، بلکہ اُن کی راست وضاحت ڈھاکا یونیورسٹی کے وائس
چانسلر، پروفیسر سیّد سجاد حسین صاحب نے اپنی کتاب
''شکستِ آرزو'' میں بھی کی ہے کہ جن حالات کی جانب
الطاف حسن قریشی صاحب اپنی کتاب میں بارہا اشارے کر
رہے ہیں۔ پروفیسر سجاد حسین صاحب تو ڈھاکا یونیورسٹی کے
وائس چانسلر تھے اور اُنھوں نے بھی یہ مثالیں بارہا دیکھی ہوں
گی اور ساتھ ہی وہ اُن مصائب سے مسلسل نبرد آزما بھی رہے
ہوں گے کہ جن کا تذکرہ اَلطاف حسن قریشی صاحب نے فرمایا
ہے، لیکن الطاف حسن قریشی صاحب مغربی پاکستان کے صحافی
تھے اور اُس خطۂ زمین (مشرقی پاکستان) سے دور رہ کر بھی
آپ نے اُن واقعات کے اسرار کی دبیز معنی خیزیت سے
عبارت مخفی تہوں کی اکتشاف و بازیافت کو ممکن بنایا جو قرار
واقعی آپ کی صحافیانہ دیانت اور حب الوطنی کے ساتھ ساتھ
آپ کے غیر معمولی شعورِ ذات، آپ کی تجزیانہ راست گوئی
اور ملی فکر کی اضافیت کے مختلف زاویوں کی وضاحت کرتی
ہے۔ آپ نے تجزیاتی انداز اپناتے ہوئے یک رخے پنا
سے اجتناب کیا ہے اور واقعات کے قائم ہونے میں اِس
ریاضیاتی تصور کو ملحوظ رکھا ہے کہ اِس بحران کا دستِ غارت گر
یعنی Backdrop دراصل کون تھا؟ گویا ع وہ ہم سفر تھا مگر
اُس سے ہم نوائی نہ تھی۔

اردو اور بنگالی زبان کے مسئلے پر بھی الطاف حسن قریشی

صاحب نے نہایت صائب رویّے و نظریے کا اظہار کیا ہے کہ
''یہ کتنی دردناک بات ہے کہ مسلمان اور اُن کی زبان،
پاکستان ہی کے ایک خطے میں اقلیت کا درجہ بھی حاصل نہ
کر سکے۔ ہر تمدن اور اِنصاف پسند معاشرہ اَپنی اقلیت کی
زبان اور ثقافت کی حفاظت کرتا ہے یا کم از کم اقلیت کو اِس
بات کا موقع دیتا ہے کہ وہ اَپنے کلچر اور اَپنی زبان کی حفاظت
کی مساعی کر سکے، لیکن کس قدر بدقسمت ہے اردو، کہ مشرقی
پاکستان میں اِسے کہیں بھی جائے اماں نہیں ملتی۔'' (مشمولہ
''محبت کا زم زم بہہ رہا ہے''، ص ۱۳۵) اِن سطور میں مشرقی
پاکستان کا نقطۂ نظر اردو زبان کے بارے میں بڑی صراحت
کے ساتھ سامنے آتا ہے جو حقیقتاً بلاجواز و لایعنیت اور کم فہمی و
کج فہمی پر مبنی تھا۔ لہٰذا اِس میں شک و شبہ کی گنجائش ہی کہاں
کہ قیامِ پاکستان کے لیے مروج تحریکِ آزادی کے عوامل، پیچ
و خم، نشیب و فراز، حادثات و واقعات اور مراحلِ نو بہ نو میں
اردو زبان کی اثر پذیری ایک جزِ لازم کی حیثیت سے موجود و
فروزاں رہی۔ الطاف حسن قریشی صاحب فرستادۂ پاکستان
کی حیثیت سے اِس حقیقت کو نہایت وضاحت کے ساتھ بیان
کرتے ہیں۔

اردو زبان کے ساتھ ''لا = اردو زبان'' اور نفرت پر مبنی
اِس رویّے کا سبب مشرقی پاکستان کا وہ منظرنامہ تھا جسے الطاف
حسن قریشی صاحب نے بڑی عمیق نظروں سے دیکھا اور پرکھ
لیا تھا۔ یہ آپ کے تجزیاتی سلسلوں کی ایک کڑی تھی جس میں
وہ اَقلیتوں کا ذکر کرتے ہیں۔ زبان کے تعلق سے جو رویّہ
مشرقی پاکستان میں نظر آیا، تاریخیت اور اُن کے نتائج کی معنی
خیزیت کے حوالے سے اُن حقائق پر بھی نظر ڈالنی چاہیے کہ
''اردو کی یہ مقبولیت اور ہر دِل عزیزی اُن ہندوؤں کو بہت
شاق گزری جنھوں نے انیسویں صدی کے آغاز میں ہندو
قومیت کی جارحانہ تحریکوں کو جنم دے کر 'ہندوستان برائے
ہندو' کا خواب دیکھا۔'' (''اے ہسٹری آف فریڈم موومنٹ
اِن انڈیا''، جلد اوّل، بہ حوالہ ''اردو ہندی تنازع''، فرمان فتح
پوری، ص ۱۵، طبع دوم ۱۹۸۸ء، اسلام آباد، نیشنل بک
فاؤنڈیشن) الطاف حسن قریشی صاحب نے مشرقی پاکستان
کے حالات کے تناظر میں اردو زبان کے حوالے سے اصلاحی
نکات بھی پیش کیے ہیں کہ جن پر بروقت اور سنجیدگی کے ساتھ
توجہ دی جاتی، تو سقوط کے اِس سانحے میں شامل کئی عوامل میں
سے کچھ کی تو بہرحال کمی ہو جاتی اور مزاحمتی جہات کا یہ ہمہ سمت
نظام، دیوانگی و جنون کے برعکس، عقلی و شعوری بنیادوں پر قائم
ہوتا، تو اجتماعی کاملیت کے تصورات کی روشناسی میں شاید کسی
بہتری کی امید کی جا سکتی تھی ع اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔

سورین کرکیگارڈ (Soren Kierkegaard)
نے انسان کے اوّلین گناہ کا ذِکر کرتے ہوئے اُس کی
وضاحت اِس مثال سے دی ہے کہ آدم کو آگہی کے درخت کا
پھل کھانا ممنوع تھا اور وُہ اَچھائی اور برائی کے امتیاز سے بھی
محروم تھا۔ اِس اساطیری مذہبی قصّے کے ذریعے کرکیگارڈ نے فرد
کی وجودیت کو مسلمہ ثابت کرنے کے لیے یہ بھی کہا کہ ہر فرد کی
زندگی میں ایک لمحہ ایسا ضرور آتا ہے جب اُسے اپنی نظری
داخلیت یا شخصی موضوعیت کے حوالے سے ذاتِ اثبات کی جستجو
کرنی ہوتی ہے اور خود آگہی و خودشناسی کے مراحل طے کیے
جاتے ہیں۔ اقبال کے الفاظ میں باغِ بہشت سے حکمِ سفر ؎

باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں
کارِ جہاں دراز ہے اب میرا اِنتظار کر

پا کر ہی درحقیقت انسان امکانات و اِنتخاب کے استرداد
سے گزرتا ہے اور کرب و اِمکانیت کا یہ امتزاج فرد کو آگاہ و عظیم
بناتی ہے۔

الطاف حسن قریشی صاحب نے اپنی مذکورہ کتاب میں
ایک باب بعنوان ''سقوطِ ڈھاکا سے پردہ اُٹھتا ہے'' شامل کیا
ہے جو اُردو ڈائجسٹ میں جنوری تا مارچ ۱۹۷۲ء شائع ہوا تھا۔

آپ کی تصنیف ''مشرقی پاکستان: ٹوٹا ہوا تارا'' میں یہ حصہ، باب سوم کے تحت صفحہ نمبر ۹۵۱ تا ۱۰۲۲ پر موجود ہے۔ سقوطِ ڈھاکا کے کرب نے آپ کے قلم کو ایسی بصیرت افروز آگہی بخشی کہ جس نے تاریخ کی صداقت کو صریح و واضح شکل و صورت عطا کرنے کے آپ کے مقصد کی تکمیل کی اور آپ کے مقاصد کی صداقت کا تعین بھی کیا۔

واقعیت اور ناگہانیت کی تکلیف اور اُس کے ذائقے کو انسانی وجود محسوس کرتا ہے جو اُس کے لیے ایک انتہائی ناپسندیدہ صورت حال ہوتی ہے، لیکن یہی بے کیفی و ناپسندیدگی انسانی ذات کے شعور کے اکتشاف و بازیافت کا کام بھی انجام دیتی ہے اور یہی نہیں بلکہ یہ کیفیت ذہنِ انسانی کو اظہار کے راستوں سے روشناس بھی کراتی ہے۔ واقعات و حوادث کی اِسی نامنطقیت و مہمل پن کے احساس نے الطاف حسن قریشی صاحب کے سامنے حقائق کو واضح کر دیا جس سے تاریخی بقائیت پر مبنی ایک دستاویز مرتب کرنے کی آپ کی ایک ایسی دیانت دارانہ مساعی سامنے آئی کہ جس میں تمام تر اسبابِ سقوط کو عیاں کیا گیا اور بالخصوص اپنے زخم بھی دکھائے گئے کہ یہ تھے وہ ناسور، جس نے کرب کی وہ کہانی رقم کی جس میں تکلیف اور احساسِ ہزیمت و ذلت، ہر دو اپنی انتہائی کیفیت میں موجود ہے۔

الطاف حسن قریشی صاحب کی اِس کتاب کی قدر و قیمت کی کاملیت، ایک مکمل و تحقیقی مطالعے کی متقاضی ہے۔ اِس کتاب میں سائنسی طریقۂ تحقیق اور معروضیت کے ساتھ تاریخ کا وہ رُخ مندرج ہے جو شکست و ریخت کے روایتی تصورات سے کہیں زیادہ بسیط اور ایک گہرے و بھیانک مفہوم کا حامل ہے۔ طویل تاریخیت و نتائجیت پر اِس مبنی کتاب کو اخلاقیات، سیاسی ایمان داری، سماجی بہتری میں دخیل عقلی و فکری اوصاف اور سامراجی قوتوں کی تسخیر کے عظیم ترین مقاصد کا منی فیسٹو (Manifesto) قرار دیا جاسکتا ہے۔

اربابِ اختیار و فکر و نظر کی خدمت میں یہ گزارش بھی ہے کہ الطاف حسن قریشی صاحب کی ذات جہدِ حریت سے مشروط اُن کے حصے کی روشن شمع ''مشرقی پاکستان: ٹوٹا ہوا تارا'' کتاب کو پاکستان کے تمام تعلیمی، ادارہ جاتی اور ذاتی کتب خانوں میں، عالمی کتب خانوں میں، آن لائن جرنلز میں اور بالخصوص انگلستان و امریکا کے کتب خانوں اور انڈیا آفس لائبریری لندن اور بین الاقوامی سطح پر اِس کتاب کی رسائی کو ممکن العمل بنایا جائے اور اِس کتاب کی تلخیص پاکستان کی جامعات کے نصاب میں لازمی قرار دی جائے کہ ہولناک تہی دامنی کی تاریخ میں شامل عوامل کو موجودہ اور آئندہ نسلوں تک بھی پہنچنا چاہیے جو یہ سب کچھ نہیں جانتیں اور اُنھیں اپنی ذات کے اور ملی اثبات کے مفاہیم کو سمجھنے کے لیے یہ سب کچھ لازماً جاننا ہوگا۔ یہ اِس لیے بھی اہم اور لازم ٹھہرتا ہے کہ قریشی صاحب کے یہاں تشویش (Care) کا تصورِ زمانیت کے ساتھ مشروط ہے اور نکولائی باردیوف نے بھی کہا تھا کہ فرد کی شخصیت کا تعین محض وراثتی اطوار کے ذریعے، فلسفۂ حیاتیات و جنیات اور روزمرہ و قائم سماج سے ہی ممکن نہیں ہوتا ہے، بلکہ یہ فرد کے جذبۂ حریت سے مشروط ہے جو وجودی طور پر فتح کے امکانات پیدا کرتی ہے۔

ایک آنکھ سے

مولانا عبدالمجید سالک ہشاش بشاش رہنے کے عادی تھے۔ وہ جب تک دفتر میں رہتے، دفتر قہقہہ زار بنا رہتا۔ اُن کی تحریروں میں بھی اُن کی طبیعت کی طرح شگفتگی ہوتی تھی۔

جب لارڈ ویول ہندوستان کے وائسرائے مقرر ہوئے، تو مولانا سالک نے انوکھے ڈھنگ سے بتایا کہ وہ ایک آنکھ سے محروم ہیں، چنانچہ مولانا سالک نے ''انقلاب'' کے مزاحیہ کالم ''افکار و حوادث'' میں لکھا:

''لارڈ ویول کے وائسرائے ہونے کا یہ فائدہ ہے کہ وہ سب کو ایک آنکھ سے دیکھیں گے۔''

ہم کہاں آ پہنچے؟

سیاسی فتح و شکست کے گہرے عوامل

قندِ مکرر

الطاف حسن قریشی

۷ دسمبر ۱۹۷۰ء کو پاکستان میں عام انتخابات ہوئے اور ۱۷ دسمبر کو صوبائی اسمبلیوں کا چناؤ عمل میں آیا۔ بعض حلقوں میں انتخابات کے نتائج کو غیر متوقع کہا گیا ہے اور ایسے حلقے بھی ہیں جن پر ان حیرت انگیز نتائج سے غم انگیزی اور مایوسی کی فضا طاری ہے۔ ہوا یہ ہے کہ مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ کا تقریباً مکمل قبضہ ہے اور مغربی پاکستان میں پیپلز پارٹی ایک مؤثر سیاسی قوت کی حیثیت سے اُبھری ہے۔ یہ اُبھار اپنے اندر حیرت و استعجاب کا ایک پہلو ضرور رکھتا ہے، مگر اسے تمام تر حادثات کا کرشمہ نہیں قرار دیا جا سکتا۔ جو افراد یا جماعتیں ایسا سمجھ رہی ہیں، وہ ایک بار پھر ماضی کی طرح خود فریبی اور کم نظری کا شکار ہونا چاہتی ہیں۔ ہم بہ حیثیت قوم جس نشیب کی طرف لڑھک رہے تھے، اُس کا ہر صاحبِ نظر کو ٹھیک ٹھیک اندازہ تھا، یہ الگ بات کہ چند حکمتوں اور مصلحتوں کے سبب اُس کا برملا اظہار نہ کیا گیا ہو، اور جن دیوانوں نے سرِ بازار حق بات کہی بھی، اُس پہ کان دھرنے والے کتنے لوگ تھے؟ ہم نے ماہِ نومبر کے اُردو ڈائجسٹ میں لکھا تھا:

''فیصلے میں صرف ایک ماہ باقی ہے۔ عوام کا فیصلہ آخری اور قطعی ہوگا۔ اگر انھیں حقیقی خطرات سے اُن کی زبان میں باخبر کر دیا گیا، تو وہ کبھی میسولینی اور ہٹلر کے حق میں ووٹ نہ دیں گے۔ بنگلہ قومیت ہو یا قومی سوشلزم، وہ پاکستان کی بقا کے لیے دونوں کو ٹھکرا دیں گے، مگر سوال یہ ہے کہ اُن سیاسی جماعتوں کا کیا کیا جائے جو اسلام اور جمہوریت کے نام پہ عوام کے ووٹ تقسیم کر دیں گی۔ اِن دونوں ڈکٹیٹروں کے خلاف متحدہ محاذ بن جانا چاہیے تھا۔ وہ اِس طرح کہ ایک دو منظم جماعتوں کو باقی تمام جماعتیں سپورٹ دیتیں۔ ایسا نہ ہو سکا، کیونکہ چھوٹی چھوٹی قیادتیں اور معمولی معمولی مفادات قربان نہ کیے جا سکے۔ اب بھی وقت ہے، ہمیں ایک طرف دو ڈکٹیٹروں کا مقابلہ کرنا ہے جن کا اثر و نفوذ پورے پاکستان میں ہونے کے بجائے ایک ایک بازو میں محدود ہے۔ اِن کے علاوہ ایک ایسے خفیہ عنصر کا بھی مقابلہ کرنا ہے جو سیاسی جنگ سے فائدہ اُٹھا کر اپنے اقتدار کے لیے راستہ صاف کرتا رہا ہے۔'' کیا تین محاذوں پہ جنگ ایک دوسرے سے دست و گریبان رہتے ہوئے لڑی جا سکتی ہے؟ اور کیا ہم نے 'دست و گریباں' کے انجام سے قوم کو باخبر نہیں کر دیا؟

دسمبر کے شمارے میں ایک مضمون 'انتخابات سے پہلے، انتخابات کے بعد' شائع ہوا۔ ہم نے بڑی وضاحت سے آنے والی صورتِ حال کا نقشہ پیش کیا تھا جس میں ہماری اپنی چند آرزوئیں بھی شامل تھیں، مگر ہمارا دِل دھڑک دھڑک کر کہتا رہا کہ ہم جن حالات میں گھرے ہیں، اُن میں صیاد کا ظالم ہاتھ، آرزوؤں کے اَدھ کھلے پھول توڑ کر لے جائے گا۔ ہم نے لکھا تھا:

''گزشتہ چند ماہ میں اُبھرنے والے حقائق یہ بھی پیشین گوئی کرتے ہیں کہ آئندہ بیوروکریسی اور سرمایہ داری کا گٹھ جوڑ بھی آسانی سے نہ ہو سکے گا۔ انتخابات کے اُمیدواروں پہ ایک نظر ڈال لیجیے، اُن میں بہت کم صنعت کار اور سرمایہ دار نظر آئیں گے۔ پہلے سرمایہ دار تین چار سو ووٹ خرید لیا کرتے تھے، اب انھیں کم از کم پچاس ہزار ووٹ خریدنا ہوں گے۔ اِس بات کا بھی قوی امکان ہے کہ ووٹر رقمیں وصول کرنے کے بعد ووٹ اُسے دیں جس کے بارے میں اُن کا ضمیر مطمئن ہو۔ ہمیں یقین ہے سرمایہ دار ذلت آمیز شکست سے دوچار ہوں گے۔''

چند سطور مزید دیکھ لیجیے:

''اِسی سیاسی تربیت اور شعور کے نتیجے میں برادریوں کے خول کہیں کہیں سے ٹوٹ گئے ہیں اور کہیں کہیں سے ٹوٹنے والے ہیں۔ سیاسی بت لرزہ براندام ہیں اور ووٹوں کے دلال اپنا مستقبل تاریک دیکھ کر پریشان و مضطرب ہیں۔ ہمیں یقین ہے دو تین برس بعد ایک اور انتخاب ہو جائے، تو برادری کا نظام، ایک سیاسی نظام کی حیثیت سے کلیتاً ختم ہو جائے گا۔''

ہم نے یہ بھی لکھا تھا:

''ملک کے اقتصادی مسائل بھی اب کے غیر معمولی اہمیت اختیار کریں گے۔ ہزاروں اُمیدواروں نے اپنی آنکھوں سے ہاریوں اور کاشت کاروں کی تباہ حالی دیکھی ہے، اُن کے پست معیارِ زندگی کے نمونے مشاہدہ کیے ہیں؛ زرعی زمین پہ کس قدر بوجھ ہے، یہ پہلو بھی سامنے آ چکا ہے؛ صنعتی زندگی میں مزدور کے دن کیسے گزرتے ہیں ..... اَن گنت آنکھیں تماشا کر چکی ہیں۔ ملک کے قدرتی وسائل کس قدر ہیں اور ہماری اُن سے بے نیازی کس وجہ سے ہے، یہ بات کسی سے پوشیدہ نہ رہی ہوگی۔ اِن حقیقتوں کو دیکھ لینے کے بعد یہ ممکن نہیں کہ حساس دل اور باغیرت نظر، اطمینان کی آغوش میں سوتے رہیں۔''

اِس پیشین گوئی پر بھی نظر ڈالیے:

''موجودہ انتخابات کے نتیجے میں سیاست کے پرانے بے اُصول کھلاڑی بہت بڑی تعداد میں شکست کھا جائیں گے اور اِس شکست کے ساتھ ہی ہماری سیاست میں ایک نئے عہد کا آغاز ہوگا۔''

اور یہ الفاظ بھی آپ کی توجہ کا تقاضا کرتے ہیں:

''انتخابات کے نتائج یہ واضح کر دیں گے کہ عوام کا رجحان متوسط درجے کی قیادت کے حق میں رہا ہے۔ متوسط درجے کی قیادت ملک کے لیے اُتنی ہی ناگزیر ہے جتنا معیشت کے لیے متوسط طبقہ۔ اگر سوسائٹی میں متوسط طبقہ باقی نہ رہے، تو اقتصادیات کا زیادہ دیر تک مستحکم رہنا ممکن ہی نہیں۔ اِسی طرح اگر سیاست کی قیادت پہ دولت مند طبقہ مسلط ہو جائے، تو سیاسی زندگی میں معکوس ترقی شروع ہو جاتی ہے۔ انتخابات کے نتیجے میں متوسط طبقے کی قیادت ضرور اُبھرے گی۔''

یہ مضمون اردو ڈائجسٹ کے شمارہ جنوری ۱۹۷۱ء میں الیکشن کے بعد شائع ہوا تھا۔ اس زمانے میں وطنِ عزیز کے جو سیاسی ومعاشرتی حالات تھے، ان کا اس میں بخوبی نقشہ کھینچا گیا ہے۔ حیرت انگیز امر یہ ہے کہ ان حالات میں چار عشرے گذر جانے کے باوجود زیادہ تبدیلی نہیں آئی۔ مکمل مضمون پڑھنے کے لیے ''مشرقی پاکستان، ٹوٹا ہوا تارا'' ملاحظہ فرمائیے۔

یہ دوسری بات ہے کہ جو متوسط طبقہ برسرِ اقتدار آیا، وہ ہمارا محبوب نظر نہ تھا۔ آخر میں ایک دو اقتباسات پڑھنے کی زحمت اور اُٹھا لیجیے، اِن سے اُن خدشات کا اندازہ ہو جائے گا جن کا اظہار ہم نے ایک ماہ پہلے کر دیا تھا:

''عام انتخابات جس ماحول میں منعقد ہو رہے ہیں، وہ عجیب و غریب احساسات سے پُر ہیں..... نومبر کے پہلے عشرے میں سمندر اُبل پڑا اور لاکھوں جانیں لقمۂ اجل بن گئیں..... بعض اندرونی اور بیرونی حلقے اِسے کچھ اور ہی رنگ دے رہے ہیں۔ وہ اِس موقع کو مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے درمیان جذباتی دوری پیدا کرنے کی سرتوڑ کوششیں کر رہے ہیں۔ اُن کا پروپیگنڈا، مغربی پاکستان کی سردمہری کے افسانے تراش رہا ہے اور مشرقی پاکستان کی سرزمین میں نفرت کی آگ پھیلانے میں مصروف ہے..... اس زہرآلود ماحول میں منعقد ہونے والے انتخابات سے ایسے نتائج برآمد ہوں گے جو ملکی وحدت اور سالمیت کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں گے۔

''دین اور سیاست کی یک جائی کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ مذہبی فرقے میدانِ سیاست میں آ کر ایک دوسرے کے خلاف جہنم کا مژدہ سنائیں اور عوام کو مذہب کی غلط تعبیرات بتا بتا کر گمراہ کریں اور اُن کے جذبات میں ہیجان پیدا کر کے ایک ایسے فیصلے پر لے آئیں جہاں نفرت و انتقام کے سوا اور کچھ نہ ہو۔''

یہ طویل تمہید اِس حقیقت کی غماز ہے کہ آنے والے واقعات کے آثار ہویدا تھے جو وقت سے پہلے قوم کے سامنے رکھ بھی دیے گئے۔ قوم کا ایک حصہ حیران و ششدر ہے کہ یہ کیا ہو گیا! کچھ کہتے ہیں سیاسی سائیکلون آ گیا، اور کچھ کی زبانوں پر ہے کہ ووٹ کے ذریعے خاموش انقلاب در آیا۔ بعض کہتے ہیں قوم نے جذباتی فیصلہ دیا ہے [illegible] نابالغوں کا عہد کہا۔ اِن آوازوں کے مقابلے میں کچھ اور تنومند، گمبھیر اور کرخت آوازیں اُٹھ رہی ہیں جنھیں کان سننے کی تاب نہیں رکھتے۔ یہ آوازیں ہیں: عوامی انقلاب آ گیا! زنجیریں کٹ گئیں! تاج اُچھال دیے گئے! تخت گرا دیے گئے! سر کچلے گئے!

ہمیں اِن آوازوں کا تجزیہ کرنا ہو گا، تاکہ انتخابات کے 'صحیح نتائج' کا اندازہ لگایا جا سکے۔ صحیح نتائج سے ہماری مراد یہ ہے کہ انتخابات کے ایک سے زیادہ پہلو ہیں۔ قدرتی طور پر تمام پہلو متاثر ہوئے ہوں گے یا متاثر ہوں گے جن کا تعلق براہِ راست یا بالواسطہ انتخابی عمل سے ہے۔ ظاہر بیں نگاہیں انتخابی نتائج کے وقتی اثرات سے آگے نہیں دیکھیں گی اور 'سیاسی آنکھیں' تصور میں ہریالی کے مناظر دیکھتی رہیں گی۔ ہمارے نزدیک حالیہ انتخابات محض ایک سیاسی عمل نہیں، اُنھیں انقلابی عمل سے تعبیر کیا جا سکتا ہے جو قومی زندگی کے ہر شعبے پہ بڑی تیزی سے اثرانداز ہو رہا ہے۔

ہم حالیہ انتخابی عمل کو انقلابی عمل اِس وجہ سے کہتے ہیں کہ اِس کے ذریعے ماضی اور حال میں زبردست خلا پیدا ہو گیا ہے۔ ماضی سے حال کے بیشتر رشتے کٹے نظر آ رہے ہیں۔ جس تسلسل میں روایات، اقدار اور احساسات کا تسلسل بھی شامل تھا، وہ کھوکھلی چٹان کی طرح کانپ رہا ہے۔ پرانا نظام ب ہے، مگر پرانی شراب اچھی ہے۔ اب پرانی شراب کے رسیا نظامِ نو کی طرح ڈالنے کا عزم رکھتے ہیں۔ نئے نظام کے خدوخال پوری طرح واضح نہیں، مگر اُس کی داغ بیل ڈالنے والوں کے خدوخال، شبِ سیاہ میں خوب چمکتے ہیں۔ پرانے اداروں سے نفرت اور نئے اداروں کے لیے ہر آن بڑھتی شدت ہمیں انقلابِ فرانس کے دہانے پر لے آئی ہے۔ اِس انقلاب میں کیا بچے گا اور کیا بنے گا؟ یہ صرف تاریخ کی قوتوں کو معلوم ہے۔

تاریخ کی اُبھرنے والی قوتوں سے کوئی سوال کرنے سے پہلے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ماضی پر ایک ناقدانہ نظر ڈالی جائے اور اُن اسباب کا کھوج لگایا جائے جن کے ذریعے 'نابالغوں کا عہد' ..... 'عوامی انقلاب' بن گیا۔ ہمیں یہ جائزہ بڑی دیانت داری اور عرق ریزی سے لینا چاہیے، تاکہ قوم مستقبل کے راستے صاف طور پہ دیکھ سکے۔

یہ ایک محسوس حقیقت ہے کہ انتخابات میں عوامی لیگ اور پیپلز پارٹی کی عظیم الشان کامیابیاں ہوئیں اور اِن سیاسی جماعتوں کے خلاف جو منتشر قوتیں کام کر رہی تھیں، اُنھیں شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ صوبوں میں نیپ بھی تیسری قوت کی حیثیت سے اُبھری ہے، مگر اُس کے مدِمقابل مذہبی جماعتوں نے بھی مضبوط قوت حاصل کر لی ہے۔ سوال یہ ہے کہ قوم کے ایک موثر حصے نے عوامی لیگ، پیپلز پارٹی اور نیپ کے ہاتھ میں اپنی قسمت کی باگ کیوں دے دی، جبکہ اُن کے بارے میں مختلف جماعتیں یہ برملا کہتی رہیں کہ اُن کے برسرِاقتدار آنے سے نظریۂ پاکستان اور ملکی وحدت برقرار رکھنا محال ہو جائے گا؟ یہ سوال بہت اہم ہے جس کے صحیح جواب پر پاکستان کے مستقبل کا بہت زیادہ انحصار ہے۔ ہم اِسی سوال کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

مشرقی پاکستان کے حالات پہ گہری نظر ڈالنے سے وہاں کے انتخابی نتائج کا معمہ بہ آسانی حل ہو جاتا ہے۔ ایوب خاں کے عہد میں وہاں دو ہی بڑی سیاسی قوتیں کارفرما تھیں: مجیب اور بھاشانی۔ بھاشانی صاحب نے ۱۹۶۵ء کے انتخابات میں درپردہ ایوبی آمریت کا ساتھ دیا، لیکن عوامی لیگ نے حزبِ اختلاف سے عملی تعاون کیا اور عوام کی نظروں میں اپنا مقام بنا لیا۔ اُس کے بعد ۱۹۶۶ء کا مرحلہ آیا جس میں اعلانِ تاشقند کے خلاف لاہور میں قومی کانفرنس ہوئی۔ یہ بات تاریخ میں محفوظ ہو جانی چاہیے کہ ایک دو سیاسی قائدین (چودھری محمد علی اور نواب زادہ نصراللہ خاں) کی جلدبازی اور جذباتی فیصلے نے شیخ مجیب کو ایک ایسا راستہ اختیار کرنے پہ مجبور کر دیا جو نفرت و جذبات کا راستہ تھا اور جس پہ چلتے ہوئے وہ بالآخر منزلِ اقتدار پہ پہنچ ہی گئے۔ دوسری طرف وقت کے ساتھ ساتھ بھاشانی کی سیاسی قوت ٹوٹتی گئی۔ ۱۹۶۷ء میں نیپ سے پروفیسر مظفر علیحدہ ہوئے اور یہ سیاسی جماعت دو متحارب دھڑوں میں تقسیم ہو گئی۔ شیخ مجیب الرحمٰن سلاسل و زنداں کے مراحل طے کرتے رہے اور اُن کی شخصیت میں اِس قدر قوت مجتمع ہو گئی کہ صدر ایوب خاں کو اُس کے آگے گھٹنے ٹیکنا پڑے۔ جب شیخ صاحب فروری ۱۹۶۹ء میں رہا ہو کر آئے، تو عوام نے اپنے دل اُن کے قدموں میں بچھا دیے۔ وہ بلامبالغہ اُس وقت ایک بے تاج بادشاہ تھے۔

مارشل لا کے بعد کچھ دیر ستائے اور پھر اندر ہی اندر مستعد ہو گئے۔ بھاشانی کا فلسفہ، توڑ پھوڑ اور انتشار کا فلسفہ تھا۔ اُنھیں اور اُن کے ہم سفروں کو منظم اور مربوط معاشرے کے خلاف شدید نفرت تھی۔ مغربی پاکستان کے خلاف شیخ صاحب نفرت پھیلا کر اور مرکز کے مقابلے میں صوبائی خودمختاری کا محاذ قائم کر کے مشرقی پاکستان کی مکمل حمایت حاصل کر لینا چاہتے تھے۔ یہ دونوں رجحانات واضح طور پہ منفی اور تخریبی تھے۔ اِن قوتوں کا مقابلہ کرنے کے لیے کچھ عناصر میدان میں آئے بھی اور سوچ کے دھارے بھی قدرے بدلنے لگے، لیکن یہ تغیر بہت آہستہ تھا اور وقت کی موجیں ہر لحظہ تیز ہو رہی تھیں۔ نیپ کی طاقت کے منبع سوکھنے لگے اور یہ سیاسی جماعت جو پہلے ہی کئی دھڑوں میں بٹی تھی، انتخابی معرکے سے چند ماہ پہلے متعدد چھوٹی بڑی شاخوں میں تقسیم ہو گئی۔

مجیب۔ بھاشانی کشمکش میں بھاشانی بہت تیزی سے شکست کھا گئے۔ اِس طرح شیخ صاحب کے لیے راستہ بڑی حد تک ہموار ہو گیا، کیونکہ نیپ کی قوت سب سے بڑی حریف قوت تصور کی جاتی۔ وہ سب سے بڑی قوت اِس لیے تھی کہ دونوں سیاسی جماعتیں یکساں تکنیک اور طریقِ کار استعمال

کرتیں۔ دونوں کے حلقہ ہائے اثر بھی تقریباً ایک ہی تھے۔ دونوں کی قوت کے سب سے مضبوط سہارے طلبہ اور مزدور تھے۔ نیپ میں پھوٹ پڑنے سے پہلے ہی عوامی لیگ کی پوزیشن مضبوط ہونے لگی، کیونکہ بائیں بازو کا بڑا حصّہ اُس میں داخل ہوگیا تھا۔ ایک اور حصّہ عطاء الرحمٰن خاں کے اردگرد منڈلانے لگا۔ اِس طرح اشتراکی ذہن رکھنے والے کارکن اور دُوسری سطح کے قائدین، عوامی لیگ اور نیشنل پروگریسو لیگ میں اثرونفوذ پیدا کرنے میں مصروف ہوگئے۔

سیاسی میدان سے بھاشانی تقریباً ہٹ گئے، تو عطاء الرحمٰن خاں نے سر اُٹھانے کی کوشش کی۔ پہلے اُنھوں نے ایئرمارشل اصغرخاں کی طرف میلانِ طبع کا اظہار کیا، مگر پینگیں ایک حد سے آگے نہ بڑھ سکیں۔ اُدھر سے مایوس ہوکر خاں صاحب نے بھاشانی سے بھی رسم و راہ بڑھانے کی تگ و دو کی، مگر اُنھیں جلد ہی احساس ہوگیا کہ ڈوبنے والا، قریبی آدمی کو بھی ساتھ لے کر ڈوبتا ہے۔ عطاء الرحمٰن خاں کی شہرت اچھی تھی۔ بڑے بڑے صاحب کردار اُن کے تقدس کی قسمیں کھاتے۔ وہ مشرقی پاکستان کے دو سال وزیرِ اعلیٰ بھی رہ چکے تھے اور اُس عہد کے بارے میں عام تاثر یہی تھا کہ وہ بڑی حد تک معتدل اور مستحکم تھا اور اُسی زمانے میں خاں صاحب نے سیاسی دیانت داری کا ثبوت دیا۔ پڑھے لکھے اصحاب کی یہ رائے بھی تھی کہ عطاء الرحمٰن خاں انتظامی صلاحیتیں رکھتے ہیں جن کی باتیں معقول اور باوزن ہوتی ہیں اور اگر وہ عوامی لیگ میں رہتے، تو اُس کے لیے نہایت قیمتی سرمایہ ثابت ہوتے۔ اُن کی اِن خوبیوں نے عوام کے ایک طبقے کو اِس خیال میں گرفتار کر رکھا تھا کہ عطاء الرحمٰن خاں ایک مضبوط سیاسی ستون ثابت ہوں گے، مگر بہت جلد خوش فہمیوں کے بلبلے پھٹ گئے۔ اُنھوں نے عوامی لیگ کو شکست دینے کے لیے جو عناصر جمع کیے اُن کا تعلق مختلف و متضاد نظریوں سے تھا، چنانچہ دو چار قدم چلنے کے بعد آپس میں دست و گریباں ہوگئے اور نئی سیاسی جماعت کا شیرازہ بکھرتے بکھرتے بچا۔

اِس کے علاوہ خاں صاحب نے شیخ مجیب الرحمٰن سے زیادہ تیز چلنے کی بھرپور کوشش کی۔ اُنھوں نے اپنے مضامین میں کبھی دو دساتیر اور کبھی تین دساتیر کا نقشہ پیش کیا جن سے فیڈریشن کے بجائے کنفیڈریشن کا تصور اُبھرتا۔ اُنھوں نے آگے چل کر قراردادِ لاہور کی بنیاد پہ خودمختار بنگال کا مطالبہ بھی کیا۔ یہ تصورات اُن افراد کی ذہنی پیداوار تھے جو پاکستان میں بڑی مدت سے اشتراکی انقلاب کے لیے جدوجہد کر رہے تھے۔ یہ افراد و عناصر، نیپ کی صورت میں سیاسی شکست کھا چکے تھے، چنانچہ اِسی لیے عطاء الرحمٰن خاں کے نظریات مشرقی پاکستان کے بہت بڑے حصے کو متاثر نہ کر سکے۔ پھر معتدل عناصر نے یہ بھی سوچا کہ بعض معاملات میں عطاء الرحمٰن خاں، شیخ مجیب الرحمٰن سے بھی زیادہ انتہاپسند ہیں، اُنھوں نے پہلی ہی نظر میں خاں صاحب کو مسترد کر دیا۔ احساس کی ایک اور لہر نے خاں صاحب کو بہت پیچھے پھینک دیا۔ عوام نے دیکھا کہ شیخ صاحب کم از کم سات آٹھ برس سے مشرقی پاکستان کے لیے قربانیاں دے رہے ہیں، اُنھوں نے آمریت کے خلاف جنگ کی ہے، جیل کی صعوبتیں اُٹھائی ہیں، انتظامیہ کے ظلم تشدد برداشت کیے ہیں۔ اُن کے مقابلے میں خاں صاحب آرام و سکون کی زندگی بسر کرتے رہے۔ ایوبی آمریت میں اُن کے ہونٹ سلے رہے۔ اُنھوں نے ایک بھی نازک موڑ پر جرأت مندی کا ثبوت نہ دیا۔ وہ ایک دن کے لیے بھی جیل نہ گئے۔ آخر اُنھیں قائد کیوں تسلیم کر لیا جائے؟ چنانچہ عطاء الرحمٰن خاں نے ذلت آمیز شکست سے بچنے کے لیے بھاشانی کے دامن میں پناہ لی اور اِنتخابات کا بائیکاٹ کر دیا۔ اُن کے پاس منتشر اور بے جان کارکن تھے جن کی خاصی بڑی تعداد اُن طلبہ پہ مشتمل تھی جو عظیم مقصد کے بجائے چند سکوں کی کشش سے کھچے آئے تھے۔

فاتحِ نہاوند

جنھوں نے راہِ حق میں سرفروشی کے جو نقوش صفحۂ تاریخ پر مرتسم کیے وہ ابد الآباد تک قائم و دائم رہیں گے

اسلامی شخصیت ——— طالب الہاشمی

یوں تو عرب کے بیشتر قبائل نے فتح مکہ (رمضان المبارک ۸ ہجری) کے بعد ہی آستانۂ اسلام کے سامنے سر جھکایا اور اپنے اپنے وفد مدینہ منورہ بھیج کر سرورِ عالم ﷺ کی اطاعت کا اظہار کیا لیکن بعض سعادت مند قبائل ایسے بھی تھے جنھیں فتح مکہ سے بہت پہلے دعوتِ توحید پر لبیک کہنے کا شرف حاصل ہوگیا اور اُنھوں نے برضا و رغبت اپنے وفد حضور ﷺ کی زیارت اور بیعت سے مشرف ہونے کے لیے مدینہ منورہ بھیجے۔

ایسا ہی ایک وفد بنومزینہ کا تھا۔ اُن کا سلسلۂ نسب مضر پر قریش کے نسب نامے سے ملتا ہے۔ اُس قبیلے کے سردار بلال رضی اللہ عنہ بن حارث مزنی چار سو آدمیوں کو اپنے ساتھ لے کر رجب المرجب ۵ ہجری میں مدینہ منورہ آئے اور بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوکر حضور ﷺ کے دستِ مبارک پر مشرف بہ اسلام ہوگئے۔

نعمتِ اسلام سے بہرہ یاب ہونے کے بعد ارکانِ وفد نے حضور ﷺ سے ہجرت اِلی المدینہ کی اجازت چاہی، تو آپؐ نے فرمایا، تم لوگ فی الحال اپنے وطن واپس جاؤ اور وہیں قیام کرو۔ تمھیں بہرصورت مہاجرین ہی میں داخل سمجھا جائے گا۔

ایک روایت میں ہے کہ یہ لوگ جب مدینہ منورہ سے چلنے لگے، تو حضور ﷺ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ اُنھیں زادِ راہ دو۔ حضرت عمر فاروقؓ نے عرض کیا، یارسول

اللہ ﷺ! اِس وقت میرے پاس کھجوروں کی ایک قلیل
مقدار کے سوا اور کچھ نہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا، وہی دے
دو۔

ارشادِ نبویؐ کی تعمیل میں حضرت عمر فاروقؓ تمام مزنیوں
کو اپنے گھر لے گئے۔ سب نے حسبِ ضرورت کھجوریں لے
لیں لیکن پھر بھی کچھ کھجوریں بچ رہیں۔ یہ سب حضور ﷺ
کی دعا کا اعجاز تھا۔

اہلِ سِیَر کا بیان ہے کہ عرب کا یہ سب سے پہلا وفد تھا جو
اپنی خوشی سے دور دراز کی مسافت طے کر کے بارگاہِ رسالت
ﷺ میں قبولِ اسلام کے لیے حاضر ہوا۔ اِس سلسلے میں
علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ نے ''سیرۃ النبی ﷺ'' میں عراقی کی
''سیرتِ منظوم'' کا یہ شعر نقل کیا ہے۔

اول وفد وفد المدینہ
سنۃ خمس وفد وا مزینہ

(سب سے پہلا وفد مدینہ میں آیا، وہ مزینہ کا قبیلہ تھا جو
۵ ہجری میں آیا۔)

بنو مزینہ ''حاجب'' نامی ایک بت کی پرستش کیا کرتے
تھے۔ وطن واپس آ کر اُنھوں نے اُس بت کو توڑ ڈالا اور سختی
سے احکامِ اسلام کی پابندی کرنے لگے۔ بنو مزینہ کے وفد میں
مضبوط ہاتھ پاؤں کے ایک وجیہ نوجوان بھی تھے۔ قبولِ
اسلام سے پہلے وہ اپنے قبیلے کے بہادر شہسواروں میں شمار
ہوتے تھے لیکن سعادت اندوزِ ایمان ہونے کے بعد تو اُن کی
یہ حالت ہوگئی کہ دل میں ہر وقت حق کی خاطر مر مٹنے کی آرزو
مچلتی رہتی..... اُن کا یہی جوشِ ایمان اور جذبہ فدویت اُنھیں
فتح مکہ کے موقع پر بنو مزینہ کے دوسرے سرفروشوں کے ساتھ
بارگاہِ نبوی میں لے گیا اور یوں وہ رحمتِ عالم ﷺ کی ہم
رکابی کا شرف حاصل کرنے والے اُن دس ہزار قدوسیوں میں
[illegible]

استثناء میں اِس طرح پیش گوئی کی گئی تھی:

''خداوند سینا سے آیا اور شعیر سے اُن پر طلوع ہوا۔
فاران کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا۔ دس ہزار قدوسیوں کے
ساتھ آیا اور اُس کے ہاتھ میں ایک آتشیں (آسمانی یا نورانی)
شریعت اُن کے لیے تھی۔''

سرورِ عالم ﷺ نے بنو مزینہ کے اُس شہسوار کا جوشِ
ایمان دیکھا، تو آپؐ نے اُن کے قبیلے کا جھنڈا اُنھیں مرحمت
فرمایا اور وُہ بڑی شان سے یہ جھنڈا لہراتے ہوئے حضور
ﷺ کے ساتھ مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے۔ سید المرسلین
ﷺ کے یہ مزنی جاں نثار حضرت نعمان رضی اللہ عنہ بن عمرو بن
مقرن بن عائذ تھے جو تاریخ میں نعمانؓ بن مقرن کے نام
سے مشہور ہیں۔ ایک اور روایت کے مطابق فتح مکہ کے موقع
پر بنو مزینہ کے علمبردار حضرت بلال رضی اللہ عنہ بن حارث تھے،
تاہم اِس بات میں کوئی اختلاف نہیں کہ حضرت نعمانؓ بن
مقرن غزوۂ فتح میں شریک تھے۔

(۲)

فتح مکہ کے بعد عہدِ رسالت میں جو غزوات پیش آئے،
اُن میں حضرت نعمانؓ بن مقرن کی شمولیت کے بارے میں
اہلِ سیر نے صراحت نہیں کی لیکن قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ
اُنھوں نے غزوۂ حنین اور غزوۂ تبوک میں ضرور شرکت کی ہوگی
کیونکہ اُن جیسے سرفروش کو اُن غزوات سے پیچھے رہنے کا کوئی
سبب نہ تھا۔

حضور ﷺ کے وصال کے بعد حضرت ابوبکر صدیق
رضی اللہ عنہ سریر آرائے خلافت ہوئے، تو دفعتاً سارے عرب میں
فتنۂ ارتداد کی آگ بھڑک اُٹھی۔ مستند روایات سے ثابت ہے
کہ اُس نازک موقع پر حضرت نعمانؓ بن مقرن مدینہ منورہ
میں پہلے سے موجود تھے یا اپنے وطن سے مدینہ منورہ آ گئے
تھے۔ فتنۂ ارتداد کے مقابلے میں حضرت ابوبکر صدیقؓ نے
جس محیر العقول استقامت، عزم و ہمت اور غیرتِ ایمانی کا
مظاہرہ کیا، تاریخ اُس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔

سارے عرب میں پھیلے ہوئے مرتدین کی ہولناک
طاغوتی قوت کو وُہ مطلق خاطر میں نہ لائے اور اُنھیں کسی قسم کی
رعایت دینے سے صاف انکار کر دیا۔ مکہ معظمہ، مدینہ منورہ
اَور طائف کے باشندوں کے سوا عرب کا کوئی قبیلہ ایسا نہیں تھا
جو کسی نہ کسی حد تک فتنۂ ردّہ سے متاثر نہ ہوا ہو لیکن سب سے
زیادہ خطرہ نواحِ مدینہ کے قبائل سے تھا جو زکوٰۃ سے انکاری
اور مرکزِ خلافت، مدینہ منورہ پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنا چکے
تھے۔

اُن میں سے بنو اسد کمیراء میں، بنو فزارہ اَور بنو غطفان
مدینہ کے جنوب میں اور بنو ثعلبہ اور بنو عبس وغیرہ کا ایک بڑا
حصہ ابرق میں اور دُوسرا ذُوالقصہ میں خیمہ زن ہوا۔ وہاں
سے اُنھوں نے حضرت صدیقِ اکبرؓ کے پاس پیغام بھیجا کہ
ہم سے نماز پڑھوا لیں لیکن زکوٰۃ معاف کر دیں۔ حضرت
ابوبکر صدیقؓ نے اِس بارے میں اکابر صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین
سے مشورہ کیا، تو خطرات کے سیاہ بادل سر پر منڈلاتے دیکھ کر
سب نے نرمی کا مشورہ دِیا لیکن حضرت صدیقِ اکبرؓ خطرات
کے اُس بحرِ متلاطم میں کوہِ استقامت بن کر کھڑے ہو گئے اور
فرمایا:

> **حضرت ابوبکر صدیقؓ نے کہلا بھیجا کہ تم دشمن کے مقابلے میں ڈٹے رہو، مَیں ابھی تمہارے پاس پہنچتا ہوں۔**

''وحی کا سلسلہ منقطع ہوگیا، دین کمال کو پہنچ گیا، کیا میری
زندگی میں اِس کی قطع و برید کی جائے گی؟ اللہ کی قسم! منکرینِ
زکوٰۃ مجھے رتی کا ایک ٹکڑا دینے سے بھی انکار کریں گے جسے وہ
رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں دیا کرتے تھے، تو مَیں اُن
کے خلاف جہاد کروں گا۔''

مرتدین کے ایلچی یہ جواب سن کر واپس چلے گئے اور
حضرت صدیقِ اکبرؓ ہمہ تن مدینہ منورہ کے حفاظتی انتظامات
میں مشغول ہو گئے۔ مدینہ منورہ میں مقیم تمام صحابہ کرامؓ نے
اُن کا دل و جان سے ساتھ دیا۔ اُن میں حضرت نعمانؓ بن
مقرن بھی شامل تھے۔ قاصدوں کی واپسی کے تیسرے دن
مرتدین نے مدینہ منورہ پر حملہ کیا۔ جب وہ شہر کے ناکوں پر
پہنچے، تو محافظ ہوشیار تھے۔ اُنھوں نے حملہ روک کر خلیفۃ
الرسول کو اِس حملے کی اطلاع دی۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے کہلا بھیجا کہ تم دشمن کے
مقابلے میں ڈٹے رہو، مَیں ابھی تمہارے پاس پہنچتا ہوں۔
چنانچہ اُنھوں نے اہلِ مدینہ کی جمعیت ساتھ لی اور اُس کے
میمنے اور میسرے پر آزمودہ کار اَفسر مقرر کیے۔ اہلِ سِیَر کا
بیان ہے کہ حضرت صدیقِ اکبرؓ نے حضرت نعمانؓ بن مقرن
کو میمنے کا افسر بنایا۔ حق کے یہ جانباز سپاہی حضرت صدیقِ
اکبرؓ کی قیادت میں دشمن پر برقِ خاطف بن کر گرے اور
اُسے ''ذی حسیٰ'' کے مقام تک بھگا کر واپس آئے۔

اُن بھگوڑوں نے ذُوالقصہ میں مقیم اپنے ساتھیوں سے
مدد طلب کی۔ وہ فوراً اُن کی مدد کے لیے پہنچ گئے اور ذی حسیٰ
میں اُن کا ایک بڑا لشکر جمع ہوگیا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے
اُسی روز دوسرے حملے کی تیاری کی اور رَاتوں رات کوچ کر
کے علی الصّباح مرتدوں کے لشکر پر جا پڑے۔ مرتدین تابِ
مقاومت نہ لا سکے اور بھاگ کھڑے ہوئے۔ حضرت ابوبکر
صدیقؓ نے ذوالقصہ تک اُن کا تعاقب کیا اور پھر وہاں
حضرت نعمانؓ بن مقرن کو کچھ فوج کے ساتھ متعین کر کے
مدینہ واپس آ گئے۔

اِسی اثنا میں حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما سرحد شام کی مہم
سے فارغ ہو کر اپنے جَیش کے ساتھ مدینہ منورہ وَاپس آ
گئے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اُنھیں مدینہ منورہ کی حفاظت
پر مامور فرمایا اور خود ایک لشکر مرتب کر کے منکرینِ زکوٰۃ کے

ٹھکانوں کی طرف روانہ ہوئے۔ حضرت نعمانؓ بن مقرن بھی اپنے دستۂ فوج کے ساتھ اُن کے ہم رکاب ہوگئے۔ ربذہ کے قریب ابرق نامی مقام پر دشمن کا سامنا ہوا، تو اہلِ ایمان نے آناً فاناً اُس کے پرخچے اڑا کر رکھ دیے۔ اب حضرت ابوبکر صدیقؓ دوسرے مرتد باغیوں کی طرف متوجہ ہوئے اور ایک سال کے اندر اندر اُنھیں کچل کر تمام عرب میں امن و امان قائم کر دیا۔

(۳)

فتنۂ ردّہ کے فرو ہونے کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حضرت خالد ؓ بن ولید کو عراقِ عرب کی مہم پر روانہ کیا، تو حضرت نعمانؓ بن مقرن بھی اُن کے لشکر میں شریک ہوگئے۔ محمد حسین ہیکل نے اپنی کتاب ''عمر فاروق اعظم ؓ'' میں لکھا ہے کہ ''حضرت نعمانؓ بن مقرن عراق کی تمام معرکہ آرائیوں میں حضرت خالدؓ بن ولید کے پہلو بہ پہلو دادِ شجاعت دیتے رہے اور حضرت خالدؓ کی طرح فتح و نصرت اُن کی رکاب میں بھی چلتی رہی۔ اُس کے بعد جب حضرت سعد ؓ بن ابی وقاص عراقی فوج کے سپہ سالار مقرر کیے گئے، تو حضرت نعمانؓ اُن کے ساتھ بھی اسلامی لشکر کے ہراول دستے میں رہے۔''

علامہ شبلی نعمانیؒ نے ''الفاروقؓ'' میں بیان کیا ہے کہ ''حضرت سعدؓ بن ابی وقاص نے قادسیہ میں پڑاؤ ڈالا، تو وہاں سے حضرت عمر فاروقؓ کو اطلاع بھیجی کہ یزدجرد شاہ ایران نے رستم بن فرخ زاد کو ایرانی لشکر کا سپہ سالار مقرر کیا ہے اور وہ مدائن سے چل کر ساباط میں ٹھہرا ہے۔ اُس کے جواب میں حضرت عمر فاروقؓ نے حضرت سعدؓ کو حکم بھیجا کہ لڑائی سے پہلے کچھ لوگ سفیر بن کر جائیں اور ایرانیوں کو اسلام کی دعوت دیں۔

حضرت سعدؓ نے سردارانِ قبائل میں سے چودہ اشخاص منتخب کیے جو مختلف صفتوں کے لحاظ سے تمام عرب میں انتخاب تھے۔ اُن میں حضرت نعمانؓ بن مقرن بھی شامل تھے جو عقل و تدبیر اور حزم و سیاست میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ حضرت سعدؓ نے اُنھیں ہی اُس سفارت کا قائد بنایا۔

یہ سفارت رستم کے پاس گئی یا یزدجرد کے پاس، اِس کے بارے میں مختلف روایتیں ہیں لیکن اکثر مؤرخین کے نزدیک یہ سفارت یزدجرد کے پاس مدائن گئی تھی۔ قادسیہ سے مدائن تک تیس چالیس میل کی مسافت تھی۔ اسلام کے یہ سفیر گھوڑے اڑاتے ہوئے مدائن پہنچے، تو اُن کی وضع قطع دیکھ کر اہلِ مدائن پر حیرت طاری ہوگئی۔ سُتے ہوئے چہرے، کندھوں پر یمنی چادریں، پاؤں میں موزے، ہاتھوں میں کوڑے اور رانوں کے نیچے دبلے پتلے عربی گھوڑے جو بار بار زمین پر ٹاپیں مارتے تھے۔ یزدجرد نے اُس وفد سے

تم اِس ملک میں کیوں آئے ہو؟ کیا یہ جرأت تمھیں اِس لیے ہوئی ہے کہ ہم آپس کے جھگڑوں میں مصروف ہیں؟

ملاقات کے لیے بڑے سروسامان سے دربار سجایا۔ اہلِ وفد اپنی سادہ وضع میں بے باکانہ شاہی دربار میں داخل ہوئے۔ یزدجرد نے بڑے متکبرانہ لہجے میں اُن سے پوچھا: تم اِس ملک میں کیوں آئے ہو؟ کیا یہ جرأت تمھیں اِس لیے ہوئی ہے کہ ہم آپس کے جھگڑوں میں مصروف ہیں؟

قائدِ وفد حضرت نعمانؓ بن مقرن جواب دینے کے لیے آگے بڑھے اور نہایت بلیغ انداز میں رسول اللہ ﷺ کی بعثت اور آپؐ کی تعلیمات کا ذکر کر کے کسریٰ کو اسلام کی دعوت دی۔ اُس کے بعد فرمایا ''اگر تم یہ دعوت قبول کر لو، تو ہمارے بھائی ہو اور ہمارا تمھارے ساتھ کوئی جھگڑا نہیں، اگر اِس دعوت سے انکار ہے، تو جزیہ دینا قبول کرو اور اگر اِس سے بھی انکار ہے، تو پھر ہمارے تمھارے درمیان تلوار فیصلہ

کرے گی۔''

حضرت نعمانؓ کی تقریر سن کر یزدجرد بھڑک اُٹھا اور اُس نے کہا:

''تم بھول گئے ہو کہ دنیا میں تم سے زیادہ بدبخت، ذلیل اور خستہ حال کوئی قوم نہ تھی۔ جب کبھی تم سرکشی کرتے تھے، تو ہم سرحدی بستیوں کے رئیسوں کو حکم بھیج دیتے تھے اور وہ تمھارے کس بل نکال دیتے۔ اگر تم قحط سالی اور افلاس کی وجہ سے یہاں آنے پر مجبور ہوئے ہو، تو ہم خشک سالی دور ہونے تک تمھارے کھانے پینے کا انتظام کیے دیتے ہیں۔ ہم تمھارے سرداروں کی عزت کریں گے، تمھیں کپڑے پہنائیں گے اور تم پر ایسا شخص حاکم مقرر کر دیں گے جو تمھارے ساتھ شفقت اور مہربانی سے پیش آئے۔''

سفارت میں حضرت مغیرہ ؓ بن شعبہ ثقفی بھی شامل تھے۔ یزدجرد کی باتیں سن کر اُن سے ضبط نہ ہو سکا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھے اور کہا:

''اے بادشاہ! یہ لوگ (اہلِ وفد) عرب کے شرفاء ہیں اور اپنے حلم و وقار کی وجہ سے بسیار گوئی سے اجتناب کرتے ہیں۔ اِنھوں نے کچھ باتیں نہیں کہی ہیں۔ میں اُنھیں بیان کرتا ہوں۔ جو کچھ تم نے ہماری بابت کہا، وہ سچ ہے۔ ہم ایسے ہی تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے ہم میں ایک پیغمبر بھیجا جو حسب و نسب میں ہم سے ممتاز تھا۔ اُس نے ہمیں حکم دیا کہ دینِ اسلام کو تمام دنیا کے سامنے پیش کرو، جو لوگ اُسے قبول کر لیں، اُن کے حقوق وہی ہوں گے جو مسلمانوں کے ہیں۔ جو اسلام قبول نہ کریں لیکن جزیہ دینے پر راضی ہو جائیں، وہ اسلام کی حفاظت میں ہوں گے اور جو دونوں باتیں قبول نہ کریں، اُن کے لیے تلوار ہے۔''

حضرت مغیرہؓ کی تقریر سن کر یزدجرد غصّے سے بے تاب ہو گیا اور کہا ''اگر قاصدوں کا قتل خلافِ اصول نہ ہوتا، تو میں تمھارے سر قلم کرا دیتا۔ جاؤ تمھارے لیے میرے پاس مٹی

حضرت نعمانؓ بن مقرن اُس ہولناک لڑائی میں شروع سے آخیر تک سربکف ہو کر لڑے اور اپنی شجاعت کی دھاک بٹھا دی

اور ڈھول کے سوا کچھ نہیں۔''

پھر اُس نے مٹی کا ایک ٹوکرا منگوایا اور اپنے ملازموں کو حکم دیا کہ اِن میں جو سب سے زیادہ معزز ہو، یہ ٹوکرا اُس کے سر پر رکھ دو اور اِن سب کو یہاں سے چلتا کرو۔ ساتھ ہی اُس نے ارکانِ وفد سے کہا:

''جاؤ اور اپنے سردار سے کہہ دو کہ میں تمھاری سرکوبی کے لیے رستم کو بھیج رہا ہوں۔ وہ تم سب کو قادسیہ کی خندق میں دفن کر دے گا۔''

اراکینِ وفد یزدجرد کی دھمکی سے بالکل مرعوب نہ ہوئے، البتہ حضرت عاصم ؓ بن عمرو نے آگے بڑھ کر مٹی کا ٹوکرا خوشی خوشی اپنے سر پر رکھ لیا، پھر سب اراکینِ وفد گھوڑے اڑاتے حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کے پاس قادسیہ پہنچ گئے اور اُنھیں مبارک دی کہ دشمن نے خود اپنی مٹی ہمیں دے دی۔

اُدھر رستم کی فوجیں ساباط سے بڑھ کر قادسیہ میں اسلامی لشکر کے سامنے خیمہ زن ہوئیں۔ رستم کی خواہش پر حضرت سعدؓ نے اُس سے گفت و شنید کے لیے دو تین سفارتیں بھیجیں لیکن صلح و آشتی کی بیل منڈھے نہ چڑھ سکی اور جنگ کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ آخری سفارت کی واپسی کے تیسرے دن دونوں فوجیں ایک دوسرے کے سامنے صف آرا ہوئیں اور پھر تین دن اور ایک رات وہ گھمسان کا رن پڑا کہ الامان و الحفیظ۔

حضرت نعمانؓ بن مقرن اُس ہولناک لڑائی میں شروع سے آخیر تک سربکف ہو کر لڑے اور اپنی بے خوفی اور شجاعت

کی دھاک بٹھا دی۔ بالآخر مسلمانوں کی قوتِ ایمانی نے ایرانیوں کی مہیب طاغوتی قوت کو کمرشکن شکست دی۔ رستم سمیت اُن کے ہزار ہا جنگجو میدانِ جنگ میں کھیت رہے اور تختِ کسریٰ کی بنیادیں ہل گئیں۔

قادسیہ کی فتح کے بعد حضرت سعدؓ نے آگے بڑھ کر ایران کے پایۂ تخت مدائن پر قبضہ کر لیا اور پھر جلولا اور حلوان کی تسخیر کے ساتھ عراقِ عرب کی فتوحات اپنے اختتام تک پہنچ گئیں۔ حضرت عمر فاروقؓ کے حکم سے حضرت سعدؓ بن ابی وقاص نے ۱۶ ہجری میں کوفہ آباد کیا، تو حضرت نعمانؓ بن مقرن بھی اُن کے ساتھ کوفہ چلے گئے۔

مجھے اس کام سے سبکدوش کر کے مسلمانوں کے کسی لشکر میں جہاد فی سبیل اللہ کے لیے بھیج دیں

(۴)

خوزستان کا علاقہ عراق اور فارس کے درمیان واقع ہے۔

اُس میں اہواز، مناذر، سوس، رامہرمز، ایذج اور شوستر بڑے بڑے شہر تھے۔ خوزستان پر فوج کشی کی محرک اہواز کے ایرانی حاکم کی بغاوت تھی۔ اُس نے اپنا عہد توڑ کر مسلمانوں کو مقررہ سالانہ خراج ادا کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

۱۷ ہجری میں بصرہ کے گورنر حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے خوزستان پر لشکرکشی کی اور اہواز، مناذر، سوس اور رامہرمز کو مسخر کرتے ہوئے شوستر (تستر) کی طرف بڑھے جو خوزستان کا صدر مقام تھا۔ حضرت ابوموسیٰؓ کو اطلاع ملی کہ ایرانیوں کے ایک بہت بڑے لشکر نے شوستر میں زبردست جنگی تیاریاں کر رکھی ہیں اور اُن کی قیادت ایران کا ایک نامور سردار ہرمزان کر رہا ہے۔

حضرت ابوموسیٰؓ کے پاس کچھ زیادہ جمعیت نہیں تھی اِس لیے اُنھوں نے حضرت عمر فاروقؓ کی خدمت میں خط بھیج کر مدد کی درخواست کی۔ حضرت عمر فاروقؓ نے یہ خط ملتے ہی والیِ کوفہ کے نام حکم بھیجا کہ نعمانؓ بن مقرن کو ایک ہزار مجاہدین کے ساتھ ابوموسیٰؓ کی مدد کے لیے بھیجیں۔ چنانچہ اِس حکم کے مطابق حضرت نعمانؓ بن مقرن ایک ہزار سواروں کے ساتھ حضرت ابوموسیٰؓ کے پاس پہنچ گئے اور شوستر کی تسخیر میں اُن کے پہلو بہ پہلو حصہ لیا۔ بعض روایتوں میں ہے کہ خوزستان کے شہر رامہرمز اور ایذج حضرت نعمانؓ بن مقرن کے ہاتھ پر فتح ہوئے۔

خوزستان پر مسلمانوں کے استیلا نے ایرانیوں کو سخت مشتعل کر دیا۔ یزدجرد نے مُصمّم ارادہ کر لیا کہ وہ اپنے تمام وسائل بروئے کار لا کر عربوں کو اپنے ملک سے نکال دے گا۔ چنانچہ اُس نے تمام صوبوں میں قاصد دوڑا دیے اور وہاں کے گورنروں کو حکم دیا کہ اپنی اپنی فوجیں اہلِ عرب کے مقابلے کے لیے روانہ کریں۔ اس طرح طبرستان، جرجان، نہاوند، رے، اصفہان، ہمدان اور خراسان وغیرہ تمام صوبوں میں تلاطم برپا ہو گیا اور ڈیڑھ لاکھ ایرانی جنگجو قُم میں آ کر جمع ہوئے۔ یزدجرد نے ایک آزمودہ کار ایرانی جرنیل فیروزان (بروایت دیگر مردان شاہ پسر ہرمز) کو اُس لشکر کا سپہ سالار مقرر کیا۔ وہ بڑے کرّ وفر اور ساز و سامان کے ساتھ نہاوند پہنچا جو عراقِ عجم کا ایک بہت بڑا شہر تھا اور حلوان سے نوے میل جانب شرق اور ہمدان سے تیس میل جانب غرب کوہِ اَلوند کے دامن میں واقع تھا۔

دفاعی لحاظ سے یہ شہر اپنی مثال آپ تھا۔ شہر کے اردگرد ایک مضبوط فصیل تھی اور وسطِ شہر میں ایک مستحکم قلعہ تھا جس کی بلند اور مضبوط فصیلیں شہر کی حفاظت کی ضامن تھیں۔ حضرت عمر فاروقؓ کو ایرانیوں کے ٹڈی دل کے اجتماع کی خبر ملی، تو اُنھوں نے مدینہ منورہ میں موجود تمام اکابر صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کو جمع کیا اور تمام صورتِ حال اُن کے سامنے بیان کر کے

مشورہ طلب کیا۔ تمام اصحاب نے اپنی اپنی رائے دی۔

اُن میں ایک تجویز یہ بھی تھی کہ کوفہ، بصرہ، شام اور یمن وغیرہ کے گورنر اپنی اپنی فوجیں لے کر نہاوند پہنچ جائیں اور خود امیر المومنین مدینہ سے فوج لے کر روانہ ہوں لیکن حضرت علیؓ نے سب کے برعکس یہ رائے دی کہ نہ امیر المومنین مدینہ سے ہلیں اور نہ گورنر اپنی تمام فوجیں روانہ کریں بلکہ اُن کا صرف ایک ثلث روانہ کریں۔ سب نے اس رائے سے اتفاق کیا۔

اب سوال پیدا ہوا کہ اسلامی لشکر کا سپہ سالار کون ہو۔ لوگ ہر طرف خیال دوڑاتے تھے لیکن یہ فیصلہ نہ کر پاتے تھے کہ ایسی بڑی مہم کی قیادت کون کر سکتا ہے جو اصحاب اس کے اہل تھے، وہ دُوسری مہمات پر مامور تھے۔ بالآخر حضرت عمر فاروقؓ نے فرمایا:

''واللہ! میں کل ایک ایسے شخص کو اس مہم کا سپہ سالار مقرر کروں گا جو دشمنوں کے نیزوں کو کاٹ کر رکھ دے گا۔''

(الاخبار الطوال، ابوحنیفہ دینوری)

دوسرے دن حضرت عمر فاروقؓ نے اعلان کیا کہ میں نے نعمانؓ بن مقرن کو اِس مہم کا قائد منتخب کیا ہے۔ سب لوگوں نے اُن کی تائید کی اور کہا کہ یہ بالکل صحیح انتخاب ہے۔ بقول محمد حسین ہیکل عامۃ المسلمین کی یہ تائید اس بنا پر تھی کہ وہ نعمانؓ کو ایک ایسے بے جگر شہسوار کی حیثیت سے جانتے تھے جو پس و پیش اور فرار کے نام سے ناآشنائے محض تھا۔ وہ جنگ میں بڑے استقلال و تحمل سے کام لیتے تھے اور جب تک اچھی طرح موقع و محل نہ دیکھ لیتے، جلد بازی کو مصلحتِ جنگ کے خلاف سمجھتے تھے۔

جس وقت مدینہ منورہ میں یہ کارروائی ہو رہی تھی، حضرت نعمانؓ بن مقرن کہاں تھے؟ اس کے بارے میں مختلف روایتیں ہیں۔ ایک روایت یہ ہے کہ وہ خوزستان میں کئی اہم فتوحات حاصل کر کے دم لے رہے تھے اور حلوان میں مقیم تھے۔ دوسری روایت یہ ہے کہ حضرت سعدؓ بن ابی وقاص نے اُنھیں کسکر کا عاملِ خراج مقرر کیا تھا اور وہ اُس وقت اُسی حیثیت میں کام کر رہے تھے لیکن یہ کام اُن کی افتادِ طبع کے خلاف تھا۔

طبریؒ کا بیان ہے کہ اُنھوں نے حضرت عمر فاروقؓ کو ایک شکایتی خط لکھا کہ ''میری اور اِس منصب کی مثال ایسی ہے جیسی ایک نوجوان کے پہلو میں کوئی فاحشہ عورت ہو، میں آپ کو اللہ کا واسطہ دیتا ہوں کہ مجھے اِس کام سے سبکدوش کر کے مسلمانوں کے کسی لشکر میں جہاد فی سبیل اللہ کے لیے بھیج دیں.....''

جب سے حضرت محمد رسول اللہ ﷺ ہم میں مبعوث ہوئے، اللہ تعالیٰ برابر ہمیں فتح و نصرت سے نوازتا رہا ہے

اِس پر حضرت عمر فاروقؓ نے حضرت سعدؓ کو خط لکھا کہ ''نعمانؓ نے مجھے لکھا ہے کہ تم نے اُسے تحصیلِ خراج کا کام سونپا ہے جو اُسے ناپسند ہے۔ اُس کے دل میں جہاد کی تڑپ ہے، لہٰذا تم اُسے وقت کی سب سے اہم مہم نہاوند کا سپہ سالار بنا کر بھیجو۔''

خورشید احمد فاروق نے اپنی کتاب ''حضرت عمر فاروقؓ کے سرکاری خطوط'' میں سیف بن عمر کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ حضرت نعمانؓ خوزستان کی مہم پر جانے سے پہلے کسکر کے محصلِ لگان تھے۔ وہاں سے وہ خوزستان کے جہاد پر گئے اور ابھی وہیں مقیم تھے کہ حضرت عمر فاروقؓ نے اُنھیں نہاوند کی مہم کا سپہ سالار مقرر کیا۔

تیسری روایت یہ ہے کہ حضرت نعمانؓ اُس وقت کوفہ میں مقیم تھے۔ بہرصورت حضرت عمر فاروقؓ نے ایک طرف تو کوفہ اور بصرہ کے گورنروں کو خط لکھے کہ اتنی اتنی فوج نعمانؓ

کی قیادت میں دے دو اور دُوسری طرف حضرت نعمانؓ کو یہ مراسلہ بھیجا:

''اہلِ کوفہ نے مجھے اطلاع دی ہے کہ اہلِ فارس کا ایک بہت بڑا لشکر اسلام کا نورِ ہدایت بجھانے کے لیے نہاوند میں جمع ہوا ہے۔ مجھے اللہ کے فضل سے یقین ہے کہ وہ مسلمانوں کو فتح یاب کرے گا۔ میں نے اہلِ کفر و ضلالت کے لیے ایک لشکر بھیجنے کا ارادہ کیا ہے اور تمھیں اُس لشکر کا سالار مقرر کرتا ہوں۔ یہ خط ملتے ہی جہاد پر جانے کے خواہش مند مسلمانوں کو ساتھ لے کر مدائن کا رخ کرو اور وَہاں قصرِ ابیض کے قریب پڑاؤ ڈالو تا کہ بصرہ اَور کوفہ کی فوجیں تمھارے پاس پہنچ جائیں۔

''جب سارا لشکر یکجا ہو جائے، تو تم اللہ کی مدد اَور نصرت پر بھروسا کر کے نہاوند کی طرف چل پڑنا اور وَہاں پہنچ کر جنگی کارروائی کا آغاز کر دینا۔ مجھے پوری امید ہے کہ اللہ تمھاری مدد کرے گا اور دُشمن کو ہزیمت ہو گی..... جب دُشمن سے تمھارا مقابلہ ہو، تو تم پامردی سے ڈٹے رہنا اور صبر کا دامن مضبوطی سے پکڑے رہنا۔ (ابنِ اعثم کوفی و ناسخ التواریخ)

علامہ شبلیؒ نے ''الفاروقؓ'' میں لکھا ہے کہ حضرت نعمانؓ بن مقرن تیس ہزار کی جمعیت لے کر کوفہ سے روانہ ہوئے لیکن ابنِ جریر طبریؒ کے بیان کے مطابق حضرت نعمانؓ نے اہواز (خوزستان) سے نہاوند کی جانب پیش قدمی کی تھی اور کوفہ کی فوج اُن سے ماہ یا طرز کے مقام پر آ کر ملی تھی۔ حضرت عمر فاروقؓ نے حضرت نعمانؓ کو یہ بھی لکھا تھا کہ اگر اُن کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آ جائے، تو سالارِ اعلیٰ حذیفہ رضی اللہ عنہ بن الیمان ہوں گے اور اگر حذیفہؓ قتل ہوں، تو نعیم رضی اللہ عنہ بن مقرن اُن کی جگہ لیں گے۔ (بلاذریؒ نے نعیمؓ بن مقرن کے بجائے حضرت جریر بن عبداللہ البجلی رضی اللہ عنہ کا نام لکھا ہے۔)

حضرت نعمانؓ کی فوج میں عرب کے تمام نامور بہادر عمرو بن معدیکرب، طلیحہ بن خویلد اسدی اور عمرو بن سلمٰی رحمۃ اللہ علیہم بھی شامل تھے۔ چونکہ ایک دفعہ یہ لوگ فتنۂ ردّہ سے متاثر ہو گئے تھے، اِس لیے اُن کے بارے میں حضرت عمرؓ نے بدیں الفاظ خاص ہدایات بھیجیں:

''تمھارے لشکر میں ایسے لوگ ہیں جو عہدِ جاہلیت میں بڑے دلاور اَور مقتدر تھے۔ اُنھیں ایسے لوگوں پر ترجیح دو جو اُن جیسی عسکری سُوجھ بُوجھ نہیں رکھتے۔ اُن سے مشورہ کرو اَور اُن کے مشورے پر عمل کرو۔ طلیحہ، عمرو بن معدیکرب اور عمرو بن سلمٰی سے جنگی اُمور میں ضرور صلاح لو لیکن اُنھیں کوئی عہدہ نہ دو۔'' (طبری)

(۵)

حضرت نعمانؓ بن مقرن اپنے مستقر سے منزل بہ منزل چلتے ہوئے کسی مزاحمت کے بغیر اسپد ہان کے مقام پر پہنچ گئے جو نہاوند سے نو میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ (ابوحنیفہ دینوری نے ''اخبار الطوال'' میں اُس مقام کا نام ''اسنیذ بان'' لکھا ہے جو اُس کے بقول قدیسجان نام کے ایک گاؤں کے قریب اور شہر نہاوند سے تین فرسخ کے فاصلے پر تھا۔)

حضرت نعمانؓ نے وہیں پڑاؤ ڈال دیا۔ اُس وقت اُن کی کُل فوج مل ملا کر تیس ہزار کے لگ بھگ تھی۔ اُس میں جلیل القدر صحابہؓ بھی شامل تھے مثلاً حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت حذیفہ بن الیمان، حضرت جریر بن عبداللہ بجلی، حضرت مغیرہ بن شعبہ، حضرت قعقاع بن عمرو تمیمی رضوان اللہ علیہم اجمعین وغیرہ۔

فیروزان کو بھی مسلمانوں کی پیش قدمی کی اطلاع مل چکی تھی۔ وہ قادسیہ کی لڑائی میں موجود اَور مسلمانوں کی جرأت و شجاعت کا عینی شاہد تھا۔ لڑائی شروع کرنے سے پہلے اُس نے بہتر یہی سمجھا کہ مسلمانوں سے بات چیت کر لی جائے۔ چنانچہ اُس نے اسلامی لشکر کو پیغام بھیجا کہ اپنا کوئی آدمی سفیر بنا کر بھیجو۔

حضرت نعمانؓ نے یہ خدمت حضرت مغیرہؓ بن شعبہ کے سپرد کی۔ حضرت مغیرہؓ فیروزان کے پاس پہنچے، تو وہ طلائی تخت پر بڑے جاہ و جلال سے بیٹھا تھا اور اُس کے دائیں بائیں بڑے بڑے امرا و رُؤسا زرق برق لباس پہنے بیٹھے تھے۔ ہزاروں زرہ پوش پہرے دار ہاتھوں میں برچھیاں، تیر کمان اور ننگی تلواریں پکڑے دور تک پرے جمائے کھڑے تھے۔ حضرت مغیرہؓ بے باکانہ فیروزان کے سامنے بیٹھ گئے۔ اُن دونوں میں مترجم کے ذریعے جو گفتگو ہوئی وہ مدائن میں یزدجرد اَور اِسلامی وفد کی بات چیت سے ملتی جلتی تھی۔ آخر میں فیروزان نے کہا:

''یہ قدر اَنداز جو تم اپنے سامنے دیکھ رہے ہو، ابھی تمھارا فیصلہ کر دیتے لیکن مَیں نہیں چاہتا کہ اِن کے تیر تمھارے ناپاک خون میں آلودہ ہوں۔ اب بھی تم لوگ یہاں سے چلے جاؤ، تو مَیں تم سے درگزر کر سکتا ہوں۔''

حضرت مغیرہؓ نے فیروزان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا:

مجاہدین نے اُن کی ہدایت پر عمل کیا اور پوری شدت سے لڑائی جاری رکھی یہاں تک کہ ایرانیوں کی کمر ٹوٹ گئی

''بلاشبہ زمانۂ جاہلیت میں ہم سے زیادہ بدبخت اور کوئی قوم نہ تھی لیکن جب سے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم میں مبعوث ہوئے، اللہ تعالیٰ برابر ہمیں فتح و نصرت سے نواز رہا ہے۔ واللہ ہم اپنی پچھلی بدبختی کی طرف کبھی واپس نہ ہوں گے۔ اب تو ہم تمھارے ملک پر قبضہ کر کے رہیں گے یا اسے اپنی لاشوں سے پاٹ دیں گے۔''

غرض سفارت بے حاصل رہی اور فریقین لڑائی کے لیے تیار ہو گئے۔ ایرانیوں نے کھلے میدان میں مقابلہ کرنے کے بجائے قلعہ بند ہو کر لڑنا مناسب سمجھا۔ اُنھوں نے فصیلِ شہر کے چاروں طرف لوہے کے گوکھرو بچھا دیے اور اُن میں صرف دو تین راستے خالی رکھے تا کہ جس وقت حملے کے لیے نکلنا چاہیں، نکل سکیں۔

مسلمانوں کے گھوڑے اُن گوکھروؤں کو پار نہ کر سکتے تھے اور اِیرانی جب بھی موقع پاتے، شہر سے نکل کر مسلمانوں پر حملہ آور ہوتے۔ اِس طرح لڑائی طول کھینچنے لگی، تو حضرت نعمانؓ بہت فکرمند ہوئے۔ اُنھوں نے اہل الرائے اصحاب کو جمع کیا اور اُن سے الگ الگ رائے لی۔

طلیحہ بن خویلد اسدی کی رائے یہ تھی کہ ایک دستۂ فوج کے سوا باقی سب لشکر شہر سے چھ سات میل دور چلا جائے۔ جو دستۂ فوج پیچھے رہے، وہ شہر پر حملہ آور ہو اَور اِس قدر تیر برسائے کہ ایرانی مشتعل ہو کر شہر سے باہر نکل آئیں۔ پھر یہ دستہ پیچھے ہٹنا شروع کر دے، ایرانی بڑے اسلامی لشکر کو اَپنے سامنے والے مختصر سے دستۂ فوج کا ضرور تعاقب کریں گے۔ جب وہ ہماری زد میں آ جائیں گے، تو پھر وہ ہم سے اور ہم اُن سے نبٹ لیں گے۔ اللہ تعالیٰ اپنی مشیت کے مطابق اُن کے اور ہمارے درمیان فیصلہ کر دے گا۔

حضرت نعمانؓ کو یہ تجویز بہت پسند آئی اور دُوسرے اصحاب نے بھی اِس سے اتفاق کیا۔ دوسرے دن حضرت نعمانؓ ایک دستۂ فوج حضرت قعقاع رضی اللہ عنہ بن عمرو تمیمی کی قیادت میں پیچھے چھوڑ کر سارے لشکر کو چھ سات میل پیچھے لے گئے۔ حضرت قعقاعؓ نے حسبِ تجویز شہر پر حملہ کیا اور ایرانیوں کو اِس قدر اِشتعال دلایا کہ وہ غضب ناک ہو کر شہر سے باہر نکلے اور مسلمانوں سے لڑائی چھیڑ دی۔ حضرت قعقاعؓ نے اپنے دستے کے ساتھ آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنا شروع کر دیا۔ پُرجوش ایرانیوں نے اُنھیں تباہ کرنے کا تہیہ کر لیا اور اُن کے تعاقب میں آگے بڑھنے لگے۔ یہاں تک کہ بڑے اسلامی لشکر کے قریب پہنچ گئے۔ مسلمانوں نے ایرانیوں پر

حملہ کرنا چاہا، لیکن حضرت نعمانؓ نے اُنھیں روک دیا اور فرمایا کہ ہم دن ڈھلنے سے پہلے اِن پر حملہ نہیں کریں گے۔ اُدھر ایرانی تیروں کی بارش کر رہے تھے جس سے مسلمان زخمی اور حملہ کے لیے بے تاب ہو رہے تھے۔

حضرت نعمانؓ لڑائی چھیڑنے میں محض اِس وجہ سے دیر کر رہے تھے کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم دشمن پر ہمیشہ سورج ڈھلنے کے وقت حملہ کیا کرتے تھے۔ چنانچہ جب سورج ڈھلنے کو ہوا، حضرت نعمانؓ اپنے ترکی گھوڑے پر سوار ہوئے، سر پر سفید ٹوپی رکھی اور تمام صفوں میں گھوم پھر کر مجاہدین کی حوصلہ افزائی کی اور جوش دلایا۔ پھر دستور کے مطابق تین تکبیریں کہیں۔

پہلی تکبیر پر مسلمانوں نے اپنی صفیں درست کر لیں۔ دوسری پر تلواریں سونت لیں اور نیزے تان لیے۔ تیسری پر دشمن پر اس بے جگری سے حملہ کیا کہ کشتوں کے پشتے لگا دیے۔ میدان میں اس قدر خون بہا کہ گھوڑوں کے پاؤں پھسل پھسل جاتے تھے۔

حضرت نعمانؓ زخم پر زخم کھاتے دشمن کے قلبِ لشکر کی طرف بڑھ رہے تھے کہ اُن کا گھوڑا پھسل کر گرا اور وُہ بھی زمین پر آ رہے۔ اُن کے بھائی نعیمؓ بن مقرن قریب ہی تھے۔ اُنھوں نے جھپٹ کر نعمانؓ کے ہاتھ سے علم تھام لیا اور اُن کی سفید ٹوپی اپنے سر پر رکھ کر لڑائی جاری رکھی۔

ایک روایت میں ہے کہ حضرت نعیمؓ نے علم حضرت حذیفہؓ کے ہاتھ میں دے دیا اور خود دشمن کی صفوں میں گھس گئے۔ حضرت نعمانؓ نے گرتے وقت اپنے ساتھیوں سے کہہ دیا تھا کہ میں مر بھی جاؤں، تو کوئی میری طرف متوجہ نہ ہو۔ مجاہدین نے اُن کی وصیت پر عمل کیا اور پوری شدت سے لڑائی جاری رکھی۔ یہاں تک کہ ایرانیوں کی کمر ٹوٹ گئی اور وُہ بھاگ کھڑے ہوئے۔

اُس وقت ایک مجاہد حضرت نعمانؓ کے سرہانے گیا۔ اُنھوں نے نزع کے عالم میں پوچھا "لڑائی کا کیا انجام ہوا؟" اُس نے کہا، اللہ نے مسلمانوں کو فتح دی۔ فرمایا "اللہ کا شکر ہے۔ امیر المومنین کو فوراً اپنی فتح کی اطلاع دو۔" یہ کہہ کر اسلام کے اِس بطلِ جلیل نے آخری ہچکی لی اور تاجِ شہادت پہن کر خلدِ بریں میں پہنچ گئے۔ اِس طرح اُن کی وہ دُعا قبول ہو گئی جو اُنھوں نے لڑائی شروع ہونے سے پہلے مانگی تھی کہ الٰہی مجھے رتبۂ شہادت پر سرفراز فرمائیو۔

حضرت حذیفہؓ بن الیمان نے مژدۂ فتح کے ساتھ حضرت نعمانؓ کی شہادت کی خبر حضرت عمر فاروقؓ کو بھیجی، تو وہ بے اختیار رو پڑے اور دیر تک روتے رہے۔

"معرکۂ نہاوند" کو ایران کی اہم ترین لڑائیوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اِس لڑائی نے ایرانیوں کی قسمت پر مہر لگا دی اور پھر کبھی وہ اِتنا کثیر لشکر مسلمانوں کے مقابلے میں نہ لا سکے۔ اِسی لیے عربوں نے اِس لڑائی کا نام "فتح الفتوح" رکھا..... نہاوند کی تسخیر کے بعد ایرانیوں کے باقی تمام صوبے بھی دو سال کے اندر اندر مسخر ہو گئے اور سارے ایران پر مسلمانوں کا پرچمِ اقبال لہرانے لگا۔

حضرت نعمانؓ بن مقرن نے اپنی شجاعت و بسالت اور راہِ حق میں سرفروشی کے جو نقوش صفحۂ تاریخ پر مرتسم کیے وہ ابدالآباد تک اُن کا نام قائم و دائم رکھیں گے۔ رضی اللہ عنہ ◆◆◆

تاریخ بنا رہا ہوں

قیامِ میسور کے زمانے میں قائدِ اعظم ایک روز بنگلور میں رہ کر نندی ہل گئے۔ واپسی پر ایک روز کے لیے بنگلور میں پھر قیام کیا۔ پندرہ روز نندی میں رہے۔ بنگلور میں قائدِ اعظم نے مہاراجا میسور سے بات چیت بھی کی۔ ایک موقع پر ایک صحافی نے پوچھا "جناب! کیا آپ مسلم انڈیا کی تاریخ لکھ رہے ہیں؟"

مسکراتے ہوئے جواب دیا "میں مسلمانوں کی تاریخ لکھ نہیں رہا، بلکہ اُن کی تاریخ بنا رہا ہوں۔"

بھارت فاشسٹ ریاست بننے کی راہ پر

فاشزم اور نازی ازم سے آراستہ ہندو قوم پرستی کی نظریاتی تاریخ افشا کرتی حیرت انگیز اور تحیّر خیز داستان

آپ نے مختلف دانش وروں، ماہرینِ عمرانیات اور سیاست دانوں کو کہتے سنا ہو گا کہ بھارت فاشسٹ ریاست میں ڈھل چکا۔ اِس سے کیا مراد ہے؟ اور فاشسٹ کسے کہتے ہیں؟ عام لوگ ہی نہیں اچھے خاصے پڑھے لکھے بھی اِن سوالات کے جوابات نہیں دے پاتے۔ خاص طور پر بہ حیثیتِ پاکستانی ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہمارا پڑوسی جو ایک لحاظ سے دشمن بھی ہے، نظریاتی و عملی اعتبار سے کیسی صورت شکل اختیار کر رہا ہے۔

فاشسٹ ایک سیاسی عقیدے "فاشزم" پر عمل پیرا شخص کو

کہتے ہیں۔ فاشزم دراصل حکومت حاصل کرنے کا سیاسی طریق کار ہے جسے پہلے پہل اٹلی میں بینیتو میسولینی نے اپنایا۔ بعدازاں جرمنی میں ایڈلف ہٹلر نے اسی سے ملتے جلتے سیاسی عقیدے کی تشکیل کی جو عرفِ عام میں "نازی ازم" کہلاتا ہے۔ ہٹلر نے اُسے "قومی سوشلزم" کا نام دیا تھا۔ یہ فاشزم کی انتہاپسندانہ قسم ہے۔

مؤرخین کے مطابق افلاطون (یونان)، نکولائی میکاولی (اٹلی)، تھامس ہوبز (انگلستان)، ہیگل (جرمنی) اور نطشے (جرمنی) کے نظریات نے فاشزم کی تخلیق میں حصہ لیا۔ یہ سبھی فلسفی ریاست یا حکومت کے مفادات کو فرد (شہری) کے مفاد پر ترجیح دیتے ہیں۔ اور فاشزم کا پہلا اصول یہی ہے کہ ملک و قوم ایک شہری سے زیادہ اہم ہیں۔ دوسرا اہم اصول یہ کہ ایک طاقتور لیڈر ہی قوم کی قیادت کرتے ہوئے اُسے کامیاب کرسکتا ہے۔

نئے لیڈر کا ظہور

میسولینی (۱۸۸۳ء تا ۱۹۴۵ء) تعلیم پا کر صحافی بن گیا۔ بعدازاں اٹلی کی سوشلسٹ پارٹی کا رکن بنا اور جماعت کے اخبار کا مدیر مقرر ہوا۔ وہ کتابیں پڑھنے کا بہت شوقین تھا۔ اُس نے دنیا جہاں کی کتب پڑھیں اور یوں نت نئے فلسفیانہ نظریات سے آگاہ ہوا۔

پہلی جنگِ عظیم کا آغاز ہوا، تو میسولینی اُس میں شرکت کا حامی تھا۔ مگر سوشلسٹ پارٹی غیر جانب دار رہنا چاہتی تھی۔ میسولینی نے اختلاف کیا، تو اُسے پارٹی سے نکال دیا گیا۔ ۱۹۱۴ء میں میسولینی نے اپنی فاشسٹ پارٹی کی بنیاد رکھی۔

فاشسٹ لفظ لاطینی زبان کے لفظ "Fasces" سے نکلا ہے۔ زمانہ قدیم کی رومی سلطنت میں مجسٹریٹ پتلی شاخوں کو کلہاڑی کے گرد لپیٹ اور رسّی سے باندھ کر موٹا سا ڈنڈا بنایا کرتے تھے۔ ڈنڈا پھر مجرموں کو سزا دینے میں کام آتا۔

اِسی ڈنڈے کو "Fasces" کا نام ملا۔ یہ سلطنت میں حکومت کی طاقت کا مظہر تھا۔

اُس زمانے میں جنگِ عظیم اوّل کے باعث اٹلی کی معیشت، سیاست اور معاشرت انتشار اور زوال کا شکار تھی۔ حکومت کمزور تھی جو بدامنی اور مالیاتی بدنظمی پر قابو نہیں پاسکی۔ اِس صورتِ حال میں میسولینی نے نظریۂ فاشزم پیش کرتے

ہوئے اعلان کیا کہ صرف وہی طاقتور راہنما کے طور پر اٹلی کو درپیش تمام مسائل سے چھٹکارا دلاسکتا ہے۔ ماہرین سیاسیات کے نزدیک فاشزم کی اہم خصوصیات یہ ہیں:

اہم خصوصیات

☆ ریاست سپریم ہے، اِس کے مفادات شہریوں کے حقوق سے بھی بالاتر ہیں۔

☆ انتہاپسندانہ قوم پرستی کی ترویج یعنی یہ کہ ہمارا ملک اور ہماری قوم دیگر ممالک سے ہر لحاظ سے برتر ہے۔

☆ ایک طاقتور لیڈر اور طبقہ اشرافیہ ہی کو ملک پر حکومت کرنا چاہیے۔

☆ دیگر اقوام خصوصاً ملک میں آباد اقلیتوں کو قومی مسائل کا موجب قرار دینا۔

☆ مسلح تنظیمیں قائم کرنا تاکہ اقلیتوں پر ظلم ڈھائے جاسکیں اور دشمن جماعتوں کا مقابلہ ہوسکے۔

☆ امن کے بجائے جنگ جوئی کو ترجیح دینا۔ افواج کو جدید اسلحے سے لیس کرنا۔

☆ انسانی حقوق کی پاس داری نہ کرنا بلکہ اُنھیں پامال کر کے لطف حاصل کرنا۔

☆ یہ دعویٰ بھی کرنا کہ مرد خواتین سے ہر لحاظ سے برتر و طاقتور ہیں۔ لہٰذا اُنھیں ہی حکمران ہونا چاہیے۔

☆ میڈیا کو اپنے ماتحت بنالینا۔ یہ فیصلہ کرنا کہ کون سی خبریں شائع ہوں گی اور کون سی نہیں۔ گویا میڈیا کو اپنے کنٹرول میں لے لینا۔

☆ حکومت حاصل کرنے اور چلانے کے لیے کسی نہ کسی طور مذہب کو استعمال کرنا۔

☆ ملٹی نیشنل کارپوریشنوں کے مفادات کو تحفظ دینا۔

☆ شاعروں، ادیبوں اور دانش وروں کی حوصلہ شکنی اور اُنھیں دق کرنا۔

☆ انتخابات میں فراڈ کرنا تاکہ اپنی حکومت برقرار رکھی جاسکے۔

اقتدار پر قبضہ

فاشزم پر عمل پیرا ریاست میں تمام اختیارات ایک حکمران کی ذات میں جمع ہوتے ہیں۔ وہ سیاہ و سفید کا مالک بن جاتا ہے۔ حکومت اپنے ناقدوں کو خاموش کرنے کی خاطر ہر قسم کے حربے استعمال کرتی ہے۔ ضرورت پڑے، تو قتل کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتی۔ اُس کی ایک خاصیت ایلیٹ طبقے یا طبقہ اشرافیہ کو پروان چڑھانا ہے۔ فاشزم کے مطابق اشرافیہ ہی کو حکومت کرنے کا حق حاصل ہے۔ عوام بھی اچھے انداز میں حکومت نہیں کرسکتے۔

میسولینی نے نظریۂ فاشزم پر عمل کرتے ہوئے مسلح تنظیمیں بنائیں جن میں نوجوان بھرتی کیے گئے۔ ۱۹۲۲ء تک میسولینی کی پارٹی میں تیس ہزار نوجوان اسلحہ چلانے کی تربیت پا چکے تھے۔ اُسی سال مسلح نوجوانوں کی مدد سے میسولینی نے اقتدار پر قبضہ کرلیا۔ وہ پھر ۱۹۴۵ء میں اپنے قتل تک اٹلی پر آمرانہ انداز میں حکومت کرتا رہا۔

حکومت سنبھال کر میسولینی نے بعض عوام دوست اقدامات بھی کیے۔ مثال کے طور پر اُنھیں سرکاری سہولیات کو خدمات بہتر انداز میں ملنے لگیں۔ مگر جلد ہی میسولینی آمر بن بیٹھا اور شہریوں کو اپنی مرضی کے مطابق چلنے پر مجبور کیا۔ اُس نے پھر فوج تیار کی اور فرانس، برطانیہ، امریکا اور اُن کے ہم نوا ممالک سے لڑائی جھگڑے کرنے لگا۔ یوں میسولینی کی زیرِقیادت اٹلی ایک متشدد ریاست اور پولیس اسٹیٹ میں بدل گیا۔ معیشت پر بھی حکومت کا سخت کنٹرول تھا۔

ہندومت...... نیا مذہب

ہندوستان میں میسولینی اور اُس کے نظریۂ فاشزم نے ہندو قوم پرستوں کو بہت متاثر کیا۔ اردو ڈائجسٹ کے پچھلے شماروں میں ہندو قوم پرستی کی تاریخ پر تفصیلی مضامین شائع ہو چکے۔ مختصراً عرض ہے کہ بھارت کا جدید مذہب، ہندومت دراصل انگریزوں اور برہمنوں کی مشترکہ تخلیق ہے۔ جب انگریز ہندوستان آئے، تو یہاں غیر مسلم بت پرست سیکڑوں مذہبی گروہوں میں تقسیم تھے۔ انھی میں سے ایک برہمن مت بھی تھا۔

انگریزوں نے مسلمانوں کے بجائے برہمنوں کو اپنی حکومت کا نظم و نسق سونپ دیا۔ برہمنوں نے اِس نئی برتر حیثیت سے فائدہ اُٹھایا اور اپنے مذہبی عقائد کی تشہیر و توسیع کرنے لگے۔ رفتہ رفتہ بہت سے بت پرست اُن کے جھنڈے تلے آگئے۔ اِس طرح ہندومت کی بنیاد پڑی۔ اِس مذہب کی جدید تاریخ دیکھ لیجیے، تمام مذہبی راہنما برہمن ملیں گے۔

دیانند سرسوتی

ہندومت کے برہمن لیڈروں میں سوامی دیانند سرسوتی اسلام اور مسلمانوں کا کٹر دشمن تھا۔ اُسی نے پہلے پہل

ہندوستان میں باقاعدہ طور پر مسلم مخالف تحریک چلائی۔ اُس کا کہنا تھا کہ تمام ہندوستانی مسلمانوں کے اجداد ہندو تھے، لہٰذا اَب اُنھیں ہندو ہو جانا چاہیے۔ وہ انگریز مورخین کے اِس پروپیگنڈے سے بھی متاثر تھا کہ مسلمان بادشاہوں نے آٹھ سو سالہ دورِ اقتدار میں ہندوؤں (بت پرستوں) پر مظالم توڑے ہیں۔

سوامی دیانند کی مسلم مخالف تحریک کو بہت مقبولیت ملی اور لاکھوں بت پرست ہندومت کی چھتری تلے آ گئے۔ اِسی باعث برہمن راہنماؤں نے اسلام اور مسلمانوں کو اَپنا خاص ہدف بنا لیا۔ یوں وہ زیادہ سے زیادہ بت پرستوں کو اَپنے نئے مذہب میں لانا چاہتے تھے۔ اُن کا منصوبہ کامیاب رہا۔ آج ہندوستان میں برہمنوں کے دیوی دیوتا مثلاً وشنو (رام و کرشن)، شیو، لکشمی، اگنی، ہنومان، گنیش وغیرہ ہی سب سے زیادہ مشہور ہیں۔ جبکہ بقیہ بت پرست گروہوں کے دیوی دیوتا مقامی ہو چکے۔ مثلاً جنوبی بھارت میں بستے بت پرستوں کے دیوی دیوتا صرف مقامی سطح پر پوجے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر مونجے

سوامی دیانند سراسوتی کے مسلم دشمن نظریات سے برہمن پنڈت مدن موہن مالویہ متاثر ہوا۔ اُس نے ہندوؤں کی ترقی کے لیے ایک سیاسی و معاشرتی جماعت، ہندو مہاسبھا کی بنیاد رَکھی۔ یہ ۱۹۱۵ء کی بات ہے۔ اِس جماعت کا دوسرا سربراہ ایک اور برہمن، ڈاکٹر بی ایس (بال کرشنا شیورام) مونجے (۱۸۷۲ء تا ۱۹۴۸ء) تھا۔ یہ ڈاکٹر مونجے ہے جس نے ہندو قوم پرستوں کو منظم طور پر فاشزم اور نازی ازم سے متعارف کرایا۔ یہی نہیں اُن یورپی نظریات سے آگاہ ہو کر ہندو قوم پرستوں نے بھی میسولینی اور ہٹلر کی طرز پر نوجوانوں کی نیم عسکری تنظیمیں قائم کر لیں۔

اُس زمانے میں ''کیسری'' قوم پرست اور اِنتہا پسند ہندوؤں کا مقبول اخبار تھا۔ لندن میں ایک برہمن، ڈی وی تہامنکر اُسے یورپ کی خبریں بھجوایا کرتا تھا۔ یہ تہامنکر میسولینی کا قدردان اور پرستار بن گیا۔ تہامنکر نے میسولینی اور اُس کے نظریہ فاشزم کے متعلق کئی تفصیلی خبریں بھجوائیں جو ''کیسری'' میں شائع ہوئیں۔ اِس طرح قوم پرست ہندو لیڈر فاشزم کی غرض و ماہیت سے آشنا ہوئے۔

۱۹۲۷ء میں ڈی وی تہامنکر نے میسولینی اور فاشزم

کے بارے میں ایک کتاب بھی لکھی۔ اُس میں فاشسٹ تنظیم کے پورے ڈھانچے کی تفصیل بیان کی گئی۔ اُس نے میسولینی کی قائم کردہ عسکری تنظیموں پر خصوصاً روشنی ڈالی جو نوجوانوں کو نیم فوجی تربیت دیتی تھیں۔ انہی نوجوانوں کے سہارے پر میسولینی اٹلی پر قبضہ کرنے میں کامیاب رہا تھا۔

ہٹلر کا عجوبہ

اِسی دوران جرمنی میں ایڈلف ہٹلر کا عجوبہ جنم لے چکا تھا۔ ہٹلر قلاش مصور تھا۔ ۱۹۱۹ء میں وہ ایک قوم پرست پارٹی، جرمن ورکرز پارٹی کا رکن بن گیا۔ رفتہ رفتہ وہ اَپنی تقریری صلاحیتوں کے بَل پر پارٹی لیڈر بن بیٹھا۔ یہی جماعت بعد میں ''نازی پارٹی'' کے نام سے مشہور ہوئی۔

جب میسولینی نے اٹلی پر زبردستی قبضہ کر لیا، تو ہٹلر کو اُس کا انداز پسند آیا۔ چنانچہ ہٹلر نے بھی میسولینی کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے نوجوانوں کو نیم عسکری تربیت دینے والی تنظیمیں قائم کر لیں۔ اُن مسلح تنظیموں نے ہٹلر کو کرسیِ اقتدار پر بٹھانے میں اہم کردار اَدا کیا۔

ہٹلر نے نہ صرف فاشزم کے سبھی اجزا اَپنا لیے بلکہ اپنے سیاسی نظریے میں اُس نے یہود کو جرمنی کے تمام مسائل کی جڑ قرار دِیا۔ لہٰذا جرمنی سے یہود کا صفایا ہٹلر کے لیے بہت اہم مہم بن گیا۔ دوم اُس نے یورپی سفید قوم کو آریاؤں کی اولاد اَور اَعلیٰ ترین نسل قرار دِیا۔ اِسی لیے ہٹلر سیاہ فاموں کو پسند نہیں کرتا تھا۔

اِس طرح ہٹلر اپنے اطالوی معاصر، میسولینی کی راہ پر چل پڑا اَور جنگجوئی، نفرت انگیز متشدد سیاست کو اِختیار کر لیا۔ نازی پارٹی کی مسلح تنظیمیں بن گئیں جو خصوصاً یہود کو نشانہ بنانے لگیں۔ ۱۹۳۳ء میں آخرکار ہٹلر جرمنی میں سیاہ و سفید کا مالک بن گیا۔ اُس نے جلد آمر کا روپ اختیار کیا اور آمرانہ انداز میں حکومت کرنے لگا۔ ملک و قوم نے فرد کی آزادی پر فوقیت پالی۔ اب ہر جرمن شہری کا فرض قرار پایا کہ وہ ملکی تعمیر و ترقی کے لیے اپنی جان تک قربان کر دے۔

ہندو حکومت کا خواب

ہندو قوم پرستوں کے اخبار ''کیسری'' میں ایڈلف ہٹلر اور اُس کے نازی ازم کے بارے میں بھی خبریں اور مضامین شائع ہوئے۔ میسولینی اور ہٹلر کی کامیابیوں نے ہندو قوم پرست لیڈروں کو دم بخود کر دیا۔ اب وہ بھی ہندو نوجوانوں کو نیم عسکری تربیت دے کر ہندوستان پر اپنی آمرانہ حکومت قائم کرنے کے خواب دیکھنے لگے..... ایک ایسی حکومت جس میں ہندو اعلیٰ ترین حیثیت رکھتے ہوں جبکہ مسلمانوں سمیت تمام اقلیتیں اُن کی ماتحت بن جائیں۔

اٹلی کا دورہ

فروری تا مارچ ۱۹۳۱ء میں برطانیہ میں ہندوستانی لیڈروں کی گول میز کانفرنس ہوئی۔ اُس میں ڈاکٹر مونجے بھی شریک ہوا۔ مارچ میں ہندوستان واپس جاتے ہوئے وہ اِٹلی رک گیا۔ اِس دورے میں ڈاکٹر مونجے نے میسولینی کی اُن تنظیموں کے دفاتر کا دورہ کیا جو نوجوانوں کو نیم عسکری تربیت دیتی تھیں۔ اُس نے اُن کے طریق کار کو اَپنی ڈائری میں نوٹ کر لیا۔ یہ تنظیمیں چھ سال سے اٹھارہ سال کے نوجوانوں کو بھرتی کرتی تھیں۔ اُنھیں پھر روزانہ جسمانی ورزشیں کرائی

جاتیں۔ وہ ڈرل اور پریڈ میں حصہ لیتے۔ نیز چھوٹے موٹے ہتھیار چلانے کی نیم عسکری تربیت بھی فراہم کی جاتی۔ اِن متشددانہ تنظیموں کے متعلق ڈاکٹر مونجے نے اپنی ڈائری میں لکھا:

''میسولینی نے نوجوانوں کو نیم عسکری تربیت دینے کے لیے تنظیمیں قائم کی ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ اٹلی انتشار و زوال سے نکل کر ترقی و خوشحالی کے راستے پر گامزن ہو سکے۔ اطالوی فطری طور پر پُرامن اور محبت کرنے والے ہیں۔ وہ ہندوستانی (ہندوؤں) کی طرح جنگ جوئی پسند نہیں کرتے۔ مگر اِس عادت سے غیروں نے فائدہ اُٹھایا۔ اُنھوں نے اطالوی قوم کو اپنا مطیع بنالیا۔ میسولینی نے محسوس کیا کہ اطالویوں کو ہر وقت پُرامن نہیں رہنا چاہیے۔ لہٰذا اَب وہ اُنھیں جنگ لڑنا بھی سکھا رہا ہے تاکہ اٹلی اپنے حقوق حاصل کر سکے۔

''فاشزم'' نے اطالوی قوم کو متحد کر دیا ہے۔ ہندوؤں کو بھی نیم عسکری تربیت حاصل کرنا چاہیے تاکہ وہ دُشمنوں سے لڑنے کے قابل ہو سکیں۔ یوں اُنھیں اپنے بیرونی اور اَندرونی مسائل حل کرنے میں مدد ملے گی۔ اِس وقت ہندوؤں کا متحد ہونا ضروری ہے اور یہ کام نیم عسکری تعلیم و تربیت فراہم کرنے والی تنظیمیں بخوبی کر سکتی ہیں۔''

آر ایس ایس کا قیام

۱۹۳۱ء تک ڈاکٹر مونجے کا شاگرد اور پرستار، کیشیو بلرام ہیڈگوار ایک ہندو قوم پرست تنظیم، آر ایس ایس (راشٹریہ سویم سیوک سنگھ) قائم کر چکا تھا۔ ڈاکٹر مونجے نے فیصلہ کیا کہ میسولینی اور ہٹلر کی طرز پر آر ایس ایس کو بھی نیم عسکری تربیت فراہم کرنے والی تنظیم میں ڈھال دیا جائے۔

آر ایس ایس کے نوجوانوں کو ہفتے میں مرکز میں جسمانی ورزش کرائی جاتی تھی۔ اُس جگہ کو ''شاکھا'' کہا گیا۔ سنسکرت میں شاخ کو شاکھا کہتے ہیں۔ ڈاکٹر مونجے کی فرمائش پر شاکھا میں ہندو نوجوانوں کو جسمانی ورزشوں کے علاوہ مختلف ہتھیار چلانے کی تربیت بھی دی جانے لگی۔ اُن کی پریڈ ہوتی اور ڈرل بھی کرائی جاتی۔ اِس طرح ڈاکٹر مونجے اور ہیڈگوار نے آر ایس ایس کو میسولینی و ہٹلر کی نیم عسکری تنظیموں کے سانچے میں ڈھال دیا۔

نئی جدت

ہندو قوم پرست لیڈروں نے جدت یہ کی کہ اپنے نظریے فاشزم و نازی ازم میں مذہب کو سب سے زیادہ اَہمیت دے ڈالی۔ اُن کی منزل یہ بن گئی کہ ہندومت ہندوستان کا سب سے بڑا مذہب بن جائے اور وہاں ہندوؤں کی حکومت آ جائے۔ چونکہ اِس راہ میں مسلمان ایک بڑی رکاوٹ تھے، اِس لیے اسلام اور مسلمانانِ ہند کو ہندو قوم پرستوں نے خاص ہدف بنالیا۔ ویسے بھی انگریزوں کی آمد کے بعد مسلمانوں اور باثر برہمنوں (ہندوؤں) کے مابین چشمک و اِختلاف چلا آ رہا تھا، اُس نے جلد ہندو مسلم فساد کا روپ دھار لیا۔

ہندو قوم پرستوں نے ہندو مسلم فساد کی حمایت کی کہ اِس طرح وہ زیادہ سے زیادہ بت پرستوں کو ہندومت کے پلیٹ فارم پر لا سکتے تھے۔ یہی وجہ ہے، انیسویں صدی کے اواخر سے ہندوستان میں ہندو مسلم فساد ہونا معمول بن گیا۔ انگریز نے مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان لڑائی کے شعلوں کو ہوا دی تاکہ یہ دونوں اقوام آپس میں دست و گریباں رہیں، جبکہ وہ حکمرانی کے مزے لوٹتا رہے۔

قوم پرست کثرت میں

بیسویں صدی میں بنیادی طور پر دو اَقسام کے ہندو لیڈر تھے۔ پہلے طبقے میں شامل ہندو لیڈر مسلمانوں اور دِیگر اقلیتوں کو بھی ساتھ لے کر چلنا چاہتے تھے۔ اُن لیڈروں میں پنڈت نہرو سرِفہرست تھا۔ تاہم ایسے لیڈروں کی تعداد بہت کم تھی اور وُہ سوشلسٹ یا کمیونسٹ نظریات پر عمل پیرا تھے۔ بیشتر ہندو رہنما قوم پرست تھے۔ وہ ہندوستان میں ہندوؤں کی حکمرانی چاہتے تھے۔ بھارت کا پہلا کانگریسی نائب وزیرِاعظم، ولبھ بھائی پٹیل بھی یہی نظریہ رکھتا تھا۔ اِس سے عیاں ہے کہ کانگریس بظاہر اعتدال پسند پارٹی ہے، مگر اُس میں بھی قدامت پسند اور قوم پرست ہندو لیڈر بکثرت موجود ہیں۔

مثال کے طور پر ۱۹۹۲ء میں جب ہندو قوم پرستوں نے بابری مسجد شہید کی، تو بھارت میں کانگریسی لیڈر، نرسیمہا راؤ کی حکومت تھی۔ اگر حکومت چاہتی، تو فوج بلوا کر بآسانی بابری مسجد کی شہادت اور بعدازاں مسلمانوں کا قتلِ عام روک سکتی تھی۔ لیکن وزیرِاعظم نرسیمہا راؤ نے ایسا کوئی اقدام نہیں کیا، کیونکہ وہ بھی بابری مسجد گرا کر اُس جگہ رام مندر تعمیر کرنے کا حامی تھا۔

بھارت کے قیام سے پہلے ڈاکٹر بی ایس مونجے، ونائیک دمودر ساورکر (ہندو مہاسبھا کا تیسرا سربراہ)، ڈاکٹر ہیڈگوار، شیام پرشاد مکرجی (بھارت کا پہلا وزیرِ صنعت و تجارت) اور ایم ایس گوالکر ہندو قوم پرستوں کے مشہور لیڈر گزرے ہیں۔ اِن سبھی نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف تقریروں اور تحریروں میں اشتعال انگیز کلمات ادا کیے۔ مقصد یہ تھا کہ عام ہندوؤں کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکا کر اَپنے مفاد حاصل کیے جا سکیں۔

بت پرستوں کی تقسیم

قبل ازیں بتایا گیا کہ انگریز جب ہندوستان آئے، تو بت پرست مختلف مذہبی فرقوں میں منقسم تھے۔ شمالی، مشرقی، جنوبی اور مغربی ہندوستان میں آباد بھی بت پرست اپنے مخصوص دیوی دیوتا رکھتے تھے۔ اُن کے اپنے متنوع مذہبی عقائد، روایتیں اور رُسوم و رواج تھے۔ برہمن مت کا صرف شمالی ہندوستان میں زور تھا۔ اِس لیے وہیں وشنو، شیو، رام، کرشن وغیرہ کے پیروکار زیادہ آباد تھے۔ اکثر مختلف بت پرست گروہ آپس میں برسرِ پیکار بھی رہتے۔

جب انگریزوں نے ہندوستان کے نظم و نسق میں برہمنوں سے مدد لی، تو وہ طاقتور پوزیشن میں آ گئے۔ یہ برہمن کوشش کرنے لگے کہ ایک نئے مذہب، ہندومت کی صورت اپنے عقائد پورے ہندوستان میں مقبول بنا دیں۔ مگر اُن کے سامنے سب سے بڑی رکاوٹ یہی تھی کہ بت پرست کئی مذہبی گروہوں میں تقسیم تھے۔ اُنھیں ہندومت کے پلیٹ فارم میں جمع کرنا نہایت کٹھن مرحلہ بن گیا۔

پہلا بڑا ہندو مسلم فساد

۱۸۰۹ء میں مگر ایک واقعے نے برہمنوں کو ہندوستان میں ہندومت پھیلانے کی راہ دِکھلا دی۔ ہوا یہ کہ بنارس شہر میں ۱۸۰۹ء میں ایک مقام مسلمانوں اور دیوتا شیوا کے پیروکاروں کے مابین وجہ نزاع بن گیا۔ مسلمان اُس جگہ مسجد بنانا چاہتے تھے اور شیوا کے پیروکار اَپنے دیوتا کا مندر۔

اِس تنازع میں بنارس کے سبھی بت پرست اپنے مذہبی و سیاسی اختلافات پسِ پشت ڈال کر مسلمانوں کے خلاف ہو گئے۔ اُن کے اتحاد کی وجہ سے مسلمانوں کو پسپا ہونا پڑا۔ اِس فساد میں مسلمانوں کو زیادہ جانی و مالی نقصان ہوا اور وُہ معاشرتی طور پر کمزور ہو گئے۔ برہمنوں کے نزدیک یہ فساد سنگِ میل ثابت ہوا کیونکہ اُنھیں اپنا مشن مکمل کرنے کی راہ مل گئی۔

برہمنوں کو احساس ہوا کہ مسلمانوں کے خلاف تقریباً سبھی بت پرست ایکا و اِتحاد کر لیتے ہیں۔ شاید وجہ یہ ہے کہ

انگریز مسلسل پروپیگنڈا کر رہا تھا کہ ہندوستانی بت پرستوں کی غربت، جہالت اور بیماری کے ذمے دار مسلمان حکمران تھے۔ اِس پروپیگنڈے کی وجہ سے عام بت پرست مسلمانوں کے خلاف ہوگئے۔

برہمنوں کو فائدہ ملا

بت پرستوں میں مسلمانوں کے خلاف بڑھتی نفرت سے برہمنوں نے فائدہ اُٹھایا۔ سوامی دیانند سراسوتی اور دیگر برہمن لیڈر برسرِ عام کہنے لگے کہ بت پرستوں المعروف بہ ہندوؤں کو مسلم لٹیروں اور حملہ آوروں کی وجہ سے زوال آیا۔ لہٰذا اَب مسلمانوں کو سبق سکھانے کا وقت آ گیا ہے۔ اِس ساری مہم اور تحریک کا مقصد یہ تھا کہ برہمن مت المعروف بہ ہندومت کے پلیٹ فارم پر سبھی بت پرست اکٹھے ہوجائیں۔ یوں عددی برتری پا کر ہندومت کے پیروکار ہندوستان میں حکومت کرنے کے قابل ہوجاتے۔

یہی وجہ ہے کہ ۱۸۵۰ء کے بعد برہمنوں نے ایودھیا میں ایک نیا تنازع کھڑا کر دیا۔ دعویٰ کیا گیا کہ بابری مسجد رام مندر ڈھا کر تعمیر کی گئی ہے۔ یہی وہ تنازع ہے جس نے آر ایس ایس کی سیاسی شاخ، بی جے پی (بھارتیہ جنتا پارٹی) کو پورے بھارت میں مقبول بنایا اور آخرکار وہ حکومت کرنے لگی۔

سوامی دیانند سراسوتی کی کتاب "ستیارتھ پرکاش" میں قرآن وسنت اور مسلمانوں کے خلاف زہریلا مواد ملتا ہے۔ اِس کتاب نے عام بت پرستوں کے ذہن متاثر کرنے میں اہم کردار اَدا کیا۔ یہ سوامی سراسوتی ہے جس نے عام ہندوؤں کو سیاسی و معاشرتی طور پر بیدار کرنے کے لیے ایک بڑی تنظیم، آریہ سماج کی بنیاد رکھی۔ سوامی سراسوتی کے نقشِ قدم پر چل کر دیگر ہندو قوم پرست بھی اپنے مقاصد پانے اور مفادات پورے کرنے کی خاطر مسلمانوں کو ہدف بنانے لگے۔

۱۹۲۳ء میں اودھ مہاسبھا کے اجلاس میں خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر بی ایس مونجے نے کہا تھا "انگلستان انگریزوں کا ہے۔ فرانس کے مالک فرانسیسی ہیں۔ جرمنی جرمنوں کا ملک ہے۔ اِسی طرح ہندوستان کے اصل مالک ہندو ہیں۔ اگر ہندو اتحاد و اِیکا کر لیں، تو وہ انگریزوں اور مسلمانوں کو ملک سے باہر نکال سکتے ہیں۔ ہندوؤں کو شدھی (مسلمانوں اور عیسائیوں کو ہندو بنانا) اور سنگھٹن (تنظیم سازی) کی تحریکوں پر خاص توجہ دینی چاہیے۔"

ہندوتوا کا نظریہ

ہندو مہاسبھا اور آر ایس ایس، بت پرستوں کو اپنی چھتری تلے لا کر ہندو بناتی رہیں۔ اُن کی طاقت میں بتدریج اضافہ ہوا۔ کانگریس کے لیڈر خود کو سیکولر اور روادار کہتے تھے مگر وہ بھی ہندوستانی مسلمانوں کو حقوق نہیں دے سکے۔ اِسی لیے مسلمانانِ ہند قائداعظم محمد علی جناح کی زیرِ قیادت آزاد مملکت بنانے کی خاطر جدوجہد کرنے لگے۔

ہندو قوم پرست میسولینی اور ہٹلر کے نقشِ قدم پر چل کر ہندوستان میں اپنی حکومت بنانے کا خواب دیکھ رہے تھے۔ ہندو قوم پرستوں میں ونائیک دامودر ساورکر پہلا لیڈر ہے جس نے ہندوستان میں ہندو حکومت (ہندو راشٹریہ) کا تصور پیش کیا۔ اِس تصور کو ساورکر نے "ہندوتوا" کا نام دیا۔ ساورکر کا نظریہ تھا:

"ہندو قوم صرف ہندوؤں (بت پرستوں) پر مشتمل ہے۔ اس ہندو قوم میں وہ مسلمان اور عیسائی بھی شامل نہیں جن کے اجداد ہندو تھے۔ کیونکہ یہ مسلمان اور عیسائی غیر ہندوانہ رسوم و رواج اختیار کر چکے۔ لہٰذا انھیں ہندو نہیں کہا جا سکتا۔"

حکمتِ عملی

غرض ۱۹۳۵ء تک ہندو قوم پرستوں نے اپنے مقاصد پورے کرنے کی خاطر ایک حکمتِ عملی ترتیب دے دی۔ اِس حکمتِ عملی کے تین بنیادی پہلو تھے۔ اوّل مسلمانوں کے خلاف جارحانہ مہم چلانا، دوم اپنی تنظیموں کو فاشسٹ نظریات کی بنیاد پر جنگجو بنانا اور سوم ہندومت کے ایسے نظریوں کی تخلیق جنھیں سبھی بت پرست (ہندو) قبول کر لیں۔

۱۸۰۹ء سے لے کر ۱۹۳۵ء تک مختلف واقعات اور عوامل کے ذریعے ہندو قوم پرستوں کو یقین ہو گیا کہ کامیابی پانے کا ایک اہم گر یہ ہے کہ اپنا ایک مذہبی دشمن تلاش کر لو۔ یہ دشمن مسلمانوں کی صورت سامنے آیا۔ چنانچہ مسلم دشمن ہونا ہندو قوم پرستوں کی پہچان بن گئی۔

ایم ایس گولوالکر، آر ایس ایس کا دوسرا سربراہ گزرا ہے۔ یہ ۱۹۴۰ء تا ۱۹۷۳ء اس عہدے پر فائز رہا۔ یہ اپنے پیش رووں سے بھی زیادہ مسلم مخالف تھا۔ اُس کا کہنا تھا "ہندوستان میں جو لوگ ہندو حکومت قائم کرنے کے مخالف ہیں، وہ غدار اور ہمارے دشمن ہیں۔ انھیں زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔" گولوالکر کے انتہاپسندانہ نظریات کی وجہ سے ہی دلتوں کے لیڈر، ڈاکٹر امبیدکر نے اپنی کتاب "پاکستان اور دی پارٹیشن آف انڈیا" میں لکھا:

"اگر ہندوستان میں ہندو برسرِ اقتدار آ گئے، تو یہ یقینی ہے، وہ مسلمانوں کو اپنا غلام اور ماتحت بنا لیں گے۔"

گاندھی کا قتل

ہندو قوم پرستوں کو گاندھی جی، پنڈت نہرو، راج گوپال اچاریہ، مولانا آزاد، سبھاش چندر بوس، ڈاکٹر امبیدکر اور دیگر اعتدال پسند و روادار رہنماؤں کی وجہ سے زیادہ کامیابی نہیں مل سکی۔ ۱۹۴۷ء میں جب بھارت کا قیام عمل میں آیا، تو درج بالا لیڈر اُسے سیکولر آئین بنانے میں کامیاب رہے۔ اس امر سے قوم پرست ہندوؤں کو بہت صدمہ پہنچا۔ یہی وجہ ہے، آر ایس ایس اور ہندو مہاسبھا کے لیڈروں نے طیش میں آ کر گاندھی جی کو اپنے کارکنوں سے قتل کرا دیا۔

یہ عیاں ہے کہ ہندو قوم پرستوں کے مشہور لیڈر مثلاً بال گنگا دھر تلک، ساورکر، ہیڈگوار اور گولوالکر اتنے طاقتور اور بااثر لیڈر نہیں تھے کہ عوام میں مقبول ہو جاتے۔ اُن کے نظریات نے ہندو عوام کو متاثر تو ضرور کیا مگر وہ حکومت کانگریسی رہنماؤں کی چاہتے تھے کیونکہ وہ پورے ہندوستان میں سب سے بڑی جماعت تھی۔

گاندھی جی قتل ہوئے، تو نہرو حکومت نے ہندو قوم پرست جماعتوں پر کریک ڈاؤن کر دیا۔ اُن کے لیڈر زیرِ زمین چلے گئے۔ پھر بھی آر ایس ایس اور ہندو مہاسبھا کے لیڈر ۱۹۵۱ء میں اپنی ایک سیاسی جماعت "بھارتیہ جن سنگھ" بنانے میں کامیاب رہے۔ بھارتیہ جن سنگھ کے مشہور راہنماؤں میں اٹل بہاری واجپائی اور اَیل کے ایڈوانی نمایاں ہیں۔

بی جے پی کا قیام

۱۹۸۰ء میں اِس سیاسی جماعت کا نام بھارتیہ جنتا پارٹی رکھ دیا گیا۔ بھارتیہ جن سنگھ نے اپنی تیس سالہ زندگی میں اہم کامیابی صرف پارلیمانی الیکشن ۱۹۶۷ء میں پائی تھی جب وہ ۳۵ نشستیں جیت کر لوک سبھا (بھارتی قومی اسمبلی) میں تیسری بڑی پارٹی بن بیٹھی مگر پھر وہ زوال پذیر ہوگئی۔

ہندو قوم پرستوں کی نئی جماعت، بی جے پی الیکشن ۱۹۸۴ء میں صرف ''دو'' نشستیں جیت سکی۔ لیکن اُسی سال ہندو قوم پرستوں نے بابری مسجد شہید کر کے وہاں رام مندر تعمیر کرنے کی مہم چلا دی۔ اُس مہم کو ہندو عوام میں بہت مقبولیت ملی اور لاکھوں ہندو بی جے پی کے پلیٹ فارم پر جمع ہوگئے۔ یوں رام مندر تعمیر کرنے کی مہم ہندو قوم پرستوں کو نئی زندگی دینے کا سبب بن گئی۔ ایک تاریخی مسجد اور مسلمانوں کے خلاف تحریک چلا کر، نفرت و دُشمنی کی سیاست کر کے ہی اُنھیں کامیابی ملی۔ یہ تاریخ کا کھلا تلخ سچ ہے۔

پارلیمانی الیکشن ۱۹۸۹ء میں بی جے پی کو ۸۵ نشستیں

ملیں۔ الیکشن ۱۹۹۱ء میں وہ ۱۲۰ سیٹیں حاصل کر کے لوک سبھا کی دوسری بڑی پارٹی بن گئی۔ اگلے ہی سال ہندو قوم پرستوں نے بابری مسجد شہید کر ڈالی۔ الیکشن ۱۹۹۸ء میں آخر اتنی زیادہ نشستیں مل گئیں کہ وہ حکومت بنانے میں کامیاب رہی۔ بی جے پی کے رہنما، واجپائی ۲۰۰۴ء تک وزیر اعظم رہے۔

بیسویں صدی کے اواخر تک بھارت کی فوج، افسر شاہی اور عدلیہ میں ہندو قوم پرستی کے جراثیم زیادہ موجود نہ تھے۔ مگر سیاست میں ہندو قوم پرست تیزی سے غلبہ پا رہے تھے۔ بھارتی اسٹیبلشمنٹ نے واجپائی کو اِس لیے قبول کیا کہ وہ دیگر قوم پرستوں کے مقابلے میں اعتدال پسند تھے۔ اِسی لیے اُنھوں نے اپنے دور میں بھارتی مسلمانوں کے خلاف کوئی مہم نہیں چلائی۔ تاہم چھ سال کے عرصے میں ایک بڑی تبدیلی ضرور آ گئی۔

ہندو قوم پرستی کا عروج

تبدیلی یہ تھی کہ ہندو قوم پرست اِس دوران فوج، بیوروکریسی اور عدلیہ میں نفوذ کر گئے۔ اُنھوں نے مذہب اور قوم پرستی کے نام پر اسٹیبلشمنٹ میں اہم عہدوں پر فائز شخصیات کو اَپنا ہم نوا بنا لیا۔ یہ شخصیات بھی ہندو قوم پرستوں کے اِس نظریے سے اتفاق کرنے لگیں کہ بھارت میں ہندو اکثریتی فرقہ ہیں، لہٰذا اُنہی کا مذہب، روایات اور رُسوم و رواج رائج ہونے چاہئیں۔ جبکہ اقلیتوں خصوصاً مسلمانوں کا فرض یہ ہے کہ وہ ہندو قوم کی برتری تسلیم کر لیں۔

ہندو قوم پرستوں کو امید تھی کہ وہ اِلیکشن ۲۰۰۴ء جیت جائیں گے، مگر کانگریس نے غیر متوقع طور پر بی جے پی کو شکست دے دی۔ کانگریسی پھر اتحادیوں کے ساتھ ۲۰۱۴ء تک حکومت کرتے رہے۔ اِس دوران حکومتی وزیروں نے کرپشن کے نئے ریکارڈ قائم کر دیے جبکہ ترقی و خوشحالی کے ثمرات بھارتی عوام تک نہیں پہنچ پائے۔ اِس لیے بھارتی عوام کانگریس اور اُس کے اتحادیوں سے برگشتہ ہوگئے۔

مہا پرش سامنے آ گیا

قبل ازیں بتایا گیا کہ میسولینی اور ہٹلر کے وضع کردہ سیاسی نظریات کا ایک اہم نکتہ یہ تھا: ریاست پر ایک طاقتور حکمران ہی صحیح طرح حکومت کر سکتا ہے۔ اِس نکتے کی مدد سے دونوں رہنما اٹلی اور جرمنی میں حکومت پانے میں کامیاب رہے۔ ۲۰۱۴ء میں ہندو قوم پرستوں نے میسولینی اور ہٹلر

کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے یہ تحریک چلا دی کہ اُن کا امیدوار ..... نریندر مودی ہی بھارت کو معاشی و سیاسی طور پہ سپرپاور بنا سکتا ہے۔ انھوں نے مودی کو "مہا پرش" یعنی فوق البشر ہستی، بہترین منتظم اور طاقتور انسان (strong man) کے طور پر پیش کیا۔

نریندر مودی ہندو قوم پرستوں کی صف میں ۲۰۰۱ء میں نمایاں ہوا جب اُس نے ہندو غنڈوں کو کتوں اور بھیڑیوں کی طرح گجراتی مسلمانوں پر چھوڑ دیا۔ تب مودی کے حکم پر ریاستی مشینری جام ہو گئی اور مجبور و بے کس مسلمان گاجر مولی کی طرح کاٹ دیے گئے۔ بعد ازاں گجراتی صنعت کار، امبانی برادران اور گوتم اڈانی اُس کی ہر ممکن مدد کرنے لگے۔ ان کھرب پتیوں کی مدد سے مودی نے نہ صرف ریاست گجرات کو ترقی دی بلکہ خود کو بطور سخت گیر اور قابل حکمران نمایاں کرنے میں کامیاب رہا۔

یہ مگر حقیقت ہے کہ کانگرسی لیڈروں کی کرپشن اور نا اہلی نے مودی کو بھارتی عوام کے لیے زیادہ پسندیدہ بنا دیا۔ مودی نے الیکشن ۲۰۱۴ء جیت لیا اور تب سے بھارت پر براجمان ہے۔ اُس کا طریقِ حکومت عوام اور اشرافیہ، دونوں کو خوش [illegible]

اسٹیبلشمنٹ، ایلیٹ طبقہ اور خصوصاً متوسط طبقہ مودی حکومت سے مطمئن ہیں۔ تاہم بھارتی عوام کو مودی حکومت سے زیادہ فوائد نہیں مل سکے۔ آج بھی کروڑوں بھارتی غربت، بیماری اور جہالت سے نبرد آزما ہیں۔

بھارت میں غربت

کچھ عرصہ قبل مشہور بھارتی ادیب، جاوید اختر پاکستان آئے تھے۔ واپس جا کر وہ ایک تقریب میں شریک ہوئے جس کے میزبان بھارتی ادیب چیتن بھگت تھے۔ چیتن بھگت نے اُن سے سوال کیا کہ آج کل پاکستان معاشی مسائل میں گرفتار ہے۔ صورت حال اتنی سنگین ہے کہ آئی ایم ایف بھی اُسے قرض دینے کو تیار نہیں۔ لہٰذا پاکستان کے حالیہ دورے میں آپ کو وہاں غربت نظر آئی؟

جاوید اختر کہنے لگے "بات یہ ہے کہ بھارت کی سڑکوں اور گلیوں میں کھلے عام غربت اور بھوک نظر آتی ہے۔ مگر عجیب بات ہے، پاکستان کی سڑکوں میں مجھے غربت عام دکھائی نہیں دی۔ فقیر بھی کہیں کہیں دکھائی دیے۔"

درج بالا حقیقت سے عیاں ہے کہ بھارت میں غربت عام نظر آتی ہے۔ وجہ یہی کہ حکمران طبقہ اُن کی حالت زار پر کم ہی توجہ دیتا ہے۔ کروڑوں بھارتی صرف ایک یا دو وقت کی روٹی کھا کر جسم و روح کا رشتہ برقرار رکھے ہوئے ہیں۔

مسلمان اذیت میں

مودی حکومت میں سب سے زیادہ تکالیف، دکھ و غم اور پریشانیاں مسلمانوں نے برداشت کی ہیں۔ بھارتی مسلمان اب ہندو معاشرے میں ایک ناپسندیدہ گروہ کی شکل اختیار کر چکے۔ بیشتر ہندو انھیں اپنی کمپنیوں اور دفاتر میں ملازمتیں نہیں دیتے۔ اپنی بستیوں میں پلاٹ یا مکان نہیں لینے دیتے۔ نتیجہ یہ ہے کہ جس طرح میسولینی اور ہٹلر کے ادوار میں اٹلی و جرمنی میں یہودی کی الگ تھلگ بستیاں بن گئی تھیں، اُسی طرح بھارت میں بھی مسلمانوں کے علیحدہ محلے بن چکے۔ اُن محلوں میں بنیادی ضروریاتِ زندگی بھی دستیاب نہیں اور مسلمان بڑی کسمپرسی کی زندگی گزار رہے ہیں۔

آر ایس ایس اور بی جے پی رفتہ رفتہ سبھی بھارتی ریاستوں میں نفوذ کر رہی ہیں۔ ہر جگہ ہندو قوم پرست

مسلمانوں کو نشانہ بناتے ہیں تاکہ فرقہ ورانہ اختلافات اور دشمنی کو ہوا دے کر زیادہ سے زیادہ ہندو اپنی چھتری تلے جمع کر سکیں۔ تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ اگر ہندو قوم پرست عوام کی خواہشات اور اُمنگوں پر پورے نہیں اترے، تو وہ الیکشن ۲۰۲۴ء میں دوبارہ حزبِ اختلاف کو ووٹ دے سکتے ہیں۔

فی الوقت ہندو قوم پرست جس سیاسی ایجنڈے پر عمل پیرا ہیں، وہ برہمن مت، ویدمت، فاشزم، نازی ازم اور سرمایہ داری کا ملغوبہ ہے۔ مگر یہ ایجنڈا بنیادی طور پر ہندو قوم کو فوائد پہنچا رہا ہے۔ جبکہ اقلیتیں ہر لحاظ سے پسماندگی اور غربت کا شکار ہیں۔ کوئی کوئی مسلمان، عیسائی، سکھ یا دلت ہی اپنی صلاحیتوں کے بل بوتے پر بھارتی معاشرے میں اعلیٰ مقام حاصل کر پاتا ہے۔ ورنہ اقلیتوں کے افراد کی اکثریت معمولی و ادنیٰ درجے کی ملازمتیں اور کاروبار کرنے پر مجبور ہے۔

ہندو قوم پرستوں کا عروج

یہ بات یقینی ہے کہ اگر الیکشن ۲۰۲۴ء بھی ہندو قوم پرستوں نے جیت لیے، تو وہ بھارتی آئین کی سیکولر نوعیت ختم کرنے کی بھرپور کوشش کریں گے۔ نریندر مودی کی زیرِ قیادت وہ بھارت کو ہندو راشٹر یہ بنانے پر تلے بیٹھے ہیں۔ کئی صدیوں پرانی اپنی دیرینہ تمنا پوری کرنے کے لیے برہمن قوم پرست یہ سچائی بھی پس پشت ڈال چکے کہ مودی نچلی ذات سے تعلق رکھتا ہے۔ میسولینی اور ہٹلر کے مانند مودی کی جنگجوئی و متشدد پن فطرت نے اُسے بھی ہندو قوم پرستوں میں مانند خدا بنا دیا۔

آر ایس ایس اب بھارت تک محدود نہیں رہی بلکہ وہ برطانیہ، کینیڈا، امریکا، آسٹریلیا اور اُن تمام ممالک میں اپنی شاخیں قائم کر رہی ہے جہاں ہندو بڑی تعداد میں آباد ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ ہندوؤں میں اپنا دائرہ کار اور دائرہ اثر زیادہ سے زیادہ پھیلا لیا جائے۔ گو اس کے پھیلاؤ میں بنیادی کردار مودی ادا کر رہا ہے جسے حالات نے بہرحال ہندو قوم کا غیر معمولی لیڈر بنا دیا۔

اب آنے والا وقت ہی بتائے گا کہ کیا نریندر مودی کی قسمت میں میسولینی اور ہٹلر کی طرح عبرت ناک انجام لکھا ہے یا پھر وہ ہندو قوم پرستی کی تاریخ میں نئے اوتار اور ایک دیوتا کی حیثیت اختیار کر جائے گا۔ یہ بات بہرحال اظہر من الشمس ہے کہ مودی نفرت کا پیغامبر ہے اور اقلیتوں پر اُس کا ظلم و ستم کبھی نہ کبھی رنگ ضرور لا کر رہے گا۔
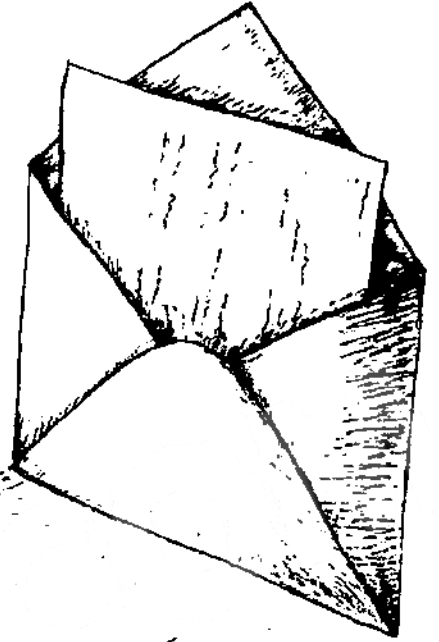
اب خط نہیں آتے!

عید کی مبارک باد دینا جو ماضی میں محبتوں اور جذبوں میں گندھا پورا عمل تھا، اب فقط ایک کِلک کی فارورڈنگ رہ گیا

یادش بخیر ماضی میں جب کہیں دور جانے کے لیے گھر سے نکلتے تو یہ جملہ اکثر سننے کو ملتا:

''جا رہے ہیں، تو خیریت سے آگاہی کے لیے خط لکھتے رہیے گا۔''

صاحبو! یہ گئے دنوں کی بات ہے کہ جب واقفیتِ احوال کے لیے خط ایک اہم ذریعہ تصور کیے جاتے تھے۔ آج جب ایک بڑے مشہور شاعر کے خطوط کا مجموعہ مطالعے کے لیے اٹھایا، تو بے اختیار بیتے لمحات نگاہوں کے سامنے سے گزر گئے۔ جھل مل کرتا ایک دَور حافظے کے نہاں خانے سے نکل کر ہمارے سامنے آ کھڑا ہوا۔ کتاب ہمیں ماضی میں دھکیل کر لے گئی۔ ہم نے بھی اپنی نوجوانی اور جوانی میں بے شمار خطوط لکھے۔ خط نویسی کی مشق باہم پہنچاتے ہوئے ہمیں یاد ہے کہ ہم نے محلے کے تمام نام نہاد وَ سچے عشاق کے لیے خط نویس کا کردار اَدا کیا۔

خطوط ہی پر کیا اکتفا کہ اُس دَور میں ایک چلن عید کارڈ بھیجنے کا بھی تھا۔ کارڈ کے انتخاب سے لے کر اُس میں تحریر کیے جانے والے مضمون تک کے ہر مرحلے پر جو جتن کیے جاتے تھے، وہ بھی جُوئے شیر لانے کے مترادف ہوتا۔ کارڈ خریدنے کے لیے کسی قریبی دوست کو ساتھ لے کر کسی اچھے بُک اسٹال یا گفٹ سنٹر پر جایا جاتا جہاں خصوصی شیلف پر کارڈ مختلف درجہ بندی کے حساب سے لگے ہوتے تھے۔

کچھ تو والدین کو بھیجنے کے لیے ہوتے، تو کچھ دوست احباب کے واسطے مخصوص ہوتے۔ مگر سب سے زیادہ تعداد اور قسمیں اُن کی ہوتیں جو عشاق مہورِ حُسنِ جفاکش کو بھیجتے تھے۔ اُس تلاش میں گھنٹوں کی ریاضت کے بعد کوئی گوہرِ نایاب ہاتھ لگتا جسے دیکھ کر محسوس ہوتا کہ گویا ہمارے لیے ہی شائع کیا گیا ہے۔ بعض تو ایک کے بجائے کئی کئی کارڈ خرید لیتے تھے کہ جانے کون سا پسند آ جائے۔

گھنٹوں بلکہ دنوں کی سوچ بچار کے بعد مضمون کا انتخاب ہوتا، پھر موزوں اشعار کے انتخاب کا مرحلہ آتا۔ غرض کارڈ پر بنی تصویر، اُس پر درج مضمون اور جذبات میں گندھے اشعار

شوق کے دھاگے میں پرو کر مکتوب الیہ کو روانہ کیا جاتا تھا۔

طرفہ یہ کہ اُن میں سے کئی خطوط کی کرشمہ سازی اور عید کارڈ کی فسوں انگیزی سے ہمارا کام ہوا ہو یا نہ ہوا ہو مگر کچھ احباب رشتۂ مناکحت میں ضرور بندھ گئے۔ اب سر پیٹتے ہیں کہ تم سے خط کیوں لکھوایا یا عید کارڈ پر اشعار کیوں تحریر کروائے۔

یارانِ خوش خصال کہتے ہیں کہ کسی سازش کے تحت ہم نے اُن کے خط پر زیادہ پُراثر مضمون لکھے اور کارڈ پر زیادہ معنی خیز اشعار تحریر کیے۔ اب ہم اُن سے کیا کہیں کہ ہم خوش قسمت رہے کہ ہماری اپنی باری پر خط اور کارڈ نویسی کا جادو سر چڑھ کر نہیں بولا۔

جب ہم بغرضِ تعلیم قائدِ اعظم یونیورسٹی اسلام آباد گئے، تو اُس وقت تک خطوط اور کارڈ کا رواج باقی تھا، لہٰذا اُن دو برسوں میں ہمارے پاس بے شمار خطوط اور عید و سالگرہ کے کارڈ موصول ہوئے اور ہم نے بھی اُن کے جوابات دیے۔ وہ سارے کارڈ ہماری پڑھنے والی میز کے ساتھ والی دیوار پر ہمارے تمام عرصۂ تعلیم چسپاں رہے۔ روزانہ اُن پر نظر پڑتی اور ہر سال کرنے والے کی یاد تازہ ہو جاتی۔ وہ دن اب لد گئے کہ ای میل کے بعد سوشل میڈیا نے سب کچھ تبدیل کر کے رکھ دیا۔

پہلے لوگ اگر شہر سے باہر گئے ہوتے، تو احباب رشتے داروں کے خطوط آتے تھے اور اَحوال سے واقفیت ہوتی تھی۔ خط آدھی ملاقات تصور کیے جاتے۔ بڑا انتظار ہوتا کہ دیارِ غیر میں دیارِ یار سے کوئی خط آئے۔ کچھ مہکتے ہوئے لفافے کو اپنی خوشبو سے بھیجنے والے کا رشتہ بنا دیں۔ تحریر سے مانوسیت بھیجنے والے سے گویا کچھ اور قریب لے جاتی تھی۔ مگر اب تو ایسا لگتا ہے کہ دور ہی بدل گیا۔

قلم اور کاغذ کا رشتہ اتنا کمزور پڑ گیا ہے کہ خوف آتا ہے، ٹوٹ ہی نہ جائے۔ محسوس ہوتا ہے کہ مرنے کے بعد نہ تو گھر سے تصویرِ بتاں ہی نکلیں گی اور نہ ہی حسینوں کے خطوط کہ اب سارے خطوط مہ جبینوں کے ہوں یا احباب کے، ہماری ای میل کے اِن باکس میں بند رہتے ہیں جسے کوئی دوسرا بغیر پاس ورڈ کھول نہیں سکتا۔

اب تو وہ رُومانس بھرا وقت گزر گیا۔ ساری کی ساری مہم جوئی ہی ختم ہو گئی جو ایک خط لکھنے اور اُسے کسی خاص ہستی تک پہنچانے میں ہوتی تھی۔ اب فقط سوشل میڈیا کی رسائی چاہیے۔ گوگل، فیس بک، واٹس ایپ، اسنیپ چاٹ اور نہ جانے کیا کیا! نہ مار کا خطرہ، نہ رُسوائی کا ڈر۔ بے چارہ قاصد سرے سے مفقود ہو رہا ہے۔ نئے دور کے شعراء کے لیے تو قاصد اور نامہ بر کے تلازمے ہی غارت ہو گئے۔ اب نہ عشاق کو اپنے محبوب تک خط پہنچانے کے لیے کسی پڑوس کے بچے کی منت سماجت کرنی پڑتی ہے اور نہ ہی ''اُن'' کی کسی سہیلی یا اپنی کزن کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

> ہاتھ سے خط کسی کاغذ پر تحریر نہ کرنے کی وجہ سے یہ گمان ہوتا ہے کہ رشتے مصنوعی سے ہوتے جارہے ہیں

اب تو وہ دَور بھی چلا گیا کہ لوگ جیب میں محبوبہ یا منگیتر کی تصویر رکھا کرتے تھے۔ اب وہ آپ کے سیل فون یا کمپیوٹر میں محفوظ رہتی ہیں۔ جب ذرا گردن جھکائی، دیکھ لی۔ کہنے کو تو وہ زمانے گزر گئے مگر اُن کی کشش اب بھی برقرار ہے۔ کمپیوٹر اور فون کی سیاہ اسکرین میں وہ بات کہاں۔ یہ ساری چیزیں وہ مزا نہیں دیتیں، وہ احساس کہ جو خط کو چُھو کر کسی اور کے لمس کو محسوس کرنے میں ہوتا ہے۔ وہ احساس کہاں کہ اِسے کسی نے خود تحریر کیا ہو گا، اِسے چُھوا ہو گا اور بہت ممکن ہے کہ بھیجنے سے پیشتر چُوما بھی ہو۔ اپنائیت کا احساس ہی مفقود ہے۔

اپنے ہاتھ سے خط کسی کاغذ پر تحریر نہ کرنے کی وجہ سے یہ گمان ہوتا ہے کہ رشتے ناتے کچھ مصنوعی سے ہوتے جا رہے ہیں۔ دائمی تعلق ایک وقتی رشتے (Instant Relation)

میں تبدیل ہو گیا ہے۔ ای میل زیادہ تر سرکاری یا کاروباری معاملات تک محدود ہو رہی ہیں۔ برقی پیغامات بہت مختصر ہو گئے ہیں۔ کلی طور احوالِ واقعی بیان نہیں کر پاتے۔

اگرچہ روزانہ صبح اکثر احباب صبح بخیر یا گڈ مارننگ کے پیغامات بھیجتے ہیں یا تہواروں پر مبارک باد۔ عیدین پر تو گویا پیغامات کا ایک سیلِ رواں ہوتا ہے جو تھمنے میں نہیں آتا۔ عید کارڈ کی جگہ ایک چھوٹی سی تصویر نے لے لی ہے جو ہر کوئی ایک دوسرے کو بھیج رہا ہوتا ہے۔ مگر ہر ایسے پیغام یا تصویر پر ایک تیر کا نشان اور لفظ "Forwarded" گویا اُس میں سے ساری گرم جوشی اور تعلق کی چاشنی کو نچوڑ کر اُسے مصنوعی بنا دیتا ہے۔

ہم ایک روبوٹ کی طرح ایک جانب سے آنے پیغام دوسری جانب بغیر کسی جذبے کی آمیزش کے روانہ کر دیتے ہیں۔ اُسے موصول کرنے والے کسی اور کو بھیج دیتے تھے۔ کو عید کی مبارک باد دینا جو ماضی میں چاہتوں، محبتوں اور جذبوں میں گندھا ہوا ایک پورا عمل تھا، اب فقط ایک کلک فارورڈنگ رہ گیا ہے۔ سیاہ اسکرین کی حکومت احساس مروت کو کچل کر ایک حقیقی تعلق کو مجازی تعلق میں تبدیل کر رہی ہے۔ یہ سیاہ اسکرین ایک ایسا آئینہ خانہ ہے جہاں ہر چہرہ ایک عکس ہے اور ہر جذبہ صرف ایک ایموجی (emoji)۔

(مصنف رحیم یار خان زون کے ٹیکس کمشنر ہیں۔)

◆◆◆

امرا کو حوصلہ

سلاطینِ گجرات میں سلطان احمد شاہ ایک نامی بادشاہ گزرا ہے۔ اُس کے عدل و انصاف کا یہ واقعہ بے حد مشہور ہے کہ اُس کے داماد نے جوانی و مستی کے خمار اور حکومت کے غرور میں ایک آدمی کا ناحق خون کر دیا۔ سلطان کو خبر ہوئی، تو اُس نے گرفتار کر کے قاضی کے پاس بھیجا۔ قاضی نے مقتول کا خون بہا وارث کو راضی کر کے بائیس اشرفیاں تجویز کیں اور مسل بادشاہ کے پاس بھجوا دی۔ مگر بادشاہ نے کہا:

''بے شک مقتول کا وارث راضی ہو گیا ہے، لیکن اس قسم کے کمزور فیصلوں سے بدشعار امیروں کو حوصلہ ہو جائے گا۔ جسے چاہیں گے، جان سے مار کر چند اشرفیاں خون بہا دے دیا کریں گے، اس لیے اس مقدمے میں خون بہا کے بجائے قصاص لینا چاہیے۔''

چنانچہ اپنے داماد کو پھانسی دے دی اور حکم دیا کہ دولت مند قرابت داروں کی عبرت کے لیے لاش ایک دن رات تک چوک میں لٹکتی رہے۔

بھول جائیں گے

نپولین نے جب اٹلی یا آسٹریا فتح کیا، تو اس کے فوراً بعد پھر فوجوں کو تیاری کا حکم دے دیا۔ اس پر کسی جنرل نے کہا ''ابھی تو لڑائی ختم ہوئی ہے، آپ نے پھر تیاری کا حکم دے دیا۔''

نپولین نے جواب دیا ''اگر تھوڑی دیر ہو جائے گی، تو لوگ، نپولین کو بھول جائیں گے۔''

زمانے کی رفتار کا واقعی یہی حال ہے کہ جو شخص میدان میں ہے اور مسلسل اپنے آپ کو منوائے جا رہا ہے، اُسے جانا جاتا ہے اور جو لوگ ذرا ہٹ جاتے ہیں، وہ بڑی آسانی سے بھلا دیے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی

مِل مِل کے ململ ہوئے

عیدین کی دیرینہ روایت پر ایک شگفتہ و مزاحیہ آپ بیتی

اِس سال یار لوگوں نے عید مِل مِل کر ہمیں ململ بنا دیا ہے۔ ملاکھڑا تو سندھ کا ایک مقبول کھیل ہے ہی لیکن لگتا ہے ''معانقہ'' بھی عنقریب اسپورٹس کی فہرست میں شامل کر لیا جائے گا۔ یہ ایک قومی کھیل ہوگا، اِس لیے کہ عیدین کے موقع پر پوری قوم اِسے کھیلتی اور مسلسل کئی دن تک کھیلتی رہتی ہے۔

اگر اِسے اسپورٹس کا درجہ حاصل ہو گیا، تو اِس کے کلب بھی قائم ہوں گے جہاں معانقے کے پسلی توڑ داؤ پیچ اور مدِ مقابل کے تابڑ توڑ حملوں سے بچاؤ کی تربیت دی جائے گی۔ ہم یہ چاہیں گے کہ ایسا جلد ہو، تاکہ سب سے پہلے ہم کسی ''معانقہ کلب'' میں داخلہ لیں۔ اِس لیے کہ اپنی موجودہ [illegible] قابل نہیں رہے۔

اوّل تو نہ جانے یہ کیوں فرض کر لیا گیا ہے کہ عید معانقے میں جتنا سامنے والے پر تشدد کرو گے، اتنا ہی اُس کے دل میں گھر کرو گے۔ گویا اُس کی خستگی آپ کی وارفتگی کی دلیل ٹھہری اور اِس رجحان میں تشویش ناک اضافہ ہو رہا ہے۔ اب اِسے اتفاق کہیے یا قسمت کی ستم ظریفی کہ ہمارے ملنے والوں میں بڑے بڑے مشاق ''عید ملیچی'' شامل ہیں۔ اُن میں دل گیر صاحب جیسے بے ضرر ہیں اور خان صاحب جیسے بے دھڑک بھی۔

عموماً عیدگاہ سے واپسی پر ہماری پہلی مڈبھیڑ دل گیر صاحب سے ہوتی ہے، سو اِس سال بھی ہوئی۔ ہمارے نقطۂ نظر سے وہ نہایت پسندیدہ جسامت کے مالک ہیں..... یعنی ہم سے آدھے ہیں۔ اُن کا عید ملنے کا انداز بڑا معصومانہ ہے۔ محض واجبی طور پر ایک بار کندھے سے کندھا چھو کر رسم ادا کر دی اور بس۔ دراصل یہ سندھی اسٹائل کا معانقہ ہے۔ بہت پُرامن اور باوقار۔ اِس معانقے کے بعد دونوں پارٹیاں محبت سے مسکراتی ہیں۔ نہ تو منمناتی اور نہ ایک دوسرے کو کوستی ہیں جیسا کہ دوسرے انداز کے معانقوں میں ہوتا ہے جن کا ذکر آگے آرہا ہے۔

دل گیر صاحب کو خوشی خوشی بھگتا کر ہم گھر میں داخل ہوئے، تو اچانک دہشت طاری ہو گئی..... جی ہاں، بڑے برادرِ نسبتی صاحب ڈرائنگ روم میں گھات لگائے بیٹھے تھے۔ وہ ایک پیشہ ور باڈی بلڈر ہیں اور اپنی تن سازی کا مظاہرہ کرنے سال میں دو مرتبہ غریب خانے کو رونق بخشتے ہیں جب وہ عید ملنے کے بہانے اپنی بہن کے بدلے چکاتے ہیں۔

ہم نے اُنھیں دیکھا، تو سر جھکا کر بچ نکلنے کی تدبیر کی لیکن وہ پشت کی طرف سے حملہ آور ہوئے۔ جُوں ہی ہم اُن کی دسترس میں آئے، اُنھوں نے اپنے آہنی شکنجے میں جکڑ لیا اور تین بار ضربِ شدید کا ارتکاب کیا۔ ہر بار اَدھ موا اُور ہماری آہ وفغاں نظرانداز کر کے وہ فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ ہمیں گھورتے جیسے کہہ رہے ہوں ''اور کرو گے بے زبانوں پر ظلم؟'' ہم اِس خیال سے خاموش رہے کہ ؏

ظلم پھر ظلم ہے بڑھتا ہے، تو مٹ جاتا ہے

یہ ''مجرمانہ معانقے'' کی مثال تھی۔

ہمارا ملیدہ بنا کر اُنھوں نے ہمیں شیر خوار بچے کی طرح صوفے پر پٹخ دیا اور خود شیر خرمے پر ہاتھ صاف کرنے چلے گئے۔ بدقتِ تمام چند سانسیں لی ہوں گی کہ دفتر کے ایک رفیقِ کار آگئے۔ حسبِ روایت اُنھوں نے معانقے کے لیے ہاتھ بڑھائے، تو ہم نے اُن پر واضح کیا کہ ہم ابھی پہلے حملے سے پوری طرح جانبر نہیں ہوئے، لہٰذا وہ مصافحے پر قناعت کر کے عنداللہ ماجور ہو جائیں، تاہم اُنھوں نے ہماری درخواست سرسری سماعت کے بعد یہ کہہ کر مسترد کر دی کہ ؏

رسمِ دنیا بھی ہے، موقع بھی ہے، دستور بھی ہے

اُس وقت ہمیں اُن سے زیادہ غصہ اُس شاعر پر آیا جس نے اپنے محبوب کو گلے لگانے کا یہ بہانہ تراشا اور ہم جیسے ہزاروں کو مصیبت میں مبتلا کر دیا۔

ہمارے ساتھی نے نہایت شائستگی کے ساتھ ہمیں سینے سے لگایا۔ چند سیکنڈ تک اُسی طرح ساکت پوزیشن میں رہے۔ ہماری زبان سے اُن کے لیے کلمۂ خیر نکلا لیکن اُنھوں نے دفعتاً اپنے بازوؤں کی مدد سے ہمارے سینے کو دھونکنا شروع کر دیا اور کافی دیر تک دھونکتے رہے۔ اُس وقت تکلیف میں ہوش نہیں تھا کہ یہ کیا کر رہے ہیں مگر بعد میں احساس ہوا کہ موصوف فلم اسٹار نغمہ سے متاثر تھے جنھوں نے ماضی کی ایک پنجابی فلم میں اپنے ہیرو کے ساتھ کچھ ایسا ہی سلوک کیا تھا۔ اِسے ''ظالمانہ معانقہ'' کہنا چاہیے۔ یہ ہمارے لیے 'مرے پہ سو درّے' ثابت ہوا۔

> دوسرے لوگ سینہ بہ سینہ عید ملتے ہیں، سیٹھ جی (مجبوراً) ''پیٹ بہ پیٹ'' ملتے ہیں

اُن سے بچ بچا کر ہم زیرِ زمین چلے گئے..... یعنی تہہ خانہ نشین ہو گئے۔ خود کو تازہ ہوا سے محروم کر کے ہم نے گھر والوں کو سختی سے تاکید کر دی کہ دوستوں کو ہماری ہوا بھی نہ لگے۔ وہاں تمام دن سینے پر بام رگڑتے اور دردرفع کرنے والی گولیاں نگلتے گزرا۔ رات گئے اُس خود ساختہ قیدِ تنہائی سے باہر آئے۔ دوسرے دن صبح ناشتے کی تیاری کر رہے تھے کہ ایک بڑے سیٹھ صاحب تشریف لے آئے جن کا تعلق خوجہ برادری سے ہے اور خاصے چربیلے تن و توش کے مالک ہیں۔

دل گیر صاحب کے بعد یہ دوسرے شخص تھے جن سے عید مل کر کچھ راحت نصیب ہوئی۔ دوسرے لوگ سینہ بہ سینہ عید ملتے ہیں، سیٹھ جی (مجبوراً) ''پیٹ بہ پیٹ'' ملتے ہیں، بڑے ہی منفرد انداز میں۔ مجال ہے جو گردن میں ذرا بھی خم آ جائے۔ چنانچہ وہ اپنی جھولتی ہوئی توند کے ساتھ آگے بڑھے، اپنے دونوں ہاتھ ہمارے کندھے پر رکھے اور پیٹ سے پیٹ کو ملا کر دو تین بار دائیں بائیں رگڑ دیا۔ جسم میں تکلیف کے بجائے تھوڑی سی گدگدی ہوئی۔ ہم سوچ ہی رہے تھے کہ مزید کوئی کارروائی ہو گی کہ سیٹھ جی نے مصافحہ کر کے اجازت طلب کر لی۔ جی چاہا بڑھ کر اُن کی بلائیں لے لیں لیکن وہ چشم زدن میں باہر تھے۔ اُن کا یہ ''عاجلانہ معانقہ'' ہمیں بہت بھلا لگا۔

دن اچھا خاصا گزر رہا تھا کہ دوپہر کے قریب چودھری صاحب آن دھمکے۔ وہ ہمارے بچپن کے دوست ہیں۔ ڈیل ڈول اور قد کاٹھ میں ہم سے ڈبل ہیں، اسی لیے ہم نے اُنھیں اپنی سلامتی کے لیے ہمیشہ خطرہ سمجھا۔ چودھری صاحب عید ملنے کے ارادے سے بڑھے لیکن ہم نے اُن سے عرض کیا ''چودھری صاحب! عید تو باسی ہو چکی ہے۔''

بولے ''یار! جب اپنے سے کسی کمزور کو دیکھتا ہوں، تو پھر تازہ ہو جاتی ہے۔'' اِس سے پہلے کہ ہم کچھ مزید تاویل پیش کرتے، ہم نے خود کو اُن کے سینے سے چمٹا ہوا پایا۔ کسی قسم کی مزاحمت کی گنجائش نہ تھی، لہٰذا ہم نے ذکر اذکار کا سہارا لیا۔

کچھ دیر یونہی چمٹائے رکھنے کے بعد اُنھوں نے پوری قوت کے ساتھ ملاکھڑے کے پہلوان کی طرح ہمیں زمین سے اوپر اٹھا لیا۔ ہمیں یوں محسوس ہوا جیسے دنیا ہی سے اٹھا لیا گیا ہے۔ اُدھر وہ زبانِ حال سے کہہ رہے تھے ع

مار دیا جائے کہ چھوڑ دیا جائے

ہم [illegible] کے رحم [illegible] پر

تھے کہ دیکھیے واپس زمین پر ڈھیر کرتے یا کہیں اِدھر اُدھر پھینک دیتے ہیں۔ تاہم اُنھوں نے ہمیں بحفاظت فرش پر لینڈ کر دیا۔ اِس ''جارحانہ معانقے'' کے بعد دو چار لطیفے سنا کر چودھری صاحب رخصت ہوئے۔

شام کے لگ بھگ ایک اور دوست، خان صاحب تشریف لائے۔ وہ سیمنٹ بجری کا ڈپو چلاتے ہیں اور شاید اُسی کے زیرِ اثر اُن کے جسم میں کرختگی پیدا ہو گئی ہے۔ جوں ہی اُنھوں نے ہمیں اپنے سینے سے لگایا یوں معلوم ہوا جیسے کسی پتھر کے مجسمے سے جا ٹکرائے ہوں۔ پھر ہر چوٹ پر پسلیاں چیخ کر رہ گئیں۔ اِس ''سنگدلانہ معانقے'' کے بعد ہم باکسنگ کے گرے ہوئے کھلاڑی کے۔ سدکا وَننگ پر آ گئے اور کیفیت یہ ہو گئی کہ بقول شاعر ؎

ٹوٹتی، چیختی، چٹختی ہیں
ہڈیاں پسلیاں بے چاروں کی
روزہ خوروں سے عید ملتے ہیں
شامت آئی ہے روزے داروں کی

اب ہمارے پاس اپنے عزیزوں، دوستوں کی محبت کے عذاب سے بچنے کا ایک ہی راستہ رہ گیا تھا..... کہ گھر کو خیرباد کہہ دیا جائے۔ چنانچہ ہم پہلے عارضی طور پر ایک ہوٹل میں منتقل ہوئے اور پھر علاج کے لیے اسپتال میں داخل ہونا پڑا۔

معانقہ اسپورٹس میں شامل کر لیا گیا، تو ان شاء اللہ خوب تیاری کر کے آئندہ سال اُس کے چیمپئن اور دوستوں کے لیے پہلے کی طرح نوالہ تر ثابت نہ ہوں گے۔ اگر ایسا ہوا، تو اس مرتبہ گھر چھوٹا ہے، ڈر ہے اگلی مرتبہ ہم اِس دنیا سے اُس دنیا میں منتقل نہ ہو جائیں اور ہمارے دوست احباب کہتے رہ جائیں کہ میاں ع

گلی ہم نے کہی تھی تم تو دنیا چھوڑے جاتے ہو

محمد سعید شیخ

زیرِ دام

ایک آدرشی کا ناقابلِ فراموش قصّہ، زندگی کے تلخ حقائق نے اُسے دنیا کا حقیقی چہرہ دِکھا دیا

نئے افسر کو علاقے میں آئے کئی ہفتے ہو گئے تھے۔ غرض مند اور ضرورت مند ہر طرف ٹوہ لیے پھر رہے تھے، سونگھ رہے تھے۔ کچھ تو ایک آدھ اُس جگہ بھی گئے تھے جہاں صاحب پہلے رہ کر آیا تھا۔ کوئی حوصلہ افزا خبر نہیں مل رہی تھی۔ کئی ایک صاحب کے نائب قاصد، چوکیدار اور مالی سے بھی مل چکے تھے۔ اُن کی مایوسی بڑھتی جا رہی تھی۔ صاحب کے ملازم اپنی جگہ پریشان پھر رہے تھے۔ اُن کے منہ لٹکنے لگ رہے تھے۔ کسی کو اپنے کام میں دلچسپی نہیں رہی تھی۔

نائب قاصد دفتر سے سیدھا گھر جاتا اور بازو آنکھوں پر رکھ کر پڑا رہتا۔ کوئی اب اُسے پوچھنے نہیں آتا تھا۔ مالی کی عدم دلچسپی سے کئی خوبصورت پودے سوکھنے لگے تھے۔ چوکیدار اَب رات کو بہت کم کھانستا تھا۔ مشہور ہو چکا تھا کہ صاحب بہت غصّے والا ہے۔ کسی کی بات نہیں سنتا اور نہ ہی کسی کو ''سلام'' کے لیے دفتر میں گھسنے دیتا ہے۔ مالی، نائب قاصد اور چوکیدار جب بھی اکٹھے بیٹھتے، تو پہلے وقت کی باتیں کر کے ٹھنڈی آہیں بھرتے۔

اتنی بڑی کوٹھی میں صاحب اکیلا رہتا تھا۔ ضروریات اتنی محدود کہ نہ ہونے کے برابر تھیں۔ یہ سوچ کر لوگ حیران ہوتے، کیسا افسر ہے۔ لگتا ہے کسی اونچے خاندان کا نہیں۔ رات گئے صاحب موسیقی سنتا، سگار پیتا یا پھر کتابیں پڑھتا تھا۔

''عجیب واہیات شوق ہیں بھئی تمہارے صاحب کے!'' ایک ملاقاتی نے ایک دن نائب قاصد سے کہا اور نائب قاصد یوں شرمندہ ہونے لگا جیسے یہ سب اُس [illegible] کا کیا دھرا ہو۔

''کیا بات تھی جی پہلے صاب کی، نرا آدمی تھا نر۔''

دوسرے ضرورت مند نے بھی اپنا غصہ نکالا۔

وہ بھی کئی دن سے دفتر کے چکر لگا رہا تھا۔ اُسے ابھی تک کوئی ذرک نہیں ملی تھی۔ وہ شہر میں کچھ زمین خریدنا چاہتا تھا۔ نیچے سے حسب منشا رپورٹیں تیار ہو چکی تھیں۔ آبادکاری کے کلرک نے بھی حمایتی نوٹ لکھ دیا تھا مگر فائل پیش کرنے سے ڈرتا تھا۔ کاغذوں میں ایک نکتہ ایسا تھا جو اگر صاحب کی نگاہ میں آ گیا، تو پھر کسی کی خیر نہیں تھی۔ یہی ذرا کاوٹ بن کر کھڑا تھا راہ میں۔

دوسرے آدمی نے صاحب کے پی اے کی آنکھوں میں دیکھا۔ اُن میں مایوسی تھی اور پی اے کے منہ پر ناپسندیدگی کی چھاپ صاف نظر آ رہی تھی۔

کچھ لوگوں نے تو صاحب کا شجرہ بھی کھنگال نکالا تھا۔ صاحب ایک ریٹائرڈ سکول ماسٹر کا لڑکا تھا جو اَب گاؤں میں تھوڑی سی پنشن اور زمین پر گزارا کر رہا تھا۔ صاحب کے رشتے داروں نے اُس کا نام سن کر عجیب منہ بنائے۔

''چھوڑو جی! باپ نے ساری عمر منڈے پڑھائے، اب وعظ کرتا پھرتا ہے۔ کہتا ہے رشوت اور سفارش میں کوئی فرق نہیں۔ یہ باپ بیٹا دونوں ہی کسی دوسری دنیا کے لوگ ہیں۔ نہ رشتے داروں کی پروا، نہ دوستوں کی ضرورت۔ برادری کی ضرورت پڑی، تو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہوگا۔''

''نا! کوئی پوچھے اگر کسی کا کام نہیں کرنا تھا، تو پھر بیٹے کو افسر بنانے کی بھلا کیا ضرورت تھی؟ کیوں نہ بنا دیا اُسے بھی سکول ماسٹر؟'' ایک دوسرے عزیز نے غصہ نکالا۔

''چھوٹے ظرف میں اللہ نے زیادہ ڈال دیا ہے جی! بس اور کیا بات کریں۔ برادری کو بھیج لگا دی۔'' صاحب کے دور کے چچا نے حقے کی نے لبوں میں رکھتے ہوئے کہا۔

وہ چند دن پہلے کسی پٹواری کی سفارش لے کر گیا تھا صاحب کے پاس مگر صاحب نے اُس کی بات سننے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ بغیر چائے کا گھونٹ لیے وہاں سے واپس گیا۔ سارے گاؤں برادری میں آ کر اُس نے جب صاحب کے رویے کے متعلق بتایا، تو ہر آدمی نے صاحب پر جی توفیق نفرتیں بھیجی تھیں۔

یہ باتیں سن کر ہر آدمی نے سوچا تھا کہ صاحب یا تو کسی اچھے خاندان سے نہ تھا یا پھر بہت ہوشیار تھا کہ کسی کو بھی اپنے طریقۂ واردات کی خبر نہیں ہونے دی تھی۔ لوگ ابھی تک اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ وہ یہ ماننے کو تیار ہی نہ تھے کہ صاحب وہ سب کچھ تھا جو نظر آتا ہے۔ آخر اُسے اِسی دنیا میں رہنا ہے۔ انسان ہے اور ہر انسان کی کچھ ضرورتیں، کچھ مجبوریاں تو لازماً ہوتی ہیں۔

صاحب کو کسی سے غیر رسمی انداز میں ملتے جلتے بھی نہ دیکھا گیا تھا۔ نہ ہی صاحب کا کہیں آنا جانا بیان ہوا تھا۔ غرض مند اور ضرورت مند پریشان تھے، بے چین تھے کہ اب اُن کے کام کیسے نکلیں گے۔

ایک روز صاحب کے دفتر کے باہر کئی عزت دار چودھری لوگ صاحب سے ملاقات کے جتن کر رہے تھے۔ ایک دو نے تو نائب قاصد کے کان میں کچھ کہا مگر اُس نے برا سا منہ بنایا اور نفی میں سر ہلا دیا۔

''اِس طرح تو علاقے کے باعزت لوگوں کا گزارہ مشکل ہوگا، ہمیں اوپر بات کرنا پڑے گی یا پھر کوئی اور راہ پائے کرنا گا۔ پہلے تو اِس دفتر میں کبھی ایسا نہیں ہوا۔'' ایک بڑے زمیندار نے صاحب کے پی اے کی طرف منہ کر کے ذرا اُونچی آواز سے کہا جسے بہت سے دوسرے آدمیوں نے بھی سنا۔

''بالکل ٹھیک کہا آپ نے ملک جی! کہتے ہیں صاحب صرف جائز کام والوں کو بلاتا ہے، تو ہم بھی تو عزت دار ہیں۔'' ایک مونچھوں والے آدمی نے کہا جس کے سر پر بڑی پگڑی تھی اور اُس نے لٹھے کے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔

اچانک اُن سب کے سامنے ایک ملاقاتی بزرگ لاٹھی لیے چہرہ لیے وہاں آئے۔ اُنھوں نے اندر ایک کارڈ بھجوا دیا۔ وہاں کھڑے لوگوں کی حیرانی کی انتہا نہ رہی۔ ملاقاتی کو فوراً اندر بلوایا گیا۔ سب ایک دوسرے کی طرف استفہامیہ نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ اُس بزرگ نے فاتحانہ نظر اپنے اردگرد کھڑے لوگوں پر ڈالی اور مسکراتے ہوئے اندر چلے گئے۔ اُس کی بغل میں لفافے میں بند کوئی چیز تھی جسے سب لوگوں نے دیکھا اور وہ ایک دوسرے کے کان کے نزدیک منہ لے جا کر کھسر پھسر کرنے لگے۔

صاحب نے اُٹھ کر ملاقاتی کا استقبال کیا اور کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔ چھوٹتے ہی اُنھوں نے پوچھا:

''آپ کب ملے تھے میرے استاد محمد دین صاحب سے، وہ کیسے ہیں؟'' افسر کے لہجے میں رسمی انداز غالب تھا۔

''کوئی ہفتہ قبل مَیں اُس گاؤں گیا تھا۔ وہاں میری بیٹی شادی شدہ ہے۔ ایک محفل میں ماسٹر محمد دین موجود تھے۔ اب تو وہ بہت بوڑھے ہو گئے ہیں۔ برسبیلِ تذکرہ آپ کا نام آ گیا۔ آپ کی لیاقت اور قابلیت کی اُنھوں نے اتنی تعریف کی کہ میرا اِشتیاق بڑھ گیا۔''

''آپ کے لیے ٹھنڈا منگواؤں یا چائے؟''

صاحب نے اِس سے پہلے کسی کو دفتر میں چائے وغیرہ نہیں پلوائی تھی۔ اِس لیے جب اندر سے چائے کا آرڈر آیا، تو سارا سٹاف یوں چونکا جیسے آج سورج مشرق کے بجائے مغرب سے نکل آیا ہو۔ سب لوگ ہمہ تن انتظار بن کر اُس ملاقاتی کے باہر آنے کی راہ تکنے لگے جس کے لیے آج چائے اور بسکٹ کا انتظام ہوا تھا۔

''اور کچھ میرے استاد نے میرے لیے کوئی پیغام دیا؟''

صاحب نے خود چائے کا کپ بنا کر ملاقاتی کو پیش کرتے ہوئے کہا۔

''بس جی! جتنی دیر مَیں وہاں رہا، آپ ہی کی باتیں ہوتی رہیں۔ ماسٹر صاحب نے بتایا کہ آپ تو اُن کی طرح اور اُن کے باپ کی طرح استاد بننا چاہتے تھے۔''

''جی ہاں! عجیب اتفاق ہے۔ انسان بعض اوقات وہ کچھ بن جاتا ہے جو دوسرے اُسے دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہمارا اِختیار کتنا زیادہ سماجی اور محدود ہو جاتا ہے یہاں آ کر۔'' یہ کہتے ہوئے صاحب اُس وقت کا تصور کرنے لگا جب وہ میٹرک کے امتحان میں اوّل آیا تھا۔ اخباری رپورٹر نے جب اُس سے مستقبل کے متعلق پوچھا تھا، تو اُس نے جھٹ جواب دیا تھا ''مَیں استاد بننا چاہتا ہوں۔''

پاس بیٹھے ہیڈ ماسٹر صاحب نے فوراً تصحیح کرتے ہوئے کہا تھا ''نہیں جی! شاہد سول افسر بنے گا۔ ماسٹر بن کر یہ کیا کرے گا۔'' اور وہ خاموشی سے مسکرا دیا تھا۔ یہ سوچتے ہوئے اُس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اُس کا تناؤ کم ہونے لگا اور اُس نے پُرسکون ہو کر اپنی پشت کرسی کی پشت سے لگا دی اور چائے کا کپ اٹھا کر لبوں سے لگا لیا۔ آج اُسے چائے بہت اچھی لگی۔

عجیب اتفاق ہے۔ انسان بعض اوقات
وہ کچھ بن جاتا ہے جو دوسرے اُسے
دیکھنا چاہتے ہیں

''ماسٹر محمد دین ہی سے آپ کے لکھنے پڑھنے کے شوق کا پتا چلا تھا۔'' ملاقاتی نے چائے کا ایک بڑا سا گھونٹ لیا۔ اُسے لگا اُس نے اِس سے قبل اتنی عمدہ چائے نہیں پی تھی۔ دفتر بڑا پُرسکون تھا۔ فرش پر گہرے رنگ کا قالین تھا۔ اُس سے میچ کرتے گہرے رنگ کے بھاری پردے کھڑکیوں پر لٹکے تھے۔ صاحب کی کرسی کے پیچھے دیوار پر قائدِاعظم کا خوبصورت پورٹریٹ تھا۔ بائیں ہاتھ دیوار پر علاقے کا نقشہ اور دائیں ہاتھ کھڑکی اور دروازے کے درمیان ایک خوبصورت الیکٹرانک کلاک لگا تھا جس کی سیکنڈ کی سوئی ایک

سیکنڈ سے اچھل کر دوسرے سے اگلے کی جانب بڑھ رہی تھی۔ بڑا سا خوبصورت میز، سبز رنگ کے بلیزرے ڈھکا تھا اور اُوپر میز کی سائز کا سموکی شیشہ پڑا تھا۔ قلم دان، گھڑی اور کاغذوں کا خوبصورت سٹینڈ بڑی نفاست سے رکھا تھا۔ دفتر میں ایئر فریشنر کی ٹھنڈی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔

"جی ہاں! سکول میں محمد دین صاحب مجھے انگریزی اور اُردو پڑھاتے تھے۔ اُنھیں عربی اور فارسی سے بھی مَس تھا۔ فارسی کے سینکڑوں اشعار اُنھیں ازبر تھے اور گفتگو میں اکثر استعمال کرتے۔ اُردو اَدب اور انگریزی کے تو وہ ماسٹر تھے۔ ادب کی میری شناسائی تو اُنھی کی مرہونِ منت ہے۔" صاحب نے یہ کہتے ہوئے خوبصورت پیکنگ میں لپٹا سگار کھول کر سلگا لیا۔ سگار کی کڑوی کسیلی بُو دفتر میں پھیل گئی۔ دھوئیں میں نشہ تھا۔ صاحب کے ساتھ ساتھ ملاقاتی نے بھی اُس کا ذائقہ محسوس کیا۔

صاحب نے چائے کے گھونٹ کے ساتھ سگار کا لمبا کش لیا، تو یادیں برسات کے بادلوں کی طرح امڈنے لگیں۔

ماسٹر محمد دین سے اُس نے نہ صرف سکول بلکہ کالج کے دنوں میں بھی ادب پڑھا تھا۔ ایم اے انگلش تو اُس نے یونیورسٹی سے کیا تھا۔ مگر ادب پر خاص طور پر شیکسپیئر اور جان ملٹن کے مضامین پر جو عبور ماسٹر صاحب کو تھا، وہ کیا کسی پروفیسر کے حصے میں آیا ہوگا۔ ماسٹر صاحب اُن میں کُھب کر پڑھاتے تھے اور اُن کے وہ اَیسے معنی نکالتے جیسے سمندر کی تہہ سے موتی۔

ماسٹر صاحب پرانے وقتوں کے بی اے تھے۔ اُنھوں نے پرائیویٹ امیدوار کی حیثیت سے ایم اے اردو، ایم اے فارسی اور پھر ایم اے انگلش کیا تھا۔ ادب کو اُنھوں نے یوں سمجھا تھا جیسے بڑ کے نیچے آلتی پالتی مار کر صدیوں کے ریاض سے گیان حاصل کیا جاتا ہے۔ پریم چند، ڈپٹی نذیر احمد، محمد حسین آزاد اور اَبوالکلام آزاد کی تحریریں اُن کے ذہن کا اثاثہ تھیں۔ غالب کی غزلیں وہ چلتے پھرتے گنگنایا کرتے۔ گھر سے علیحدہ اُن کی بیٹھک تھی۔ وہ تہہ بند اور خاشے کا ڈھیلا ڈھالا کرتا پہنتے۔ چارپائی پر بڑا سا گول تکیہ لگا کر بیٹھتے جس کے ساتھ ایک صف بچھی ہوتی تھی جہاں اُن سے سبق لینے والے لڑکے لڑکیاں آ کر پڑھتے۔ اکثر لڑکے اور لڑکیاں جو بی اے کے کسی مضمون میں فیل ہو جاتے، وہ ماسٹر صاحب کے پاس لگاتے تھے اور اِمتحان پاس کر جاتے۔

صاحب نے موج در موج یادوں سے کھیلتے ہوئے سوچا وہ کس طرح ایک ودھیارتی کی طرح ماسٹر صاحب سے ادب پڑھا کرتا تھا۔

ماسٹر صاحب نے جب اُسے غبارِ خاطر اور دیوانِ غالب کے کچھ حصے تشریح کے ساتھ پڑھائے تھے، تو وہ گہرے تحیر میں ڈوب گیا۔ اُسے کیٹس کی وہ نظم بے تحاشا یاد آئی تھی جس میں چیپ مین کے اُس تحیر کا ذکر تھا جو اُسے ہومر کی شاعری کے ترجمے کو پڑھ کر ہوا تھا۔

جب وہ مقابلے کے امتحان میں پاس ہوا تھا، تو ماسٹر صاحب نے اُسے عمر خیام کی رباعیات کا انگلش منظوم ترجمہ بھیجا تھا۔ اُس میں عبدالرحمٰن چغتائی کے خوبصورت مرقعے شامل تھے۔ وہ کتنے ہی دن صبح شام ایک ایک رباعی، ایک ایک کپلٹ کو پڑھتا تھا اور لطف اٹھاتا۔ اُن کا لمس اور نشہ آج بھی اُسے یاد آ رہا تھا۔

یہ سوچتے ہوئے وہ بہت نارمل، شانت اور پُرسکون محسوس کر رہا تھا۔ اُس سے قبل اُس نے دفتر میں خود کو کبھی اتنا ہلکا پھلکا محسوس نہیں کیا تھا۔ عجیب بات تھی اِس دوران کوئی ٹیلی فون کال بھی اِس ملاقات میں مخل نہ ہوئی تھی۔

ملاقاتی نے صاحب کی حالت سے محظوظ ہوتے ہوئے اپنے گھٹنوں پر پڑا لفافہ کھولا اور ایک خوبصورت گیٹ اپ والی کتاب صاحب کے سامنے رکھ دی۔

"آپ کے ادبی شوق کا سن کر مَیں یہ آپ کی خدمت میں لایا ہوں۔" نیلی خوبصورت جلد پر سنہرے ابھرے حروف کی روشن پیشانی بنی تھی۔ صاحب کا دل اُس کی طرف ہمکنے لگا۔ اُس نے اضطراری کیفیت میں اُسے کھولا۔ گلیزڈ پیپر کا ملائم لمس اُس کی پوروں کے ذریعے دل میں اترنے لگا۔ عربی زبان کا لحنِ داؤدی، موسیقیت اور شعریت کی انتہا خوبصورت انگلش ترجمے میں اُس کے سامنے تھی۔ اُس نے اُس کی بہت تعریف سنی تھی مگر خریدنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔

اُس نے جلد کو اٹھا کر آنکھوں سے لگایا۔ لبوں سے چوما۔

"مَیں اِس کے لیے آپ کا بہت ممنون ہوں۔"

ملاقاتی نے پیچھے کی طرف پھیل کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگا دی اور دائیں ٹانگ پر بائیں ٹانگ رکھ کر ہلانے لگا۔

صاحب نے کلائی پر بندھی گھڑی دیکھی اور بولا:

"آپ کے کسی کام آؤں، میری خوش قسمتی ہوگی۔"

"بس جی آپ تو نئے نئے آئے ہیں۔ آہستہ آہستہ جان جائیں گے۔ ہمارے دیہات میں پارٹی بازی اور مقدمے بازی کا بڑا رجحان ہے۔ لوگ خواہ مخواہ چھوٹی سی بات کو اَپنے وقار اُور عزت کا مسئلہ بنا لیتے اور شرفا کو بھی اُس میں ملوث کر دیتے ہیں۔ مَیں علاقے کا باعزت کھاتا پیتا زمین دار ہوں۔ کل کلاں کو اگر کوئی بات میرے خلاف ہو، تو اُسے سنبھال لیجیے گا۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔"

یہ کہتے ہوئے ملاقاتی نے اٹھ کر رخصت چاہی۔ صاحب نے بہت عزت سے اُسے رخصت کیا۔

ملاقاتی جب باہر نکلا، تو لوگوں نے اُسے یوں گھیر لیا جیسے وہ اَرضِ مقدس سے لوٹا ہو۔ وہ اُس سے صاحب کے متعلق پوچھنا چاہتے تھے۔ ملاقاتی کے چہرے پر فتح مندی کے آثار تھے۔ اُس نے بڑے فخر سے دائیں بائیں دیکھا۔ وہ جب جا رہا تھا، تو دو تین آدمی اُس کے ساتھ ہو لیے۔

ملاقاتی کے جانے کے بعد صاحب نے ایک مرتبہ پھر اُس تحفے کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ ملائم کاغذ کا لمس، عبارت، رنگین ترجمے اور حواشی کی خوبصورتی اُس کے قلب ونظر پر ہلکی ہلکی دستک دینے لگی تھی۔ وہ اُس وقت کے تصور سے لطف اندوز ہو رہا تھا جب فارغ وقت میں اُن خوشبوؤں اور رنگوں کی دنیا میں بھیگ سکے گا۔ پھر اُس نے کتاب کو شیشے پر دائیں کونے پر رکھا جہاں سے اُس سے روشنی کی کرنیں اُس کی دائیں آنکھ کے کونے سے دل کے اندر اُتر رہی تھیں اور پھر وہ خود ضروری فائلیں دیکھنے لگا۔ وہ دیر تک ڈاک نکالتا رہا۔

اچانک فیلڈ کی ایک رپورٹ پڑھتے پڑھتے وہ رُک گیا۔ ملاقاتی کا چہرہ اُس فائل پر بار بار اُبھر رہا تھا۔ اُس چہرے پر مسکراہٹ تھی، معنی خیز مسکراہٹ۔ رپورٹ میں درج تھا کہ اُس نے کچھ سرکاری زمین دو سالہ پٹے پر حاصل کی تھی۔ اب پٹے کی خلاف ورزی کر کے اُس زمین کے چھوٹے چھوٹے پلاٹ بنا کر لوگوں کو بیچ رہا تھا۔ اُس زمین پر اب بہت سی ناجائز تعمیرات ہو رہی تھیں۔

تجویز کیا گیا تھا، پٹے دار کے خلاف پرچہ درج کرانے کا حکم دیا جائے اور ناجائز تعمیرات کو فوری طور پر گرانے کا بھی حکم بخشا جائے۔

افسر کے دماغ میں دھواں بھر گیا۔ شانتی اور سکون کی جگہ پھر سے تناؤ نے لے لی۔ ٹیلی فون کی بزر بار بار بج رہی تھی۔ فائل اُس کے سامنے دامن پھیلائے کھڑی تھی اور مناسب حکم کے دان کی منتظر تھی۔

اُس نے نظریں موڑ کر خوبصورت کتاب پر جما دیں۔ پنکھے کی ہوا میں تیزی آ گئی تھی۔ دفتر کا سکون کرچیاں ہو چکا تھا۔ یہ کرچیاں اُس کے دل میں چُبھ رہی تھیں۔ اُسے لگا جیسے خوبصورت کتاب خود بخود کھل گئی ہو۔ اُس کے اوراق پھڑ پھڑا رہے تھے۔ متن اور ترجمے کے الفاظ اڑ چکے تھے اور صفحات خالی نظر آ رہے تھے۔

اردو ڈائجسٹ کے سالانہ خریدار بن کر

★1415 روپے کی غیر معمولی بچت پایئے ★ اس قیمت میں خصوصی نمبر بھی شامل ہیں

علم وادب کا خزانہ گھر بیٹھے پایئے

ہمہ رنگ، باوقار اردو ڈائجسٹ کا ہر شمارہ اسلامی تحریروں، بہترین کہانیوں سائنس ٹکنالوجی کے تازہ مضامین، ناقابل فراموش خاکوں اور منفرد آپ بیتیوں سے مزین ہوتا ہے۔

یہ گھر کے ہر فرد کی ذہنی آبیاری کرتا اور اسے اچھا انسان و مفید شہری بننے میں مدد دیتا ہے۔ سالانہ خریدار بن کر معلومات کا خزینہ ہر ماہ گھر بیٹھے پایئے اور 1415 کی غیر معمولی بچت بھی حاصل کیجیے

قیمت فی پرچہ 290 روپے	12 شماروں کی قیمت	سالانہ رجسٹرڈ ڈاک خرچ	کل رقم سالانہ	سالانہ بدل اشتراک	بچت
سالانہ خریداری	2425 روپے	360 روپے	3840 روپے	2425 روپے	1415 روپے

سالانہ خریداری فارم

نام ______________ فون نمبر ______________

پتا ______________ ای میل ______________

1- میں ماہ............20ء سے اردو ڈائجسٹ کا سالانہ خریدار بننا چاہتا ہوں۔ مجھے اردو ڈائجسٹ ارسال کر دیجیے۔

2- میں مطلوبہ رقم -/2425 روپے کا بینک اکاونٹ/منی آرڈر ارسال کر رہا ہوں۔ یا

3- میں نے -/2425 روپے اردو ڈائجسٹ کے اکاونٹ نمبر PK 34 BPUN 6010 0527 0140 0011 بینک آف پنجاب سمن آباد میں آن لائن جمع کروا دیے ہیں۔ اور اپنا ایڈریس ای میل کر رہا ہوں۔ یا

4- ہماری ویب سائٹ پر جا کر سبسکرپشن فارم پُر کریں اور ہمیں ای میل کر دیں۔ یا

5- ہمیں 0333-4713631 پر ایس ایم ایس کریں۔ ہمارا نمائندہ آپ سے رابطہ کرے گا۔

تاریخ ______________

دستخط ______________

اردو ڈائجسٹ۔ سرکولیشن منیجر۔ G-III, 325 جوہر ٹاون لاہور: فون نمبر: +92-42-35290707
ویب سائٹ: urdudigest.pk فیکس: +92-42-35290731

سچا واقعہ

عامر محمود
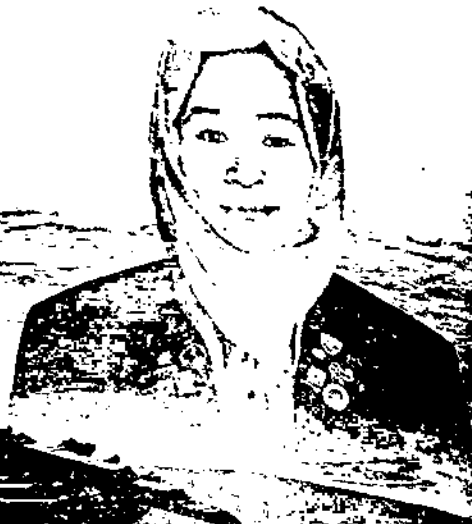
ماں نے بیٹے کے لیے جان دیدی

ایک بہادر خاتون کی داستانِ جہد، اس نے ممتا کے عظیم جذبے جذبے کو نئے معنی عطا کر دیئے

صبح کے ساڑھے پانچ بجے تھے۔ سمندر پر رواں دواں کشتی ساحل کی سمت بڑھ رہی تھی۔ کشتی چار دِن قبل ترکیہ کے شہر ازمیر سے رات گئے چوری چھپے روانہ ہوئی تھی۔ وہ اِس لیے کہ کشتی پر غیر قانونی طور پر اٹلی جانے والے تقریباً دو سو پناہ گزین سوار تھے۔ اُن کی منزل جنوبی اٹلی میں واقع ایک ساحلی قصبہ تھا۔ کشتی پر افغانستان، صومالیہ، عراق، شام، پاکستان اور ایران کے شہری سوار تھے۔ بعض کے ساتھ بیوی بچے بھی تھے۔

سبھی لوگوں نے ایک پُرآسائش زندگی کا سپنا بسائے اٹلی کا رُخ کیا تھا۔ اُنھیں یقین تھا کہ ایک بار وُہ یورپ پہنچ گئے تو سہانا مستقبل اُن کا منتظر ہے۔ صرف ایک پاکستانی خاتون ایسی تھی جس نے آرام و آسائش پانے نہیں، بلکہ اپنے بیٹے کی زندگی سنوارنے کے لیے یہ خطرناک سفر اختیار کیا تھا۔

ستائیس سالہ شاہدہ رضا پاکستانی شہر کوئٹہ کی باسی تھی۔ وہ ہزارہ کمیونٹی سے تعلق رکھتی تھی۔ پچھلے کئی برس سے یہ کمیونٹی انتہا پسند مذہبی گروہوں کا نشانہ بنی ہوئی ہے۔ شاہدہ بچپن ہی میں ہاکی کا کھیل شوق سے کھیلنے لگی۔ اُس نے اِس کھیل میں اتنی مہارت پائی کہ آخر خواتین کی قومی ہاکی ٹیم کا حصہ بن گئی۔ وہ ہاکی ٹیم کی کپتان بھی رہی۔ ♦♦♦

شاہدہ اُس ہاکی ٹیم کا حصہ تھی جس نے ۲۰۰۹ء میں ایشین ہاکی فیڈریشن کے انڈر۔۱۸ کپ میں حصہ لیا تھا۔ مقامی طور پر وہ واپڈا کی خواتین ہاکی ٹیم میں شامل رہی۔ پاکستان ریلویز اور پاک آرمی کی ہاکی ٹیموں میں بھی اُسے شامل کیا گیا۔ وہ ایک ہونہار اور باصلاحیت کھلاڑی تھی۔

ہاکی کے علاوہ شاہدہ فٹ بال، کِک باکسنگ اور وُوشو (Wushu) بھی کھیلنا جانتی تھی۔ وہ ایک ہرفن مولا انسان تھی۔ شاہدہ کی بدقسمتی کا آغاز ۲۰۱۸ء سے ہوا جب نئی پی ٹی آئی حکومت نے ڈیپارٹمنٹل سپورٹس پر پابندی عائد کر دی۔ یوں شاہدہ واپڈا میں اپنی ملازمت سے ہاتھ دھو بیٹھی اور بے روزگار ہو گئی۔

۲۰۱۸ء کے اوائل میں اُس کی شادی ہو چکی تھی۔ اگلے سال اُس کا بیٹا تولد ہوا۔ بیٹا چند ماہ کا تھا کہ شدید بخار نے معصوم کو آن دبوچا۔ علاج ہوا مگر اُس کا آدھا جسم بخار نے مفلوج کر ڈالا۔ یوں شاہدہ ایک اور مصیبت میں مبتلا ہو گئی۔

ماں باپ معذور بیٹے کو پاکستان بھر کے اسپتالوں میں لے گئے مگر کسی ڈاکٹر کا علاج اُسے تندرست نہ کر سکا۔ ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ بیٹا کسی پُراسرار بیماری میں مبتلا ہو چکا۔ لیکن اِسے کسی مغربی ملک لے جائیں، تو وہاں جدید ترین طبی ٹیکنالوجی شاید اِسے صحت مند کر دے۔

کچھ عرصے بعد شوہر نے شاہدہ کو طلاق دے دی۔ وہ ایک بزدل اور ظالم مرد تھا۔ جب اُس سے معذور بیٹے کا خرچہ نہیں اٹھایا گیا، تو بیوی اور بچے دونوں کو چھوڑ دیا۔ ایسے بدبخت شوہر اور باپ اللہ تعالیٰ کسی کی قسمت میں نہ لکھیں۔

شاہدہ مگر ماں تھی..... ایسی ہستی جو اَپنے ہر بچے کو دنیا میں سب سے زیادہ چاہتی ہے، چاہے وہ کالا کلوٹا ہو یا معذور! کہتے ہیں، ماں دنیا کا واحد انسان ہے جس کا پیار تمام بچوں میں برابر تقسیم ہوتا ہے۔ اور یہ کہ ماں واحد ہستی ہے جو کسی کی بھی جگہ لے سکتی ہے مگر کوئی دوسرا اُس کی جگہ نہیں لے سکتا۔

چنانچہ شاہدہ نے تن تنہا اپنے معذور بیٹے کی ذمے داری سنبھال لی۔ یہی نہیں، اُسے بوڑھی ماں اور تین چھوٹی بہنوں کی بھی کفالت کرنا تھی کہ باپ وفات پا چکا تھا۔ اب شاہدہ کسی بھی ادارے میں ملازمت تلاش کرنے لگی۔ اُس نے کئی انٹرویو دیے مگر اُسے ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ کوئی بھی ناتجربے کار خاتون کو موقع دینے کے لیے تیار نہ تھا۔ وہ جزوقتی ملازمتیں کر کے اپنے اہلِ خانہ کی روزمرہ ضروریات پوری کرتی رہی۔

بیٹے کی حالت وہ جب بھی دیکھتی، تو کڑھ کر رہ جاتی۔ اُس کی سب سے بڑی تمنا یہی بن گئی کہ بیٹا دوسرے بچوں کی طرح نارمل زندگی گزارے۔ یہی تمنا پوری کرنے کے لیے اُس نے بیرون پاکستان جانے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ اٹلی یا آسٹریلیا پہنچ کر وہاں سیاسی پناہ طلب کرنا چاہتی تھی۔

چند ماہ قبل شاہدہ اِیران چلی گئی۔ وہاں سے اُس نے ترکیہ کا رُخ کیا۔ ترکیہ میں اُس نے اٹلی اور آسٹریلیا کے ویزے کی خاطر بہت تگ و دو کی مگر اُسے ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ ترکیہ ہی میں اُس کی ملاقات ایسے پاکستانیوں سے ہوئی جو بہ عوض رقم لوگوں کو غیرقانونی طور پر یورپ بھجواتے تھے۔

شاہدہ نے اپنی جمع پونجی یہ سوچ کر بچا رکھی تھی کہ ضرورت پڑنے پر کام آئے گی۔ اب وہی اُس کے کام آئی۔ اُس نے آٹھ ہزار یورو میں بذریعہ کشتی اٹلی جانے کا سودا طے کر لیا۔ ۲۱ فروری ۲۰۲۳ء کی رات کشتی ازمیر سے چل پڑی۔ اُس پر دو سو سے زائد مسافر سوار تھے۔ کسی کو خبر نہ تھی کہ اُن کے ساتھ کیا المیہ ظہور پذیر ہونے والا ہے۔

۲۶ فروری کو صبح سویرے شاہدہ نے بذریعہ فون اپنی بہن سے رابطہ کیا۔ اُس نے بہن کو بتایا کہ کشتی چند گھنٹے بعد اٹلی کے ساحل پر پہنچنے والی ہے۔ وہ بہت خوش تھی کہ اُس کی منزل آ پہنچی۔ وہ اِٹلی میں ملازمت ڈھونڈ کر سب سے پہلے اپنے بیٹے

کو بلانا چاہتی تھی۔ وہ رہ رہ کر شاہدہ کو یاد آ رہا تھا۔ جب بھی بیٹے کا ذکر آتا، اُس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے۔

کشتی میں بیٹھے مسافروں کو خبر نہ تھی کہ یورپی یونین کی سکیورٹی ایجنسی کے ایک جہاز نے ۲۵ فروری کی شام اُنھیں دیکھ لیا تھا۔ ہوائی جہاز میں بیٹھے عملے نے کشتی کے عرشے پر صرف ایک شخص کو بیٹھے دیکھا۔ تاہم جہاز میں لگے تھرمل کیمرے نے اُنھیں خبر دی کہ کشتی کے نچلے حصے میں کافی انسان موجود ہیں۔

عملہ ہوائی جہاز نے فوراً اطالوی حکومت کی سرحدی پولیس کو خبردار کر دیا۔ چنانچہ پولیس کی دو پٹرول کشتیاں اُس کشتی کی جانب روانہ ہو گئیں۔ مگر اُنھیں طوفانی موسم کی وجہ سے اپنا سفر ادھورا چھوڑ کر واپس آنا پڑا۔ تب سمندر میں سوا آٹھ ہزار فٹ بلند لہریں جنم لے رہی تھیں

یہ عین ممکن ہے کہ کشتی والوں نے خراب موسم میں سفر کرنا مناسب سمجھا تا کہ اطالوی سرحدی پولیس کی کشتیاں اُن تک نہ پہنچ سکیں۔ لیکن یہ فیصلہ درست ثابت نہیں ہوا۔ ہوا یہ کہ ۲۶ فروری کو صبح ساڑھے پانچ بجے کشتی ساحل سمندر کے قریب پہنچ گئی۔ مگر تبھی وہ ایک خوفناک حادثے کا شکار ہو گئی۔

سمندر کی تیز و تند لہروں نے اُسے ساحلی چٹانوں کی سمت دھکیل دیا۔ کشتی بڑے زور سے چٹانوں سے ٹکرائی، تو اُس کے پرخچے اڑ گئے۔ سبھی لوگ ڈوب گئے۔ کچھ تو تیر کر ساحل تک پہنچنے میں کامیاب رہے مگر "۷۶" بدقسمت ثابت ہوئے۔ سمندری لہریں اُنھیں نگل گئیں۔ مقتولین میں شاہدہ رضا بھی شامل تھی۔ یوں وہ بیٹے کی خوشیاں دیکھنے کی آس لیے دنیا سے رخصت ہو گئی۔

شاہدہ مگر ایک دلیر و بہادر ماں تھی۔ اُس نے حالات سے سمجھوتہ نہیں کیا اور بیٹے کو معمول کی زندگی دینے کے لیے جدوجہد کرتی رہی۔ حتیٰ کہ تن تنہا ایک خطرناک سفر پر روانہ ہو گئی جو اُس کی حیات کا چراغ گل کر گیا۔

یہ درست ہے کہ شاہدہ رضا نے ایک غیرقانونی قدم اٹھایا، مگر اُس وقت جب تمام دروازے بند ہو چکے تھے۔ بیٹے کی محبت میں تو وہ سب کچھ کرنے کے لیے تیار تھی۔ وہ چاہتی، تو شوہر کی طرح بیٹے کو چھوڑ دیتی۔ اُسے کسی فلاحی تنظیم کے سپرد کر دیتی۔ مگر ۲۷ سالہ شاہدہ نے یہ اقدام نہیں کیا اور بیٹے کو نارمل انسان بنانے کی خاطر تگ و دو کرتی رہی۔ یہ حقیقت ہے کہ اُس نے جان دے کر مامتا کے عظیم الشان جذبے کو نئے معانی عطا کر ڈالے۔

یہ بڑا المیہ ہے کہ اب غریب اور ترقی پذیر ممالک سے لاکھوں شہری غیرقانونی طریقے سے یورپ و امریکا پہنچنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان میں سے ہزارہا مرد و زن اور بچے راہ میں کسی نہ کسی خوفناک حادثے کا شکار ہو کر دم توڑ دیتے ہیں۔ جب تک ترقی پذیر ممالک معاشی و سیاسی طور پر مضبوط نہیں ہوتے، وہاں سے شہریوں کی نقل مکانی کا سلسلہ جاری رہے گا۔ اس ضمن میں یورپی حکومتیں مگر بڑا سخت رویہ اپنا رہی ہیں۔ وہ کسی طور غیرقانونی مہاجرین کو اپنے ہاں پناہ دینے کو تیار نہیں۔ گویا ایک نئی قسم کا انسانی بحران جنم لے رہا ہے۔

◆••◆••

نوجوانی کی نعمت

برنارڈ شا ایک محفل میں شامل تھے۔ ایک نوجوان خاتون اپنے چھ بچوں کے ساتھ اُسی صوفے پر آ بیٹھی جہاں مسٹر شا بیٹھے تھے۔ شا نے اُس کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ خاتون نے بوڑھے ادیب کو چڑانے کی خاطر کہا:

"مسٹر شا! جوانی بھی کتنی بڑی نعمت ہے۔"

برنارڈ نے برجستہ جواب دیا:

"بے شک آپ بجا فرماتی ہیں، لیکن یہ کتنا بڑا ظلم ہے کہ آپ اِس نعمت کو بچوں پر برباد کر رہی ہیں۔"

راز

مغربی تہذیب کا ایک بدنما پہلو اجاگر کرتی دلدوز کہانی

رضیہ فصیح احمد

ہم میاں بیوی جہاز کے کیبن میں آئے اور سامان کھول کر رکھنا شروع کیا ہی تھا کہ کمرے میں لاؤڈ اسپیکر شور مچانے لگا۔

''سیفٹی ڈرل کے لیے تیار ہو جاؤ۔ تمہارے کمرے کی الماری میں لائف بیلٹ رکھی ہیں۔ ہدایات کے مطابق اُنھیں پہن لو اور کمرے کے باہر قطار میں کھڑے ہو جاؤ۔ سیفٹی بیلٹ پر جو نمبر ہے، اُس کے حساب سے قطار میں ڈیک چھ پر آنا ہو گا جہاں لائف بوٹ (Life Boat) ہیں۔ ایلی ویٹر بند ہوں گے، بتیاں بجھا دی جائیں گی، صرف سیڑھیاں استعمال ہوں گی۔ مدھم چراغ راہوں میں روشن ہوں گے اور جہاز کا عملہ راہنمائی کے لیے موجود ہو گا۔ جیسے ہی سائرن بجے سب کمروں سے باہر نکل آئیں۔ کوئی کمرے میں نہیں ٹھہرے گا۔ اگر آپ بیمار ہیں، تب بھی باہر آ جائیں، عملہ آپ کی مدد کرے گا۔ وہیل چیئر کی ضرورت ہو تو، فون کر دیں۔'' وغیرہ وغیرہ۔

پھر آگ لگ جانے کی خبر دینے والا اونچا سائرن بجنے لگا اور جیسے ہی لائف بیلٹ پہن کر باہر نکلے، تو ساری بتیاں گل ہو گئیں۔

''کروز میں کریبین کی سیر کو نکلے ہیں، ابھی تو جہاز کے ہاتھ پیر بھی نہیں ٹٹولے تھے کہ یہ افتاد پڑ گئی۔'' مَیں نے کہا۔

''اور اِس سے پہلے جو پاسپورٹ دکھانے اور جہاز میں داخل ہونے کے لیے کارڈ وغیرہ کی کارروائی ہوئی سو الگ۔'' حمید نے کہا۔ ''اب اوکھلی میں سر دیا ہے، تو موسلوں کا کیا ڈر۔''

معلوم تھا کہ صرف ڈرل ہے پھر بھی ڈر لگ رہا تھا۔ ٹمٹماتے چراغ کی روشنیوں اور نارنجی جیکٹ پہنے لڑکیوں کے اشارے پر آگے بڑھتے اور سیڑھیاں چڑھتے اترتے رہے۔

جب ڈیک نمبر چھ پر پہنچے اور سورج کی روشنی نظر آئی، تب جان میں جان آئی۔
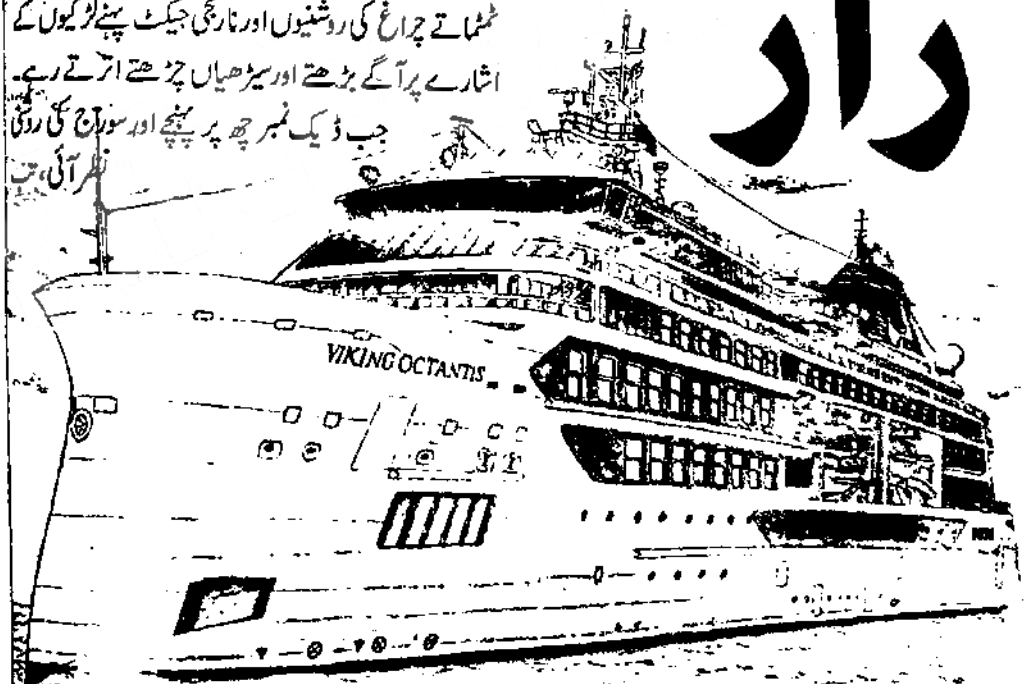
دوبارہ قطار بندی ہوئی اور لیکچر شروع ہوا کہ آج کی ڈرل یہیں تک ہوئی۔ اگر واقعی کوئی حادثہ پیش آیا، تو اِس وقت کی الٹی لٹکی ہوئی ساری کشتیاں پانی میں ہوں گی اور آپ کو اَپنے نمبر کے حساب سے کشتیوں میں بیٹھنا ہو گا۔ لوگ اکتائے ہوئے لیکچر سن رہے تھے۔ لڑکیاں اپنے ساتھ کے لڑکوں سے چمٹ کر لیکچر کو بالکل ہی نظر انداز کر رہی تھیں۔ ایک تو اپنے بوائے فرینڈ کی گود میں اِس طرح چڑھ گئی تھی کہ جیسے کوئی ننھا سا بچہ ماں کی گود میں ہو۔

ہمارے پیچھے کوئی سیاہ فام صاحب کسی گوری خاتون سے بحث کر رہے تھے۔ مَیں سوچ رہی تھی کہ اگر واقعی کوئی حادثہ ہوا، تو کیا یہ سب یوں ہو گا۔ ایسی افراتفری ہو گی کہ لوگ قطار بندی بھی بھول جائیں گے۔ یہ چہلیں کسے سُوجھیں گی اور شاید اُسی وقت کھلے کہ گود میں چڑھنے اور گلے میں بانہوں کا ہار ڈالنے والوں میں کون کس کا دوست ہے؟ بارے ڈرل ختم ہوئی اور قطاروں میں واپسی ہوئی۔

اُس ڈرل سے ہمیں یہ معلوم ہو گیا کہ اِس وقت ہزاروں مسافر اِس جہاز میں ہیں۔ یہ جہاز ایسا چڑیا گھر ہے جس میں ہر ملک اور ہر قسم کا جانور موجود ہے۔ ہم اُس ڈرل سے گھبرائے ہوئے تھے مگر اُس کے بعد سفر کے تجربات نہایت خوشگوار رہے۔ بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ ہم جہاں پناہ ہیں اور تالی بجا کر جس وقت جو چیز مانگیں گے، وہ حاضر کر دی جائے گی۔

شام کی چائے کے ساتھ بےشمار لوازمات تھے۔ ہم چند ایک چیزیں لے کر ڈیک گیارہ پر آ بیٹھے جو سمندر کی سیر کے لیے کھلا ہوا تھا۔ دھوپ سے بچنے کے لیے شامیانہ تنا تھا۔ حدِ نظر تک پھیلا سمندر ہمیشہ مجھے ازل اور اَبد کا اشاریہ لگتا ہے اور اُس کی لہروں کی مسلسل حرکت وقت کی علامت۔ اُس کے بدلتے رنگ، طلوع اور غروبِ آفتاب کے مناظر، لہروں کا کبھی بےانتہا بپھر جانا، کبھی حد سے زیادہ پُرسکون ہو جانا، دنیا کی رنگارنگی کا روپ نظر آتا ہے۔ شاید اِسی لیے سمندر کو تکتے رہنے سے دل نہیں بھرتا۔ شفق کے وقت قدرت کے آرٹسٹ نے جلدی جلدی تصویریں بنانی اور مٹانی شروع کیں۔ جو لوگ ریلنگ کے پاس بیٹھے دھوپ سے رنگ گلنار کر رہے تھے، اٹھ کر چلے گئے۔

رات کا کھانا اگر تکلف سے گرینڈ ریستوران میں کھانا ہے، تو لباس تبدیل کر کے آنا ہو گا۔ ہم تو تماشا دیکھنے کے شوقین ہیں، سو کپڑے بدل کر ہم بھی چلے۔ ریستوران کا دروازہ اَبھی نہیں کھلا تھا۔ دروازے کے آگے قطاریں لگ رہی تھیں۔ ہم نے دیکھا کہ خواتین جہاز کے بیوٹی پارلر سے بال بنوا کر اَور نہایت سج دھج کر آ رہی ہیں۔ مرد حضرات عمدہ سُوٹ پہنے ہوئے ہیں جیسے کوئی ریاستی عشائیہ ہو۔ تبھی تو لوگ ایک ہفتے کے لیے دو دو بڑے سوٹ کیس لے کر نکلے ہوئے تھے اور کروز نہ صرف اِس کی اجازت دیتا بلکہ حوصلہ افزائی کرتا تھا۔

ہماری میز پر صرف دو اَور لوگ تھے۔ باقی نشستیں خالی تھیں اور ہمیشہ خالی رہیں۔ موجود لوگوں نے اپنا تعارف کروایا: آرلین سفید فام اور مائیکل سیاہ فام۔ یہ جوڑا کینیڈا سے آیا تھا۔ یہ وہی جوڑا تھا جو حادثے کی تربیت میں ہمارے پیچھے کھڑا تھا۔ آرلین خوب بنی سنوری تھی۔ نیچے تک جاتے ہوئے گلے کے اوپر خوب صورت سا ہار، بلکہ دونوں ہی زیورات میں لدے ہوئے تھے۔ مائیکل بھی ہاتھ میں سونے کی کئی کئی انگوٹھیاں، گلے میں سونے کی موٹی سی زنجیر اور ایک ہاتھ میں بھاری سا کنگن پہنے ہوئے تھا۔

بیرا ایک سجا سجایا کیک لایا اور ہماری میز پر رکھ دیا۔

''کھانے سے پہلے کیک؟'' مَیں نے پوچھا۔

''آج آرلین کی سال گرہ ہے۔ اُس کا کیک ہے۔ بس اِنھیں بتانا ہوتا ہے، پیسے ویسے نہیں دینے پڑتے۔''

ذرا دیر میں چھ فٹ کا خوبصورت سا بیرا آیا۔ اُس نے آرلین کو مبارک باد دی۔ اتنی دیر میں دو بیرے اور آ گئے۔ اُس نے سب کا تعارف کرایا۔ ہیڈ ویٹر اسکاٹش تھا اور دُوسرے بیرے مختلف ملکوں کے رہنے والے تھے۔ ایک بیرا اِستنبول کا رہنے والا تھا۔ پھر سب مل کر گانے لگے: ہیپی برتھ ڈے ٹو یو۔ اُس لمبے چوڑے ہال میں کئی جگہ یہ آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔

ہیڈ بیرے نے جھک کر آرلین سے پوچھا ''کون سی سال گرہ ہے؟''

وہ ذرا ہچکچائی۔ مائیکل نے فوراً جواب دیا ''پچاسویں!''

''ارے تم تو تیس سال سے ایک دن بھی زیادہ نہیں لگتیں۔'' ہیڈ بیرے نے کہا۔

آرلین خوب ہنسی۔ ''یہ ہوئی نا بات۔ چلو اِس نیک شخص کے ساتھ میری تصویر لو۔'' یہ کہہ کر مائیکل کے ہاتھ میں کیمرا دے کر خود ہیڈ بیرے سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ مائیکل نے دونوں کی تصویر لی۔ پھر اُس نے بیرے کے گلے میں ہاتھ ڈال دیا اور بولی ''ایک اور!'' مائیکل نے دوسری تصویر لی۔

اتنی دیر میں جہاز کا فوٹوگرافر آ گیا جو ہر ایک کی تصویر

> بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ ہم جہاں پناہ ہیں اور تالی بجا کر جس وقت جو چیز مانگیں گے، وہ حاضر کر دی جائے گی

لے رہا تھا۔ ''اب مَیں تم دونوں کی تصویر لیتا ہوں۔''

آرلین کرسی پر بیٹھ گئی۔ ''پہلے ایک تصویر صرف میری لو، میری سال گرہ ہے۔ پھر ہم دونوں کی لینا اور اِس طرح کہ کپتان کی میز کا منظر پورا آئے۔'' تصویر لی گئی۔ پھر اُس نے ہماری تصویر لی۔

''اچھا کیک تو کاٹو۔'' مائیکل نے کہا۔ آرلین نے کیک کاٹا۔ ایک ایک ٹکڑا سب نے کھایا۔ پھر کھانے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ کھانے پر رسمی باتیں ہوتی رہیں۔ وہ ڈیک نمبر چار پر تھے اور متعجب کہ اُنھیں اتنے اوپر ڈیک پر کیبن کیسے مل گیا۔

''ہم سے تو سمندری منظر کا وعدہ کیا گیا تھا مگر بعد میں لڑکی مکر گئی کہ پورے جہاز میں ایک نشست بھی خالی نہیں۔'' حمید نے کہا۔

''مگر بے چاری نے تحفہ تو بھیج دیا۔'' مَیں نے کہا۔

''تحفہ ہمارے کس کام کا ہے، شراب کی بوتل ہے۔''

''شراب کی بوتل!'' مائیکل چہکا۔ ''بڑی خاص ہوتی ہے اِن کی شراب۔ تم نے پی؟''

''ہم لوگ پیتے پلاتے نہیں، کسی امریکن دوست کو دے دیں گے۔''

''آرلین! تم اِن کے ساتھ جا کر بوتل لے آؤ نا۔ جب یہ پیتے نہیں، تو اتنے تام جھام کے ساتھ خواہ مخواہ جگہ گھیر رہی ہو گی۔''

''کھانے کے بعد جب یہ کیبن میں جائیں گے، تب لے لوں گی۔''

''میرا خیال ہے ابھی لے آؤ، یہیں کھول کر پییں گے۔'' مائیکل نے کہا۔ ''سب چیزیں مفت ہیں مگر شراب کے پیسے دینے پڑتے ہیں۔'' مائیکل نے ہمیں مطلع کیا۔

''نہیں یہاں اپنی بوتل کھول کر پینا اچھا نہیں لگے گا۔ کھانے پر شراب تم منگاؤ نا، آج میری سال گرہ بھی تو ہے۔'' یہ کہہ کر آرلین خوب ہنسی۔ اُس کے دانت برابر اور خوب صورت تھے۔ اُس کی ہنسی میں خوش دلی کے ساتھ دانتوں کی خوب صورتی کا بھی خاصا حصّہ تھا۔ خود بھی خوش شکل تھی۔

''اچھا بابا! مَیں ہی منگا لوں گا۔'' مائیکل نے ہار ماننے کے انداز میں کہا۔

''اور تحفہ بھی دو گے نا، ہیرا لوں گی۔''

''وہ بھی لے لینا۔'' مائیکل نے بھی دانت نکال دیے۔

مینو دیکھ کر کھانا منگایا گیا۔ مائیکل نے شراب کا آرڈر دیا۔ کئی کورس ہوئے، کھانا بہت مگر ہمارے مطلب کا کم تھا۔

''پھل کو جی چاہ رہا ہے۔'' مَیں نے کہا۔

''الگ سے پھل کا آرڈر دو، تو اُس کے پیسے ہوتے ہیں۔'' مائیکل نے کہا۔

''تم بڑے باخبر ہو۔''

''ہاں! میرا چوتھا چکر ہے، مَیں تو آتا رہتا ہوں۔''

''مَیں نے پناما کنال، الاسکا اور ویسٹرن کریبین کے کروز بھی لیے ہیں۔''

آرلین خاموش بیٹھی تھی۔

''تم نہیں گئیں؟'' مَیں نے اُس سے پوچھا۔

''نہیں! یہ اکیلا جاتا رہتا ہے..... جب کبھی مجھے چھٹی مل جائے، تو مَیں بھی چلی جاتی ہوں جیسے ابھی آ گئی۔''

''تو تمہارا میاں ہر وقت چھٹی پر رہتا ہے۔''

''اِس کا اپنا کاروبار ہے۔ مَیں ملازمت کرتی ہوں۔''

''بات سنو آرلین! وہ شراب کی بوتل۔'' مائیکل نے یاد دلایا۔

''ہاں، ہاں! جب یہ جائیں گے، تب لے لوں گی نا۔''

''بس ہم تو اٹھ رہے ہیں۔'' مَیں نے کہا۔

''چلو مَیں بھی چلتی ہوں۔''

ہمارے کیبن میں پہنچ بوتل اپنے قابو میں کر کے وہ بستر پر بیٹھ گئی اور بولی ''صبح تم لوگوں کا کیا پروگرام ہے؟''

''کچھ نہیں، ہم تو ڈیک پر بیٹھ کر سمندر کا نظارہ کرتے یا کچھ پڑھ لیتے ہیں۔''

''ناشتے کے بعد مَیں بھی آ جاؤں گی، تاش کھیلیں گے مگر تم لوگ صرف سمندر کا نظارہ کرتے ہو، نہ پول میں تیرتے نہ صبح کو سیر کے لیے جاتے ہو۔ مَیں تو چھ بجے اٹھتی ہوں، سیر کے لیے جاتی ہوں۔ سات بجے باڈی اسکلپٹنگ ہوتی ہے۔''

''نہیں!'' مَیں نے کہا۔ ''ہم گرم ملک کے سست لوگ ہیں۔ اپنی سستی میں مگن رہتے ہیں۔ کنارے سے نظارہ کرتے ہیں، ڈوبنے کو ضروری نہیں سمجھتے۔''

''یہ اچھی کہی۔'' وہ ہنسی ''اور تم لوگ رات کھانے کے بعد ڈانس بھی نہیں کرتے؟''

''نہیں، جس دن کوئی اور پروگرام ہو گا، تب آئیں گے۔''

''ہزاروں پروگرام روز ہوتے ہیں۔ تمبولا اور کیسینو میں ہر طرح کا جوا۔ کل تمھیں سارے جہاز کی سیر کراؤں گی۔'' وہ اپنا گاؤن سنبھالتی کھڑی ہو گئی، رخصتی کے لیے میرے گال سے گال لگائے، پھر حمید کو اپنا گال پیش کیا اور بائی بائی کرتی رخصت ہو گئی۔

دوسرے دن مَیں سمندر کی نیرنگیاں دیکھنے میں غرق تھی اور حمید حسبِ معمول اخبار پڑھ رہے تھے کہ آرلین تاش لے کر آ پہنچی۔

''مائیکل کہاں ہے؟'' حمید نے پوچھا۔

''تالاب میں تیر رہا ہے اور وہاں جو کھیل ہوتے ہیں، اُن میں حصّہ لے رہا ہے۔''

''تم نہیں تیرتیں؟'' مَیں نے پوچھا۔

''مجھے تو رات کو مزہ آتا ہے۔ جب چاروں طرف روشنیاں ہوتی ہیں۔ دس بجے رات سے ایک بجے تک مزے دار پیٹز اور پھر ہوائی اسٹائل پر ناریل کے چھلکوں میں سجا ٹھنڈا اَنناس..... تیرتی نہیں ہو، تو کبھی دیکھنے ہی آؤ۔''

> ہم گرم ملک کے سست لوگ ہیں۔ اپنی سستی میں مگن رہتے ہیں

''ہاں آؤں گی۔'' مَیں نے کہا۔

''اور ہاں آج کیپٹن کا ڈنر ہے۔ رات کو خوب بھڑکیلے کپڑے پہن کر آنا اور زیور بھی۔''

''مَیں بھڑکیلے کپڑے نہیں پہنتی، میرا مزاج نہیں ہے۔'' مَیں نے کہا۔

''پھر بھی بن سنور کر تو آنا۔ مَیں تو بھئی بہت سے کپڑے لے کر آئی ہوں، جہاز والے بھی یہی چاہتے ہیں۔ جبھی تو فی کس دو سُوٹ کیس لانے کو کہتے ہیں اور ہر دوسری رات کوئی خاص ہوتی ہے اور الوداعی رات تو بہت خاص ہوتی ہے۔''

تھوڑی دیر تاش کھیلے، پھر میرا دل بھر گیا۔ ''مَیں لائبریری سے کتاب لے کر آتی ہوں۔'' مَیں نے کہا۔

''جلدی آجانا، خشکی پر سیر کا پروگرام بھی طے کرنا ہے۔'' حمید نے کہا۔

''کروز پر کتابیں کون پڑھتا ہے؟'' آرلین نے کہا۔

''مَیں کیبن میں جا کر پڑھتی ہوں۔''

''کیبن میں جانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ جب ہزار دلچسپیوں کا سامان آپ کے لیے مہیا کیا گیا ہے۔''

''اِس کا جواب مَیں کل دے چکی ہوں۔'' کہہ کر مَیں لائبریری کی طرف چلی جو ڈیک نمبر چھ پر بالکل اخیر میں تھی۔ میں فوٹو گیلری، فلاور شاپ، کافی شاپ، راہداری دو اور تحائف کی دکانوں سے گزرتی پتلی سی گیلری کو پار کر کے لائبریری پہنچی۔

لائبریری اندھیری پڑی تھی۔ مَیں نے روشنی جلائی، تو دیکھا مائیکل کسی سے لپٹا کھڑا تھا۔ وہ گھبرا کر الگ ہو گیا۔ چینی سی لڑکی نے مجھے بڑی ناگواری سے دیکھا۔ مَیں جلدی سے بغیر روشنی بجھائے اُلٹے پیروں واپس ہوئی۔

''کیا ہوا، کتاب نہیں لائیں؟'' حمید نے کہا۔

''کوئی ڈھنگ کی کتاب نہیں ملی۔''

[illegible]

کرنے لگے۔'' حمید نے کہا۔ ''انھیں تو بس چاہئے بہانہ، چلو اَب پروگرام سیٹ کر لیں۔''

''یہیں کر لو۔'' آرلین نے کہا۔

''نہیں بروشر کیبن میں ہیں۔'' حمید نے کہا۔

''مگر ابھی تو ہم جہاز کی سیر کو جائیں گے۔ مَیں نے کل تمھاری بیوی سے وعدہ کیا تھا جہاز دکھانے کا تم بھی چلو۔''

''نہیں! مَیں کچھ دیر لیٹوں گا۔ طبیعت بھاری ہو رہی ہے، تم ہو آؤ۔'' حمید نے مجھ سے کہا۔

''آؤ چلیں۔ پہلے رات کی تصویریں دیکھ لیتے ہیں۔ اگر اچھی ہوئیں، تو خرید لیں گے۔ پھر دوسرے کمرے جھانکیں گے۔ مجھے بینک سے پیسے بھی نکالنے ہیں۔''

فوٹو لاؤنج سے پینٹنگز اتار کر رات کی کھینچی تصویروں کے پرنٹ لگا دیے گئے تھے۔ کچھ لوگ خرید رہے تھے اور کچھ حسبِ ہدایت اپنی ناپسندیدہ تصویریں کوڑے کے ٹین میں ڈال رہے تھے۔ آرلین نے جو تصویر کیمرا مین سے الگ کھنچوائی تھی، وہ خرید لی اور اپنے شوہر کے ساتھ والی کوڑے کے ٹین میں ڈال دی۔ مَیں نے اور حمید نے ایک تصویر کھنچوائی تھی، سو مَیں نے وہ خرید لی۔ ڈانس سیکھنے کے کمرے میں ناچ سکھایا جا رہا تھا۔ کرسٹل روم پڑا جگمگا رہا تھا مگر اُس وقت خالی تھا۔

''تم کیپٹن کے ڈنر کے لیے بال نہیں بنواؤ گی؟'' آرلین نے پوچھا۔

''نہیں بھئی، میرے پاس سو ڈالر فالتو نہیں ہیں۔''

''ٹھیک کہتی ہو۔ مَیں تو بال بنانے کا سارا سامان ساتھ لے کر آئی ہوں۔ خود ہی بنالوں گی۔ مگر بھئی ایک سو بیس ڈالر کا مساج کروانے کو تو جی چاہتا ہے۔''

مجھے اپنے وطن کی ماسیاں یاد آئیں جو بے چاری گھنٹوں بیگمات کے ہاتھ پیر دباتیں، تب چند ٹکے یا پرانا جوڑا پاتی تھیں۔

بارے گزرے، تو مائیکل بیٹھا شراب پی رہا تھا۔

''ارے تمھارا میاں تو یہاں بیٹھا ہے۔'' مَیں نے کہا۔

''بیٹھا رہنے دو۔ ابھی یہاں پینٹنگز کی بولی لگے گی، اُس کے لیے بیٹھا ہے۔''

''کیا اسے پینٹنگز خریدنے کا شوق ہے؟''

''کوئی کوڑیوں کے مول مل گئی، تو لے لے گا، پھر منہ مانگے داموں بیچے گا۔ تمھیں تو معلوم ہے نا کہ جہاز پر ٹیکس نہیں لگتا۔ مَیں کچھ زیور لوں گی۔ دکان کی لڑکی میری دوست بن گئی ہے۔ سوچو، دنیا میں اُس کا کہیں ٹھکانا نہیں۔ میاں سے طلاق لینے کے بعد بس جہاز پر ہی رہتی ہے۔ ایک کیبن ملا ہوا ہے، کھانا پینا، سونا اٹھنا سب یہیں ہے۔ کبھی سال میں ایک بار اپنی کسی دوست کے پاس چلی جاتی ہے۔''

''ارے وہ اُکتاتی نہیں سمندر کے سفر سے؟''

''نہیں! کہتی ہے یہ میرا گھر ہے، یہاں کے لوگ میرے دوست ہیں اور بس۔''

''مَیں حمید کو فون کر لوں، شاید تصویروں کا نیلام بھی دیکھنا چاہیں۔''

''تو کل دیکھ لیں گے، ابھی تو ہمیں ڈیک پانچ پر جا کر بینک سے پیسے نکالنے ہیں۔ مجھے وہ ڈیک بہت پسند ہے۔ اُس کی چھت اور سیڑھیوں کی ریلنگ ایسے جگمگاتی ہے جیسے سونا اور ہیرے لگے ہوں۔''

''ہاں! مجھے بھی اُس کا چھوٹا سا فوارہ اچھا لگتا ہے اور سیڑھیوں کے پاس جو مجسمہ رکھا ہے، وہ لہروں کے ساتھ ہلتا اور آگے پیچھے ہوتا ہوا یوں لگتا ہے جیسے چل رہا ہو۔''

''اچھا، مَیں تو روز وہاں جاتی ہوں مگر مَیں نے نہیں دیکھا۔'' آرلین نے کہا۔

بینک سے پیسے لے کر وہ زیور کی دکان پر گئی مگر دکان بند تھی۔ ''لنچ پر گئی ہوگی۔ چلو ہم بھی لنچ کر لیں۔ فون کر کے اپنے بالکوں کو بلوالو۔''

''اور مائیکل؟''

''وہ بعد میں وہیں پول کے پاس سے ہاٹ ڈاگ اور ہیم برگر لے کر کھالے گا۔''

مَیں نے حمید کو فون کیا۔ اُنھوں نے کہا، وہ ڈیک پر گیارہ بجے ملیں گے جہاں بوفے لنچ ہے۔

''تم میاں بیوی ہر وقت ساتھ رہتے ہو، بور نہیں ہوتے؟'' آرلین نے مجھ سے پوچھا۔

''ہمارے ہاں یہی دستور ہے۔ مرن بھرن کا ساتھ ہوتا ہے۔''

میرا خیال ہے یہ لوگ سونے کا کاروبار کرتے ہیں، ورنہ اتنا زیور کون خریدتا ہے

''واقعی مرن بھرن کا ساتھ ..... تعجب ہے۔ ہم اِس طرح ساتھ رہیں، تو سچ مچ مر جائیں۔''

''تمھاری شادی کو بھی تو بہت دن ہو گئے۔ مائیکل بتا رہا تھا، سینٹ مارٹن کے دورے پر ملا تھا، تم نہیں تھیں۔''

وہ ہنسی۔ ''یہ بتاؤ مائیکل نے کیا کہا؟ کتنے سال ہوئے ہماری شادی کو؟''

''چودہ!''

''اچھا!'' اُس نے قہقہہ لگایا۔ ''مگر ہم ساتھ رہتے کہاں ہیں۔ وہ مچھلیاں پکڑنے کی فکر میں رہتا ہے۔ مَیں دو چار عورتوں کے ساتھ مل کر ساحل کے نزدیک ترین بازار چلی جاتی ہوں۔ دور ہو تو بس میں بیٹھ کر چلے جاتے ہیں۔ واپسی میں تمھارے سمندر کا نظارہ بھی کر لیتے ہیں۔''

سینٹ تھامس، ورجن آئی لینڈ کے خوب صورت جزیرے میں مائیکل اور آرلین کو ہم نے ساتھ دیکھا۔ دنیا کی دس خوب صورت جگہوں میں شمار ہونے والی بے حد پُرسکون خلیج کی تصویر لے کر ہم گفٹ شاپ میں گئے، تو وہ دونوں

وہاں بھی جیولری خرید رہے تھے۔

''میرا خیال ہے یہ لوگ سونے کا کاروبار کرتے ہیں، ورنہ اتنا زیور کون خریدتا ہے۔'' حمید نے کہا۔

''ممکن ہے۔'' مَیں نے کہا۔

رات کو دیر سے جہاز پر پہنچے، تو کھانا اپنے کیبن میں منگوا لیا۔ گرینڈ ریستوران نہیں گئے، اِس لیے آرلین اور مائیکل سے ملاقات نہیں ہوئی۔ دوسرے دن بھی وہ جہاز پر کہیں نظر نہیں آئے۔ اتنے بڑے جہاز میں اتفاقاً ملنا بہت مشکل تھا۔ سینٹ مارٹن میں آب دوز کشتی میں سمندر کی تہہ میں طرح طرح کے رنگین مونگے کے ڈھیر اور قوسِ قزح کی طرح کی رنگین مچھلیوں کا نظارہ کررہے تھے، جب مائیکل نظر آیا۔

''آرلین کہاں ہے؟'' مَیں نے پوچھا۔

''آج جہاز میں ہیرے جواہرات کی سیل ہورہی ہے، اُس کی لمبی قطار میں کھڑی تھی۔ تقریباً جہاز کی ساری عورتیں وہاں ہیں، تم نہیں ٹھہریں؟''

''نہیں! ہیرے تو ہر جگہ مل جاتے ہیں مگر یہ انوکھا منظر کہاں دیکھنے کو ملے گا۔'' مَیں نے کہا۔

''بہت کم عورتیں اِس طرح سوچتی ہیں۔ آرلین کہتی ہے ننّھی چینی مچھلیاں صرف کھانے کی چیز ہیں، دیکھنے کی نہیں اور سمندر کے نیچے چھپی الابلا کو ہم پیسے دے کر کیوں دیکھیں۔''

''اپنا اپنا خیال ہے۔'' مَیں نے کہا۔

آخری ڈنر کے دن تو عورتوں نے سجنے سنورنے کی انتہا کردی۔ آرلین سے سمندر کی تہہ کا ذکر آیا، تو اُس نے کہا:

''مَیں مچھلیاں وچھلیاں نہیں دیکھتی۔ جب مچھلی پکاتی ہوں، تو دیکھ لیتی ہوں یا میرا پڑوسی دریا سے پکڑ کر لاتا ہے، تو بھیج دیتا ہے۔ دیکھو مَیں نے یہ مچھلی خریدی ہے۔'' اپنے گلے میں پڑی موٹی سی زنجیر دکھائی جس میں سونے کی ایک مچھلی پڑی تھی اور آنکھوں کی جگہ لعل جڑے ہوئے تھے۔

کھانے کے دوران پھر تصویریں کھینچی گئیں۔ آرلین نے پھر ہیڈ بیرے کے ساتھ تصویر کھنچوائی اور ڈائیل... مائیکل سے بولی ''کتنا خوب صورت آدمی ہے۔ اگر مَیں اِس کے ساتھ بھاگ جاؤں؟''

مائیکل کھسیانا ہوکر بولا ''بھاگ جاؤ، مگر پچھتاؤ گی۔''

کھانے کے کئی کورس آئس کریم اور میٹھے پکوانوں کے ساتھ بمشکل ختم ہوئے تھے کہ اعلان ہوا:

''ایک گھنٹے بعد اِسی جگہ بوفے ڈنر ہوگا اور آپ کے لیے ایک زبردست سرپرائز۔ ایک گھنٹے بعد ضرور تشریف لائیں۔''

بیروں کا اصرار تھا کہ ضرور آئیں۔ ایک گھنٹے کے لیے تھیٹر میں جا بیٹھے جہاں ہال روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ عورتوں کے گاؤن جھلمل جھلمل کررہے تھے۔ زیادہ تر خواتین شام کے گاؤن میں تھیں مگر چند کے کپڑے اوپر سے ... نیچے اور نیچے سے بہت اوپر تھے۔ کیپٹن نے اپنے تمام ... کا تعارف کروایا۔ پھر سٹیج پر پتلی تماشا ہوا۔ اُس کے بعد ... بجا اور چند جوڑے ناچنے لگے۔ ہمیں سرپرائز دیکھنے کا ... تھا، اِس لیے اٹھ کر چلے آئے۔

کھانے کے کمرے میں پہنچے، تو سماں ہی دوسرا ... دروازے بند تھے۔ صرف سیڑھیوں سے نیچے اترنے کا بندوبست تھا اور ہر طرف پھلوں، سبزیوں اور برف کے مجسموں سے ایسی سجاوٹ کر رکھی تھی کہ آنکھیں چکا چوند ہو رہی تھیں۔ گویا ایک آرٹ گیلری تھی جس میں فریم شدہ ... فریم کی تصویریں نہیں بلکہ ترکاریوں اور پھلوں سے ... ہوئے گل دستے دیواروں پر سجے تھے۔ بڑے بڑے خوب صورت گل دستے میزوں پر رکھے تھے اور برف کی ... ٹوکریوں میں کٹے ہوئے پھل بھی آرٹ کا نمونہ نظر آ رہے تھے۔ بسکٹ، کیک اور سیکڑوں کھانے کی چیزیں بھی خوب صورتی سے سجی ہوئی تھیں۔

مَیں تصویریں لے رہی تھی کہ میری نگاہ آرلین پر پڑی جو ایک میز پر کچھ لوگوں کے ساتھ بیٹھی آئس کریم کھا رہی تھی۔

''تصویریں ہی لیتی رہوگی یا کچھ کھاؤ گی بھی؟'' اُس نے مجھ سے کہا۔

''ارے ابھی کھانا کھائے ہوئے دیر ہی کتنی ہوئی ہے۔ بالکل گنجائش نہیں۔'' مَیں نے کہا۔

''بڑے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ تم نے اپنے سفر کے آدھے پیسے بھی وصول نہیں کیے۔ اچھا اب کیا ارادہ ہے؟''

''اب اپنے کیبن میں جا کر سوئیں گے۔ صبح جلدی اٹھنا ہے۔''

''سونے کو تو ساری عمر پڑی ہے۔ کم از کم آج تو پول سائیڈ کا تماشا دیکھ لو۔ رات کو بڑی رونق ہوتی ہے وہاں۔''

''تمہارا میاں کہاں ہے؟''

''بے چارہ مائیکل تو وہیں پڑا مچھلیوں سے کھیل رہا ہے۔'' وہ ہنسی۔

''سوئمنگ پول میں مچھلیاں؟ ..... اچھا مَیں سمجھ گئی۔'' مَیں نے کہا۔

''سمجھ گئیں نا۔'' وہ خوب ہنسی۔ ''اب ایک بجے رات کو ہی لوٹے گا۔''

''تو تمہیں کوئی فکر نہیں۔''

''نہیں! وہ اپنی مرضی کا مالک ہے، مَیں اپنی..... اچھا یہ کیمرا اپنے میاں کو دے دو۔ وہ تصویریں لے لے گا اور میرے ساتھ غسل خانے تک چلو۔ کچھ باتیں کرتے ہیں۔ یہ آخری رات ہے جہاز پر۔''

وہ اپنا چھوٹا سا قیمتی پرس اٹھا کر میرے ساتھ ہولی۔ غسل خانے کے بڑے سے آئینے کے سامنے اپنا میک اپ درست کرتے ہوئے اُس نے کہا:

''تمہیں ایک راز کی بات بتاؤں۔ تم خوب ہنسو گی مگر کسی اور سے مت کہنا۔''

''اچھا کہو۔''

''یہ جو میرے ساتھ کالیا ہے، یہ میرا شوہر نہیں، بوائے فرینڈ بھی نہیں۔ کرایہ بچانے کے لیے ہم نے ایک کیبن لیا ہے۔ تمہیں تو معلوم ہے سنگل کا کرایہ کتنا زیادہ ہوتا ہے۔ پھر کینیڈا کا ڈالر بھی تمہارے امریکن ڈالر سے ہلکا ہے، اِس لیے ہمیں اور بھی مہنگا پڑتا ہے۔''

مَیں بالکل نہیں ہنسی۔ میری شکل دیکھ کر وہ قہقہے لگانے لگی۔

''ارے تم تو صدمے میں چلی گئیں۔''

''صدمے میں جانے کی بات ہی ہے۔ تم الگ کیبن کا کرایہ بھی دے سکتی تھیں، اگر زیور اور ہیرے جواہرات نہ خریدتیں۔''

''واہ! اِسی کے لیے تو مَیں نے پیسے بچائے اور مزہ بھی تو رہا۔ دیکھو پاگل نے مجھے پچاس سال کا بنا دیا جب کہ مَیں چالیس کی ہوں اور میری سال گرہ تو ابھی بہت دور ہے اور یہ مزہ دیکھو کسی سے کہتا ہے کہ ہماری شادی کو چار سال ہوئے ہیں، کسی سے کہتا ہے دس اور تم سے کہا، چودہ سال۔''

''اچھا تبھی!'' مَیں کسی اور خیال میں کھوئی ہوئی تھی۔

''تبھی کیا؟ ..... بتاؤ نا۔ مَیں نے تمہیں اتنا بڑا راز بتا دیا، اب تمہیں بتانا پڑے گا۔''

''بھئی مَیں نے مائیکل کو دیکھا تھا ذرا .....'' مَیں ہچکچائی۔

''ہاں ہاں کہو نا۔ کسی کے ساتھ لگا ہوگا۔ تو بھئی مجھے کیا، میرا میاں تو ہے نہیں۔ اور دیکھو نا رات کو ایک کیبن میں سوتے ہیں۔ ہم نے یہ معاہدہ کرلیا تھا کہ کوئی ہنکی پنکی نہیں ہوگی ..... اِس لیے ڈیڑھ دو بجے آکر چپ چاپ پڑ کر سو جاتا ہے۔ اب دن میں بے چارہ یہ بھی نہ کرے۔'' وہ پھر ہنسنے لگی۔

’’تو یہ بات ہے ..... اُس میں شراب کی رگڑ درمیان میں نہیں آتی۔‘‘ مَیں بھی خباثت پر اتر آئی۔

’’آ بھی سکتی ہے۔‘‘ اُس نے مجھے آنکھ ماری اور ہنستے ہنستے دہری ہوگئی۔ ’’کچھ باتیں کہنے کی نہیں ہوتیں۔ ویسے بھی جانتی ہو، مَیں بھی جانتی ہوں۔‘‘

اُس کی آنکھوں سے ہنسی کے مارے اتنے آنسو نکلے کہ دوبارہ میک اپ درست کرنا پڑا۔

مجھے ہنسی پھر بھی نہ آئی۔

مَیں خاموش رہی۔ ’’ارے بولتی کیوں نہیں، کچھ تو کہو۔‘‘ اُس نے مجھے ٹہوکا دیا۔

مَیں نے کہا ’’مَیں کیا بولوں۔ یہ بتاؤ اگر تم روز شراب خانے میں جا کر بیٹھی رہو اور کہو کہ مَیں پیتی نہیں، تو کون یقین کرے گا؟‘‘

’’مجھے کسی کو یقین دلانے کی ضرورت ہی نہیں۔‘‘ وہ بولی ’’میری اپنی مرضی ہے بس۔ اگر مجھے کسی ایسے شراب خانے میں بیٹھنا ہی پڑے جس کی شراب مجھے پسند نہ ہو، تو مَیں بیٹھی رہوں گی، پیوں گی نہیں۔‘‘

کھانے کا دھوکا

جب دِلّی اُجڑنے لگی اور مغلیہ سلطنت کا چراغ ٹمٹمانے لگا، تو دِلّی کے بڑے بڑے کاریگر لکھنؤ جا بسے۔ لیکن وہاں دِلّی والوں نے لکھنؤ والوں کے دانت کھٹے کر دیے۔ اِس سلسلے میں دِلّی کے ایک شہزادے مرزا آسماں قدر اور واجد علی شاہ کا ایک قصہ مشہور ہے۔

دِلّی کا یہ مغل شہزادہ لکھنؤ گیا، تو واجد علی شاہ کا مہمان ہوا۔ واجد علی شاہ کے دسترخوان پر ایک مربہ لا کر رکھا گیا جو دیکھنے میں بڑا خوبصورت لگتا تھا۔ گویا ابھی تازہ اور لذیذ بنا ہے۔ مغل شہزادے نے اُسے کھایا، تو چکرا گیا، کیونکہ وہ مربہ نہیں نمکین قورمہ تھا جس کی شکل مربّے کی تھی۔ یوں دھوکا کھا جانے پر شہزادے کو بہت خفت ہوئی۔

اُس نے بھی واجد علی شاہ کی دعوت کی۔ لکھنؤ کے بادشاہ یہ سوچ کر آئے تھے کہ آج دسترخوان پر اُن کے ساتھ بھی کچھ ہوگا، مگر وہ چوکنے رہنے کے باوجود دھوکا کھا گئے اور کھاتے چلے گئے۔

مغل شہزادے کے دسترخوان پر طرح طرح کے کھانے چُنے ہوئے تھے۔ واجد علی شاہ جس چیز کو چکھتے وہ میٹھی اور شکر کی بنی ہوئی تھی۔ سالن تھے، تو شکر کے، چاول اور پلاؤ تھے، تو شکر کے۔ روٹیاں، اچار اور چٹنی تک سب شکر کی۔ یہاں تک کہ برتن بھی شکر کے تھے۔ واجد علی شاہ گھبرا کر ایک ایک چیز پر ہاتھ ڈالتے اور دھوکا کھاتے چلے گئے۔

جھوٹ بولتی ہیں

سگمنڈ فرائیڈ سے ایک مرتبہ کسی نے پوچھا: ’’دنیا کی کتنے فی صد عورتیں شادی کی خواہش مند ہوتی ہیں؟‘‘

فرائیڈ نے جواب دیا ’’ننانوے فی صد!‘‘

پوچھنے والے نے دوسرا سوال پوچھا: ’’اور باقی ایک فی صد کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟‘‘

فرائیڈ نے مسکرا کر جواب دیا ’’وہ جھوٹ بولتی ہیں۔‘‘

سیاسیات — ابوصارم

ایران اور سعودی عرب کی قربت

۱۱ مارچ ۲۰۲۳ء کو دُنیا بھر کے اخبارات نے شہ سرخیوں میں یہ خبر شائع کی کہ چین کی ثالثی میں ایران اور سعودی عرب نے دوستانہ معاہدہ کر لیا ہے۔ اِس خبر نے دنیا بھر کے دارالحکومتوں میں ہلچل مچا دی اور جہاں دیدہ و تجربے کار سفارت کار گنگ رہ گئے۔ وجہ یہ ہے کہ پچھلے ستر سال سے امریکا مشرقِ وسطیٰ میں سپر پاور بنا ہوا ہے۔ مگر ایران اور سعودیہ جیسے سخت دشمنوں کے مابین معاہدۂ دوستی کروا کر چین نے گویا اعلان کر دیا کہ وہ بھی ایک عالمی طاقت بن چکا... ایسی سپر پاور جو اَب دیگر ممالک کی خارجہ پالیسی میں بھی انقلابی اور دُور رس تبدیلیاں لانے کی قدرت رکھتی ہے۔

چین نے دونوں اسلامی ممالک کے مابین معاہدۂ دوستی کرانے سے مغربی طاقتوں کو حیرت زدہ کر دیا

ایران اور سعودیہ نے ۲۰۱۶ء میں سفارتی تعلقات توڑ لیے تھے۔ تب سعودی حکومت نے شیعہ علما کو پھانسی دے ڈالی تھی۔ جواباً تہران میں ایرانی مظاہرین نے سعودی سفارت خانے پر دھاوا بول کر اُسے نقصان پہنچایا۔ یوں تعلقات خراب ہوتے چلے گئے۔ تب سے دونوں ممالک نے ایک دوسرے کے ہاں اپنے سفارت خانے بند کر رکھے ہیں۔

اس دوران یمن میں دونوں ممالک کے مابین خفیہ جنگ

چھڑ گئی۔ ایرانی حکومت حوثیوں کی حمایت کرنے لگی جو مخالف سُنی گروہوں سے نبرد آزما تھے۔ سعودیہ مخصوص سُنی گروہوں کی پشت پناہی کرنے لگا۔ اِس طرح یمن میں خانہ جنگی بڑھ گئی۔

اب ایران اور سعودیہ نے یمن میں خانہ جنگی بند کرانے پر اتفاق کیا ہے۔ نیز ایران نے وعدہ کیا ہے کہ وہ سعودی حکومت کی مخالف مسلح تنظیموں کی حمایت نہیں کرے گا۔ مزید براں اگلے دو ماہ میں وہ ایک دوسرے کے ہاں سفارت خانے کھول دیں گے۔ پاکستان سمیت تمام اسلامی ممالک میں اِس معاہدے پر خوشی و مسرت ظاہر کی گئی۔ ایران اور سعودیہ کے مُناقشے سے اتحادِ اسلامی کو سخت نقصان پہنچ رہا تھا۔ نیز فلسطین اور جموں و کشمیر کے دیرینہ مسائل کسی حد تک پسِ پشت چلے گئے تھے۔

اِس اہم دوستانہ معاہدے کی تکمیل میں روس نے بھی کردار اَدا کیا ہوگا۔ ایران، روس اور چین کا اتحادی ہے۔ جبکہ سعودیہ روایتی طور پر امریکا کا اتحادی سمجھا جاتا ہے۔ تاہم امریکی صدر بائیڈن کی آمد کے بعد امریکا اور سعودیہ کے مابین خاصی سرد مہری آ گئی ہے۔ یہ سرد مہری جنم لینے کی تین نمایاں وجوہ ہیں۔

اوّل یہ کہ امریکی صدر بائیڈن مقتول سعودی صحافی، جمال خشوگی کے قاتلوں کو سزا دِلوانا چاہتے ہیں۔ جبکہ سعودی ولی عہد، شہزادہ محمد بن سلمان کی خواہش ہے کہ امریکا اِس معاملے سے دور رہے۔ دوم امریکا چاہتا ہے کہ سعودیہ تیل کی پیداوار بڑھا دے تاکہ عالمی سطح پر تیل کی قیمتیں کم ہو سکیں۔ اِس کمی سے سب سے زیادہ نقصان روس کو ہوگا جو تیل بیچ کر یوکرین جنگ میں اپنے اخراجات برداشت کر رہا ہے۔ مگر سعودیہ نے انکار کر دیا۔ حال ہی میں سعودی تیل کمپنی، آرامکو کو اِسی لیے اربوں ڈالر کا ریکارڈ منافع ہوا ہے۔

سوم سعودیہ چاہتا ہے کہ امریکا اُسے جدید ترین ہتھیار فراہم کرے۔ نیز ایٹمی ٹیکنالوجی بھی دے تاکہ وہ ملک میں ایٹمی بجلی گھر قائم کر سکے۔ لیکن امریکی حکومت پہلے یہ چاہتی ہے کہ اُس کی مانگیں پوری کی جائیں۔

امریکا سے دوری کے باعث ہی ایران اور سعودیہ اب قریب آ رہے ہیں۔ یہ امر اتحادِ اسلامی کے لیے فائدہ مند ہے۔ اِس وقت اسرائیل نے فلسطین اور بھارت نے جموں و کشمیر میں مسلمانوں کو تختۂ مشق بنا رکھا ہے۔ اسرائیلی وزیرِ اعظم، بنجمن نیتن یاہو اور بھارتی وزیرِ اعظم، نریندر مودی، دونوں کا تعلق انتہا پسند اور قوم پرست جماعتوں سے ہے۔ یہ مسلمانوں پر ظلم و ستم کرنے میں ثانی نہیں رکھتے۔ اسلامی ممالک کے مابین اختلافات و جنگوں سے اُنھیں تحریک ملتی ہے کہ وہ فلسطینی و کشمیری مسلمانوں کو زیادہ ٹارگٹ کریں اور اُنھیں معاشی، سیاسی اور معاشرتی طور پر نقصان پہنچاتے رہیں۔

پچھلے ستر برس کے دوران امریکا نے ثابت کر دکھایا ہے کہ وہ عالمِ اسلام کی نسبت اسرائیل و بھارت کا زیادہ دوست ہے۔ اُس نے الٹا عراق، افغانستان، لیبیا اور صومالیہ پر حملے کر کے اِن اسلامی ممالک کا سیاسی و معاشی نظام تباہ و برباد کر دیا۔ اب وقت آ گیا ہے کہ عالمِ اسلام امریکا سے منہ موڑ کر نئی ابھرتی طاقتوں..... چین اور رُوس کے قریب ہو جائے۔ یہ دونوں طاقتیں عالمی سطح پر امریکا کی اجارہ داری کو چیلنج کرنے لگی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر ایک دوسرے سے معاشی مفادات وابستہ نہ ہوں، تو بحرالکاہل میں چین اور اَمریکا کی بحری افواج کے مابین ابھی جنگ چھڑ جائے۔ دراصل حال ہی میں امریکی حکومت نے تائیوان کو جدید ترین دو سو میزائل دینے کا اعلان کیا ہے۔ یہ میزائل تائیوانی ایف۔١٦ طیاروں میں نصب کیے جائیں گے۔ مقصد چینی طیاروں کو تائیوان پر حملہ کرنے سے روکنا ہے۔ مذید براں آسٹریلیا کو ایٹمی آبدوزیں فراہم کرنے کا بھی فیصلہ ہو چکا۔

اِس صورت حال سے چینی حکومت کافی طیش میں ہے۔ وہ اسے چین پر امریکا و تائیوان کا مشترکہ حملہ قرار دے چکی۔

امریکی میڈیا خبر دے رہا ہے کہ چین چوری چھپے روس کو ڈرون، میزائل اور دیگر ہتھیار فراہم کر سکتا ہے۔ یہ چینی اسلحہ یوکرین جنگ میں استعمال کیا جائے گا۔ اگر ایسا ہوا، تو چین اور اَمریکا کے درمیان کشیدگی میں اضافہ ہوگا۔ حال ہی میں روس نے ایک امریکی ڈرون گرا کر کشیدگی بڑھا دی ہے۔

امریکا نے چین کے خلاف سائنس و ٹیکنالوجی کی زبردست جنگ بھی چھیڑ رکھی ہے۔ امریکی حکومت کی سعی ہے کہ اِس کی کمپنیاں جو جدید ایجادات کرتی ہیں، خصوصاً موبائل فون ٹیکنالوجی کے سلسلے میں، اُن سے چین کی کمپنیاں استفادہ نہ کرنے پائیں۔ اِسی پالیسی نے چین کی کمپنی، ہواوے کو زوال پذیر کر دیا کیونکہ اب وہ اَپنے موبائل فونوں میں اینڈرائیڈ آپریٹنگ سسٹم استعمال نہیں کر سکتی۔

مزید براں امریکی اسٹیبلشمنٹ کی ایما پر امریکا کی بہت سی کمپنیاں بشمول ایپل چین میں اپنے کارخانے اور دَفاتر ختم کر رہی ہیں۔ یہ کارخانے دوست ممالک مثلاً بھارت، تائیوان، جاپان اور فلپائن منتقل کیے جا رہے ہیں۔ پاکستان بھی اِس موقع سے فائدہ اُٹھا سکتا تھا مگر چین سے گہری قربت کے باعث امریکی کمپنیاں ارضِ پاک کو اپنا مرکز بنانے سے گریزاں ہیں۔ مزید براں پاکستان میں بجلی اتنی مہنگی ہو چکی کہ نئے کارخانے کھولنا کٹھن مرحلہ بن گیا ہے۔

ماہرین خبردار کر رہے ہیں کہ امریکا کوئی نہ کوئی خفیہ چال چل کر ایران اور سعودیہ کا دوستانہ معاہدہ ختم کرانے کی بھرپور کوشش کرے گا۔ امریکا تیل سے مالا مال مشرقِ وسطیٰ میں اپنا اثر و رسوخ ختم ہوتا نہیں دیکھ سکتا۔ اُس کا مفاد اِسی میں ہے کہ ایران اور خلیجی ممالک کے درمیان تناؤ کی کیفیت رہے تاکہ اسرائیل کا بال بیکا نہ ہو سکے۔ عرب ممالک کی بزدلی اور بے رغبتی کے باعث ہی اسرائیلی اسٹیبلشمنٹ میں اتنی ہمت پیدا ہو چکی کہ اب وہ پولیس کو حرم شریف کے اندر بھیج دیتی ہے۔ وہاں اسرائیلی پولیس فلسطینی مسلمانوں پر لاٹھی چارج کرتی اور ربڑ کی گولیاں برساتی ہے۔

چین کے صدر، شی جن پنگ حال ہی میں تیسری بار عہدۂ صدارت پر فائز ہوئے ہیں۔ وہ بتدریج امریکا اور اِس کے ساتھی ممالک کے خلاف سخت رویّہ اپنا رہے ہیں۔ مثلاً اُنھوں نے جنرل لی شنگفو کو نیا وزیرِ دفاع مقرر کیا ہے۔ جنرل لی افواجِ چین کو جدید ترین ہتھیاروں سے لیس کرنے کے بھی حامی ہیں۔ اِسی لیے امریکی حکومت نے اُن پر مختلف قسم کی پابندیاں لگا رکھی ہیں۔ جنرل لی کے دور میں چین اور اَمریکا کے مابین عسکری کشیدگی میں اضافہ ہوگا۔

دوسری طرف بحرالکاہل میں امریکی فضائیہ کی فورس کے کمانڈر، جنرل کینیتھ ولزباخ نے چین کو خبردار کیا ہے کہ وہ اَپنے جنگی بحری جہاز تائیوان کے قریب لانے کی کوشش نہ کرے۔ اگر ایسا ہوا، تو امریکی طیارے بم برسا کر چینی جنگی جہاز غرق کر دیں گے۔

چینی صدر نے کچھ عرصہ قبل قن گانگ کو نیا وزیرِ خارجہ مقرر کیا ہے۔ وہ اَمریکا میں چین کے سفیر بھی رہ چکے۔ اُنھوں نے بہ حیثیت وزیرِ خارجہ اپنی پہلی پریس کانفرنس میں امریکی اسٹیبلشمنٹ کو خبردار کیا کہ وہ چین کو کسی قسم کا نقصان پہنچانے سے باز رہے۔ اُنھوں نے امریکی حکمران طبقے کو باور کرایا ''چین کو نقصان پہنچا کر امریکا کبھی عظیم مملکت نہیں بن سکتا۔''

حالات سے واضح ہے کہ دنیا میں تیزی سے سیاسی، جغرافیائی و معاشی تبدیلیاں آ رہی ہیں۔ صد افسوس کہ اِن تبدیلیوں کا بخوبی مقابلہ کرنے کے بجائے ہمارے سیاست داں ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما ہیں، صرف اِس لیے کہ اقتدار کے مزے لُوٹ سکیں۔ عوام کی فلاح و بہبود کس طرح ہو سکتی ہے، اب کوئی پاکستانی لیڈر شاذ و نادر ہی اِس بارے میں غور و فکر کرتا ہوگا۔ چنانچہ پاکستانی عوام بے سمت گھومنے والی بھیڑ بکریاں بن کر رہ گئے ہیں۔ ◆

مولانا محمد ناظم ندویؒ کا شمار برصغیر پاک و ہند کے اُن مشاہیر میں ہوتا ہے جنہیں اللہ نے علم و فضل کے ساتھ علوم دینیہ اور عصری علوم میں بھی مہارت عطا فرمائی تھی۔ آپ علی نگر،

لیکن ان کی جامعیت اور ثقافت کا تنوع ان کی تحریروں سے جھلکتا ہے۔"

مولانا محمد ناظم ندویؒ

علامہ سید سلیمان ندویؒ کے تیسرے قابل فخر شاگرد

ضلع مونگیر صوبہ بہار بھارت میں دسمبر ۱۹۱۳ء میں پیدا ہوئے۔ ۹ جون ۲۰۰۰ء کو کراچی میں وفات پائی۔ مناسب ہوگا کہ یہاں ان کے بارے میں ان کے زمانہ طالب علم کے ساتھی اور عالم اسلام کے عظیم مفکر و مورخ مولانا سید ابوالحسن ندوی کے مضمون کا ایک اقتباس پیش کروں::

''میرے احباب میں جن کے انس و اخلاص سے میری زندگی کی خوش گوار یادیں وابستہ ہیں، ان میں سے مولانا محمد ناظم ندوی کو عربی زبان و ادب اور نحو کی باریکیوں پر عبور حاصل ہے، ان کا خاص فن تو مفردات کی تحقیق اور اس کے شواہد کا علم ہے، اس باب میں ان کے اقوال [illegible] کی حیثیت رکھتے ہیں

مولانا محمد ناظم ندویؒ سید سلیمان ندویؒ کے اُن نا شاگردوں سید مسعود عالم ندوی اور مولانا ابوالحسن علی ندو (علی میاں) میں سے ایک تھے جنہیں لوگ علامہ سید سلیما ندوی کے ''ثلاثہ مثلثہ'' کے نام سے جانتے ہیں جن کا شمار ندوۃ العلماء کے ان اوّلین طلبہ میں ہوتا ہے جنہیں مراکش سے آنے والے استاذ علامہ تقی الدین ہلالی سے عربی زبان و اد میں تعلیم حاصل کرنے کا اعزاز حاصل ہوا تھا۔

مولانا محمد ناظم ندویؒ کو ندوہ میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہاں بطور استاذ اور بعدازاں ندوہ کے شیخ الجامعہ کے منصب پر فائز ہونے کا بھی اعزاز حاصل ہے۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کے بعد ندوہ کے شیخ الجامعہ کے منصب پر مولانا محمد ناظم ندویؒ فائز ہوئے تھے۔

مولانا محمد ناظم ندویؒ نے ہندو پاٹھ شالا اسکول سے میٹرک کرنے کے بعد بہار کے معروف دینی درس گاہ مدرسہ عزیزیہ سے درس نظامی مکمل کی اور اس کے بعد جامعہ ندوہ سے چار سالہ کورس مکمل کیا۔ واضح رہے جامعہ ندوہ سے فارغ ہونے والے طلبہ کی اسناد کو برصغیر میں سرکاری طور پر ایم اے کے مساوی درجہ حاصل ہے۔

مولانا محمد ناظم ندویؒ کو عربی زبان و ادب میں انشاء پردازی کے ساتھ عربی شاعری میں بھی بلند مقام حاصل تھا۔ اسی طرح انہیں اردو، فارسی اور انگریزی میں بھی کمال درجے کی دسترس تھی۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ کی شہرہ آفاق تصنیف ''خطبات'' (خطبات مدراس) کا عربی زبان میں ترجمہ کرنے کا اعزاز بھی مولانا محمد ناظم ندویؒ کو حاصل ہوا۔ ان کی دیگر عربی تصانیف ''باقۃ الازہار'' (گلدستہ، جو کہ زیادہ تر شعری و ادبی نثری ادب پاروں کا مجموعہ ہے۔) القصیدہ الرائیہ ہیں۔ ''اسلام میں عورت کا مقام'' ان کی ایک اہم تصنیف ہے جسے اہل علم کے ساتھ عوام و خواص میں بھی بڑی پذیرائی ملی۔ ان کی عربی شاعری میں ایک خاص چیز شاہ فیصل کی شہادت پر

کہی جانے والی عربی نظم کو بھی عالم عرب میں بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ اس کے علاوہ ان کے سیکڑوں کی تعداد میں اپنے مقالات ہیں جو انہوں نے پاکستان اور بیرون پاکستان انٹرنیشنل کانفرنس میں عربی، انگریزی اور اردو میں پڑھے تھے۔ ۲۴ اگست ۲۰۱۶ء کو دہلی یونیورسٹی سے شیخ احتشام الدین نے مولانا کی علمی، ادبی اور تدریسی خدمات پر مبنی ریسرچ پر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔

مولانا محمد ناظم ندویؒ ندوہ سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد ۱۹۳۴ء میں علامہ سید سلیمان ندویؒ کی ہدایت پر ڈابھیل (سورت) عربی ادب کے استاد کے طور تشریف لے گئے تھے جہاں علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا بدر عالم میرٹھی اور مفتی محمد شفیعؒ (مفتی اعظم پاکستان) پہلے سے درس و تدریس کی خدمات انجام دے رہے تھے۔ ۳۸-۱۹۳۷ء میں انہیں ڈابھیل سے جامعہ ندوہ واپس بلا لیا گیا جہاں پہلے بطور استاذ خدمات انجام دیں بعدازاں ان کا تقرر ندوہ کے سربراہ شیخ الجامعہ کے طور پر ہوا جہاں وہ قیام پاکستان کے بعد پاکستان منتقل ہونے تک فائز رہے۔ پاکستان آنے کے بعد کچھ عرصہ سعودی سفارت خانے میں بطور مشیر تعلیم خدمات انجام دیں۔ بعدازاں ان کا تقرر جامعہ عباسیہ بہاولپور کے شیخ الجامعہ کے طور پر ہو گیا جہاں ۱۹۶۲ء تک وہ اس منصب پر فائز رہے۔ کراچی یونیورسٹی سمیت کئی جامعات کے اساتذہ سلیکشن بورڈ کے ممبر بھی رہے۔

شیخ الجامعہ عباسیہ کے طور پر انہوں نے ۱۹۵۸ء کے اوائل میں اہل علم کی ایک کانفرنس بلائی تھی جس میں یہ تجویز پیش کی تھی کہ ہمارے دینی مدارس کو عصری علوم کو بھی اپنے نصاب میں اس طرح سمونا لازم ہو گیا ہے کہ جس کے بعد ان کا نظام تعلیم عصری تقاضوں سے ہم آہنگ بھی ہو جائے اور مدارس کی انفرادیت بھی برقرار رہے، اس طرف قدم بڑھائے بغیر اب کوئی چارہ نہیں ہے۔ اس کے لیے انہوں نے جامعہ

ندوۃ کی مثال دی تھی کہ ندوہ نے اپنے قیام کے ساتھ ہی اس کو اپنے نصاب کا حصہ بنالیا تھا۔ بعدازاں برسوں بعد اسی تجویز کو انہوں نے پروفیسر خورشید احمد صاحب کا اسلام آباد میں قائم کردہ ادارہ پالیسیز انسٹی ٹیوٹ کے زیر انتظام اپنے خطبۂ صدارت میں بھی پیش کی تھی۔ ۱۹۹۶ء میں مولانا علی میاں ندویؒ کے ساتھ ترکی کا دورہ اس وقت ترکی کے وزیر اعظم نجم الدین شیخ اربکان کی دعوت پر کیا تھا' اپنے دورے کے بعد انہوں نے ایک مضمون میں لکھا تھا کہ ''ترکی اپنے اصل کی طرف پلٹ رہا ہے اور بہت جلد یہاں دین کے احیا کا کام پوری قوت سے جلوہ گر ہوگا۔'' یاد رہے کہ وہ انٹرنیشنل عربی ادب نامی تنظیم سے بھی وابستہ تھے جس کا صدر دفتر سعودی عرب میں تھا اور مولانا ناظم ندوی اس تنظیم کے پاکستان چیپٹر کے صدر تھے۔

ان کے دور کو جامعہ عباسیہ کا اس اعتبار سے سنہری دور کہا جاتا ہے کہ انہوں نے جامعہ عباسیہ میں مختلف نکتۂ نظر رکھنے والے اہل علم کو جمع کیا جن میں لغات القرآن کے مؤلف علامہ عبدالرشید نعمانیؒ، مولانا احمد سعید کاظمیؒ اور دیگر اہل علم شامل تھے۔ ۱۹۶۲ء میں مدینہ میں قائم ہونے والی پہلی اسلامی یونیورسٹی میں بطور استاذ مقرر کیے گئے۔ مدینہ یونیورسٹی سے واپس آنے کے بعد کافی عرصے بہاولپور میں ہی مقیم رہے۔ بعدازاں انہوں نے کراچی آکر ملیر درخشاں سوسائٹی میں اپنا گھر تعمیر کرایا اور مستقل رہائش اختیار کرلی۔

مولانا محمد ناظم ندویؒ درس و تدریس کے میدان میں عربی زبان کی مشکل ترین معروف کتابیں مقدمہ ابن خلدون 'ہلال الاعجاز' اسرار البلاغہ' حجۃ البلاغہ وغیرہ کا درس اس طرح دیتے کہ مبتدی طلبہ بھی انہیں با آسانی سمجھ لیتے۔ وہ دس سال تک ان کتابوں کا درس دیتے رہے۔

کئی محقق … اکثر و بیشتر اہل علم اُن سے استفادہ کے لیے تشریف لاتے رہتے تھے اور وہ خندہ پیشانی سے تشنگانِ علم کی پیاس بجھاتے تھے۔ مولانا سید علی میاں ندویؒ جب بھی پاکستان تشریف لاتے تو اُن کی قیام گاہ پر ضرور تشریف لاتے۔

مولانا محمد ناظم ندویؒ کے آباؤاجداد کا روزگار زراعت کے شعبے سے تھا' اُن کے والد اشفاق احمد مرحوم نے انہیں میٹرک کے بعد درس نظامی کرایا اور بعدازاں ۱۹۲۸ میں ندوہ میں تعلیم کے لیے بھیجا۔ محمد ناظم ندویؒ اپنی والدہ کے سایۂ شفقت سے بچپن میں ہی محروم ہوگئے تھے۔ ان کے اپنے سگے بھائی اور ایک بہن تھیں۔ ان کے والد نے ان کی والدہ کے انتقال کے کئی سال بعد دوسری شادی کی۔

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ ۱۹۴۰ میں ندوہ تشریف لے گئے ان کے میزبان مولانا محمد ناظم ندویؒ ہی تھے۔ مولانا محمد ناظم ندویؒ درس و تدریس کی مصروفیت کے باعث عملی سیاست سے ہمیشہ کنارہ کش رہے تاہم سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ سے ان کا تعلق بڑا قریبی رہا۔ انہوں نے مولانا مودودیؒ کو جامعہ عباسیہ میں بھی خطاب کے لیے بلایا تھا۔ ۱۹۶۲ء میں سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی صدارت میں کراچی میں ''اسلامک ریسرچ اکیڈمی'' قائم ہوئی تو اس کا مولانا محمد ناظم ندویؒ کو نائب صدر بنایا گیا۔ وہ اس منصب پر اپنے انتقال تک فائز رہے۔

مولانا مودودی نے ایک سے زیادہ مرتبہ اس خواہش کا اظہار فرمایا کہ مولانا ناظم ندوی صاحب ہی 'تفہیم القرآن' کا

عربی میں ترجمہ کریں۔ یہ بات مولانا مودودی جیسے محتاط اور بلند مرتبہ اسلامی اسکالر کا مولانا ندوی پر اعتماد ایک ایسا اعزاز ہے جو عربی زبان وادب اور علم و فضل پر مولانا کے اعتراف کا بہترین مظہر ہے۔

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے انتقال کے وقت مولانا محمد ناظم ندویؒ نیویارک میں موجود تھے' انہوں نے وہاں سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی غائبانہ نماز جنازہ کی امامت کی اور بعدازاں نیویارک میں ایک بڑا تاریخی تعزیتی جلسہ ہوا جس کی صدارت مولانا محمد ناظم ندویؒ نے کی جب کہ مہمان خصوصی اُس وقت کے پاکستان کے وزیر خارجہ آغا شاہی تھے۔

مولانا محمد ناظم ندویؒ نے مولانا مودودیؒ پر کیے جانے والے اعتراض کا علمی انداز میں دفاع کرنے میں کبھی تامل نہیں کیا۔ مولانا محمد ناظم ندویؒ تحریک پاکستان کے ممتاز رہنما اور آل انڈیا مسلم لیگ کے اسسٹنٹ سیکرٹری جنرل مولانا ظفر احمد انصاری کے سمدھی بھی تھے۔ مولانا انصاری کے بڑے صاحبزادے ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاریؒ کی اہلیہ مرحومہ' مولانا محمد ناظم ندویؒ کی سب سے بڑی صاحبزادی تھیں۔ واضح رہے کہ ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری کا شمار بھی عالم اسلام کے بڑے محقق اور دانشوروں میں ہوتا ہے۔ مولانا محمد ناظم ندویؒ کے تین بیٹے اور چھ بیٹیاں تھیں۔ جن میں سے دو صاحبزادیوں اور بڑے صاحبزادے علی کاظم اللہ کو پیارے ہوچکے۔ سب سے چھوٹے بیٹے پروفیسر ڈاکٹر طیب عاصم (معروف آرتھوپیڈک سرجن) زمانہ طالب علمی میں اسلامی جمعیت طلبہ کراچی کی شوریٰ کے رکن بھی رہے جب کہ بڑے بیٹے محمد مبارک ظہیر بھی زمانہ طالب علمی میں اسلامی جمعیت سے وابستہ رہے اور اسلام آباد میں مقیم ہیں۔

مولانا علی میاں ندویؒ خواہ کتنے ہی مختصر وقت کے لیے پاکستان تشریف لاتے' وہ اپنے عزیز دوست مولانا محمد ناظم ندوی کے گھر آتے تھے جہاں مولانا کے دیگر احباب بھی جمع ہوتے تھے۔ مولانا محمد ناظم ندویؒ کے قریبی احباب میں قیام پاکستان سے قبل جامعہ ملیہ کے سربراہ ڈاکٹر ذاکر حسین (بعدازاں بھارت کے صدر مملکت) ان کے چھوٹے بھائی ڈاکٹر محمود حسین خان (سابق وزیر تعلیم پاکستان اور سابق وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی) سے بھی قریبی تعلقات تھے۔ ان کے قریبی احباب میں مولانا مودودیؒ' ابواللیث اصلاحی ندویؒ (سابق امیر جماعت اسلامی ہند) اور مولانا ظفر احمد انصاریؒ کے علاوہ قیام پاکستان کے بعد ابتدائی سالوں میں پاکستان میں متعین مصر کے سفیر ڈاکٹر عبدالوہاب عزام مرحوم' مولانا عبدالرشید نعمانیؒ' ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی مرحوم' حکیم محمود احمد برکاتی مرحوم' حکیم نصیر الدین ندوی (نظامی دواخانہ والے)' معروف شاعر و نقاد اور ماہنامہ فاران کے ایڈیٹر ماہر القادریؒ، شاہ حسن عطاؒ' ڈاکٹر الٰہی علوی (ڈاکٹر عارف علوی کے والد)' ڈاکٹر ظہور احمد اظہر' ملک کے ممتاز شاعر و ادیب' نقاد اور عربی زبان پر مکمل دسترس رکھنے والے ڈاکٹر خورشید رضوی' خالد اسحاق ایڈووکیٹ' اسماعیل احمد مینائیؒ' علامہ عبدالعزیز میمنؒ' پروفیسر ڈاکٹر رضوان احمد ندویؒ' علامہ خلیل عرب اور ان کی صاحبزادی عطیہ خلیل عرب شامل تھے۔

یہ بھی ایک حسن اتفاق ہے کہ علامہ سید سلیمان ندویؒ کی نواسی سمیرا کی شادی مولانا محمد ناظم ندویؒ کے نواسے یاسر ظفر اسحاق انصاری کے ساتھ ہوئی ہے۔

مولانا محمد ناظم ندویؒ نے ندوۃ العلما لکھنؤ' ڈابھیل (سورت) کے دارالعلوم جامعہ عباسیہ بہاولپور اور مدینہ منورہ کے اسلامک یونیورسٹی سمیت درس و تدریس کی خدمات کا دورانیہ کم و بیش نصف صدی سے زائد کا عرصہ ہے۔ جس میں ان سے براہ راست استفادہ کرنے والوں کی تعداد کسی طرح بھی ایک لاکھ سے کم نہیں بنتی۔

مولانا محمد ناظم ندویؒ سے جن حضرات کو ملنے اور ان کی

محفلوں میں بیٹھنے کے مواقع حاصل ہوئے ہیں وہ اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ وہ ایک عالم باعمل انسان تھے جو کبھی زہد و تقویٰ کے زعم میں مبتلا نہیں دیکھے گئے۔ اسی وجہ سے اُن سے ذاتی تعلقات نہ ہونے کے باوجود کسی مسئلے پر رہنمائی کے لیے اُن کے پاس حاضر ہوتے تو وہ بلا تکلف ان کا خیر مقدم کرتے اور رہنمائی فرماتے۔ اُن کی ایک خاص بات یہ بھی دیکھنے میں آئی کہ وہ اگر کسی وقت مسجد نہ جا پاتے تو گھر میں ہی باجماعت نماز کا اہتمام کرتے اگر ان کے مہمانوں میں کوئی غیر محرم نہ ہوتا تو گھر کی خواتین بھی باقاعدگی سے باجماعت نماز ادا کرتیں۔

جب اُن کے گھر پر ملک یا بیرون ملک سے کوئی مہمان تشریف لاتے تو عام طور سے نماز باجماعت کا اہتمام گھر پر ہی ہوتا۔ اسی طرح کی ایک بڑی تقریب جو مولانا علی میاں ندویؒ کی اعزاز میں ان کے گھر پر منعقد ہوئی اس میں شہر کی ممتاز علمی و دینی شخصیات جن مولانا ظفر احمد انصاری' اے کے بروہی' خالد اسحاق' ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی' کراچی کے بے شمار اہلِ علم اور اخبارات و جرائد کے ایڈیٹرز موجود تھے۔

مولانا محمد ناظم ندویؒ کے اہل خانہ اور خاندان کے دیگر افراد جن میں ان کے پوتے پوتیاں' نواسے نواسیاں شامل ہیں' وہ اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ جہاں وہ نظم و ضبط کے بڑے پابند انسان تھے وہیں وہ بچوں کے ساتھ نہایت شفیق تھے اور ان کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ بچوں کے ساتھ جتنا بھی وقت گزارتے ان کی دل چسپیوں سے محظوظ ہوتے رہتے اور جیسے ہی اذان کی آواز کانوں میں پڑتی تو بچوں سے کہتے، آؤ چلیں پہلے اللہ میاں سے باتیں کرلیں پھر ہم آپس میں باتیں کریں گے۔

مولانا محمد ناظم ندویؒ کے بہاولپور میں ایک پڑوسی جناب کمانڈر (ریٹائرڈ) نفیس احمد صاحب نے اس ناچیز کو بتایا کہ انٹرنیشنل یونیورسٹی مدینہ منورہ میں دو سال کی تدریس کے بعد جب مولانا محمد ناظم ندویؒ بہاولپور تشریف لائے تو ان کا قیام بہاولپور کے محلہ گل حسن میں رہا اور مسجد گل حسن میں ہی نماز ادا کرتے تھے۔ ایک دن اہل محلہ کی درخواست پر انہوں نے اسی مسجد میں درسِ قرآن کا سلسلہ شروع کیا جس میں شرکت کے لیے لوگ شہر کے دور دراز مقامات سے بھی آتے تھے۔

نفیس احمد صاحب نے بتایا کہ ایک دن عصر کے بعد مسجد میں چند احباب کے سامنے خطاب کے دوران مولانا محمد ناظم ندویؒ نے تفصیل کے ساتھ بیان کیا کہ ''اس کائنات میں قدرتی طور پر متحرک اجسام کا مدار (ORBIT) بیضوی ہے جیسے ایٹم کے اندر مرکزہ ہوتا ہے اور اس کے گرد الیکٹران بیضوی شکل کے مدار میں حرکت کرتے ہیں اور دوسری بات کہ الیکٹران کی حرکت گھڑی مخالف (ANTI CLOCK WISE) ہوتی ہے۔ بعینہ مسلمات خانہ کعبہ کے گرد طواف کرتے ہیں جو بیضوی ہوتا ہے اور یہ طواف گھڑی مخالف (ANTI CLOCK WISE) ہوتا ہے۔''

مولانا محمد ناظم ندویؒ کا خاندان' جن کی نسبت حضرت شہاب الدین سہروردیؒ سے ہے' عراق اور ایران کی ساحلی پٹی جسے عرفِ عام میں ''سنیوں کا علاقہ'' کہا جاتا ہے' وہاں سے ہندوستان آیا تھا۔ مولانا محمد ناظم ندویؒ کا ددھیال اور ننھیال دونوں ہی غیر منقسم ہندوستان کے صوبہ بہار میں آکر آباد ہوئے۔ مولانا محمد ناظم ندویؒ اکیلے ہی پاکستان تشریف لائے جب کہ ان کے دو بھائی اور ایک بہن ہندوستان میں ہی آباد رہے۔

مولانا محمد ناظم ندویؒ کا انتقال کراچی میں ہوا۔ آپؒ کراچی ائرپورٹ کے سامنے نئے قبرستان میں مدفون ہیں۔ ان کی ہمہ جہت شخصیت پر شاد عظیم آبادی مرحوم کے شعر کا یہ مصرع حرف بہ حرف صادق آتا ہے:

''ڈھونڈے گے اگر ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم''

بھارت میں پیاز فی کلو ا روپیہ

فصل کی زائد پیداوار نے اس سبزی کی قیمت گرادی..... حیرت انگیز حقائق

بھارت کی ریاست مہاراشٹر میں اِس سال پیاز کی زبردست پیداوار ہوئی ہے۔ یہ ریاست بھارت میں پیاز کا ۴۰ فی صد حصہ پیدا کرتی ہے۔ زبردست پیداوار کے باعث کسانوں کو خوش ہونا چاہیے تھا۔ مگر طرفہ تماشا یہ ہے کہ اِس باعث مارکیٹ میں پیاز کی قیمت گرگئی۔ کیونکہ طلب تو اتنی ہی رہی جبکہ منڈیوں میں بہت زیادہ پیاز آ گئی۔ کئی جگہ تو خریدار ملنے مشکل ہوگئے۔

ریاست کی بیشتر مارکیٹوں میں کسانوں نے محض ایک روپیہ فی کلو کے حساب سے اپنی پیاز فروخت کی۔ وجہ یہ کہ پیاز کو گلنے سڑنے سے بچایا جاسکے۔ بھارت میں خریف کی پیاز سات آٹھ دنوں میں گلنے لگتی ہے۔ مگر ربیع کی پیاز چھ ماہ تک صحیح سالم رہ سکتی ہے۔

پیاز کی قیمت ڈرامائی حد تک گرنے کے باعث کسانوں کو بہت مالی نقصان اٹھانا پڑا۔ اُنھوں نے شور مچایا، تو ریاستی حکومت نے پیاز کی فی من امدادی قیمت میں ۳۰۰ روپے کا اضافہ کردیا۔ اِس سے کسانوں کی کچھ تو مالی مدد ہوئی۔ تاہم بہت سے کسان خوش نہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ کم از کم امدادی قیمت

۵۰۰ روپے ہونی چاہیے تھی۔

اِس موقع پر بھارتی ماہرینِ زراعت کی مختلف آرا بھی سامنے آئیں۔ مثلاً یہ کہ اگر مودی حکومت کے زرعی قوانین لاگو ہو جاتے، تو منڈیوں میں ایکسپورٹر، سبزیاں پروسیس کرنے والے اور ہوٹلوں کے نمائندے موجود ہوتے۔ وہ پھر زائد مال خرید لیتے۔ یوں کسانوں کو اَپنی فصل کی نسبتاً بہتر قیمت مل جاتی۔ مگر سکھ کسانوں کے دباؤ پر مودی حکومت نے زرعی قوانین واپس لے لیے تھے۔

بھارت میں آلو، ٹماٹر اور دِیگر سبزیوں کی قیمتیں کافی کم ہیں۔ مثلاً فی الوقت آلو پانچ روپے کلو میں فروخت ہو رہا ہے۔ ٹماٹر کی قیمت بھی ۱۰ تا ۲۰ روپے کے درمیان رہتی ہے۔ کم قیمت کے باعث بھارتی کسانوں کو زیادہ منافع نہیں ہوتا۔ اِسی لیے اب بھارت میں یہ تحریک چل پڑی ہے کہ بھارتی کسانوں کو یہ اجازت دی جائے کہ وہ اَپنی پیداوار پاکستان ایکسپورٹ کر سکیں۔ مقصد یہ ہے کہ اُنھیں اپنی زرعی مصنوعات کی بہتر قیمت مل سکے۔

بھارتی زراعت کی ترقی میں مودی سرکار کا کوئی کردار نہیں بلکہ اِس کی ذمے دار بھارتی بیوروکریسی ہے۔ پچھلے تیس پینتیس سال کے دوران بھارتی افسرشاہی کافی منظم ہوئی ہے۔ وہ قانون و اُصول پر بھی عمل پیرا ہے۔ اِسی لیے بیوروکریسی کی پالیسیوں پر عمل ہو رہا ہے۔ چنانچہ سرکاری سروسز میں بہتری آ گئی۔ مثلاً سرکاری اسکولوں کی حالت بہتر ہوئی۔ سرکاری اسپتالوں میں علاج کا معیار بڑھ گیا۔

کسانوں کو بھی وفاقی اور ریاستی حکومتیں بیج، کھاد اَور بجلی سستی فراہم کرتی ہیں۔ اُنھیں پانی بھی وافر دستیاب ہے۔ اِس باعث بھارت میں زراعت پھل پھول رہی ہے۔ اشیائے خورد نوش وافر پیدا ہوتی ہیں۔ یوں اُن کی قیمتیں کم [illegible] بھارت میں عام آدمی کی غذائیں مثلاً گندم، دالیں، دودھ، چکن، مسالہ جات، سیب اور کیلا کم قیمت پر مل جاتی ہیں۔

ایک طرف بھارت میں کسان پیاز کی قیمت خوفناک حد تک گرنے پر پریشان ہیں، تو دوسری طرف فلپائن میں اِس سبزی کی قیمت آسمان پر جا پہنچی۔ ہوا یہ کہ رواں سال فلپائن میں پے در پے سمندری طوفان آئے۔ اُنھوں نے پیاز ہی نہیں دیگر سبزیوں کی فصلوں کو بھی نقصان پہنچایا۔ یوں منڈیوں میں پیاز کی قلت ہو گئی۔

دوسری آفت یہ آئی کہ فرڈیننڈ مارکوس جونیئر حکومت نے پیاز امپورٹ کرنے میں کوتاہی برتی۔ تیسری دنیا کے اکثر ممالک کی طرح فلپائنی حکمران طبقہ بھی اپنے ذاتی مفادات پورے کرنے اور عیش و آرام سے زندگی گزارنے میں مصروف رہا۔ اِس سُستی و لاپروائی کا نتیجہ یہ نکلا کہ دسمبر ۲۰۲۲ء تک پیاز کی قیمت فی کلو سات سو پیسو تک جا پہنچی۔ پاکستانی کرنسی میں یہ رقم تقریباً ساڑھے تین ہزار رُوپے بنتی ہے۔

پاکستان و بھارت کی طرح فلپائن میں بھی پیاز کھانوں میں عام استعمال ہوتی ہے۔ لہٰذا پیاز اِنتہائی مہنگا ہونے پر عوام نے شور مچایا، احتجاجی مظاہرے کیے، تو فلپائنی حکومت ہوش میں آئی۔ اُس نے پھر ڈیڑھ لاکھ ٹن پیاز بھارت سے امپورٹ کیا، تو ملک میں اِس سبزی کی قیمت کچھ کم ہوئی۔ اب بھی وہ پچھلے سال کے مقابلے میں تین گنا زیادہ قیمت پر مل رہی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مختلف عوامل کی بنا پر دنیا بھر میں خوراک مہنگی ہونے کا زبردست بحران آیا ہوا ہے۔ اُن عوامل میں آبادی میں تیزی سے اضافہ، پانی کی کمی، زرعی زمینوں کا ہاؤسنگ سوسائٹیوں میں بدل جانا، بیج و کھاد مہنگی ہونا، آب و ہوائی تبدیلیاں، سیلاب و قحط، آبادی میں اضافہ، روس یوکرین جنگ اور کھیتوں کے رقبے میں کمی آنا نمایاں ہیں۔

غذائیں مہنگی ہونے سے غریب و متوسط طبقہ سب سے زیادہ متاثر ہے۔ خاص طور پر اُن ملکوں میں جو غربت، جنگ یا خانہ جنگی کا نشانہ بنے ہوئے ہیں۔ مثلاً شام، یمن، افغانستان، صومالیہ وغیرہ۔ اِن ممالک میں غریبوں کو خوراک فراہم کرتے ہوئے عالمی امدادی اداروں کو شدید مشکلات کا سامنا ہے۔ اکثر جگہوں پر ضرورت مندوں کو بس اتنی غذا مل رہی ہے کہ جسم و روح کا رشتہ برقرار رہے۔

آب و ہوائی تبدیلیوں، روس یوکرین جنگ یا دیگر وجوہ کی بنا پر اب تقریباً ہر ملک کسی نہ کسی غذا کی شدید قلت کا شکار ہے۔ مثلاً کچھ عرصہ قبل امریکا میں انڈوں کی زبردست قلت نے جنم لیا۔ تب ایک درجن انڈے ساڑھے چار ڈالر میں فروخت ہوئے۔ پاکستانی کرنسی میں یہ رقم تقریباً ساڑھے بارہ سو روپے بنتی ہے۔

ماہرین کے مطابق برڈ فلو پھیلنے سے اَمریکا میں انڈے دینے والی ہزارہا مرغیاں مر گئیں۔ یوں انڈوں کی قلت پیدا ہو گئی۔ بعد ازاں انڈے فروخت کرنے والی کمپنیوں نے کارٹل بنا لیا۔ وہ خفیہ طور پر ساز باز کر کے انڈوں کی قیمت بڑھانے لگیں تاکہ منافع بڑھایا جا سکے۔ یوں انسان کے لالچ نے بھی اپنا رنگ جمایا اور اَمریکی عوام کو اَنڈوں کی زائد قیمت ادا کرنا پڑی۔

برطانیہ بھی پچھلے ایک ڈیڑھ سال سے آب و ہوائی تبدیلیوں کی زد میں ہے۔ پہلے وہاں طویل عرصہ بارشیں نہ ہوئیں۔ چنانچہ دریا اور جھیلیں سُوکھ گئیں۔ کھیتوں کو پانی نہ ملا، تو فصلیں بھی برباد ہوئیں۔ اِس طرح برطانیہ میں سبزیوں اور پھلوں کی قلت ہو گئی۔ خاص طور پر ٹماٹر اور سلاد میں استعمال ہونے والی سبزیاں ایک سال پہلے کی نسبت دو تین گنا زیادہ مہنگی ہو گئیں۔

اُدھر شمالی کوریا سے خبریں آ رہی ہیں کہ رواں سال آب و ہوائی تبدیلیوں کے سبب اشیائے خورونوش کی پیداوار کم ہوئی ہے۔ لہٰذا دُنیا بھر سے کٹی اِس مملکت میں غذاؤں کی شدید قلت جنم لے چکی۔ اقوامِ متحدہ اور جنوبی کوریا کے ماہرین کا خیال ہے کہ شمالی کوریا کے بعض حصوں میں لوگ بھوک سے مر رہے ہیں۔ یاد رَہے، شمالی کوریا صرف چین سے خوراک منگواتا ہے۔ مگر چین خود معاشی مسائل اور خوراک کی کمی کا شکار ہے۔ اِسی لیے وہ شمالی کوریا کو مطلوبہ مقدار میں غذا فراہم نہیں کر رہا۔ اِس خرابی نے شمالی کوریا میں غذائی بحران مزید گھمبیر بنا دیا۔

حالات سے آشکارا ہے کہ بھارت کو چھوڑ کر دنیا کا تقریباً ہر ملک غذائی کمی کے بحران سے نبرد آزما ہے۔ صورتِ حال متقاضی ہے کہ ہر حکومت زراعت کو ترقی دینے کے لیے ٹھوس اقدامات کرے۔ تیز رہائش کی کمی کا مسئلہ سنگاپور کے مانند بلند و بالا فلیٹس تعمیر کر کے حل کیا جائے۔ اگر دنیا بھر میں زراعت زوال پذیر رہی، تو بنی نوع انسان کو مستقبل قریب میں خوراک کے خوفناک بحران کا مقابلہ کرنے کی خاطر تیار رَہنا چاہیے۔ بھوک بڑی خطرناک شے ہے، یہ اچھے بھلے انسان کو حیوان سے بھی بدتر بنا سکتی ہے۔ حکمران طبقہ اور اَشرافیہ خبردار اَور چوکنا رہے۔

آڑو اَور خوبانی

ایک انگریز نیا نیا پاکستان آیا۔ بازار میں ٹہل رہا تھا کہ اُس کی نظر ایک پھل والے کی ریڑھی پر پڑی۔ پاس جا کر اُس نے پھل والے سے پوچھا "ویل! یہ کیا ہے؟"

پھل والا بولا "جناب! یہ آڑو ہے۔"

انگریز نے کہا "ہمارے ملک میں اِس سے بہت بڑے آڑو ہوتے ہیں۔ یہ تو بہت چھوٹا ہے۔"

پھر خربوزے کی طرف اشارہ کر کے پوچھا "یہ کیا ہے؟"

پھل والا بولا "یہ ہمارے ملک کی خوبانی ہے۔"

راولپنڈی کی بچن نواس

ایک تاریخی عمارت کا دلچسپ تذکرہ جہاں پاکستان کے صدر اور وزیر اعظم بھی قیام پذیر رہے

تعمیرات —— بریگیڈیئر (ر) محمد اسمٰعیل صدیقی

بچن نواس ہندی کے دو الفاظ کا مرکب ہے۔ ''بچن'' کا مطلب ہے: قول، بات، گفتگو، کلام، عہد و پیمان، شگون۔ ''نواس'' کے معنی ہیں: رہنا، رات گزارنا، رہنے کی جگہ، مکان، گھر، شب باشی کا مقام۔

اب آپ تشریح سے بچن نواس کا مناسب مطلب خود مرتب کرلیں۔ بہرکیف یہ بات تو عیاں ہے کہ مالک اور مکین اِس جگہ کے نام کا مطلب اِنھی الفاظ سے اخذ کرنے کے متمنی رہے ہوں گے۔

''بچن نواس'' راولپنڈی چھاؤنی کی ایک تاریخی اور اہم ترین عمارتوں میں سے ایک ہے۔ یہ مال اور جہلم روڈ کے سنگم میں کئی کنال پر پھیلے رقبے پر تعمیر شدہ ہے۔ پاکستان بننے سے پہلے دو سکھ بھائیوں، سوہن سنگھ اور موہن سنگھ کی ملکیت تھی۔

دراصل پنجاب میں انگریزوں کی آمد اور ۱۸۴۹ء سے پہلے راولپنڈی اور اُس کے گرد و نواح بلکہ لاہور سے پشاور تک کا علاقہ سکھوں کی حکومت کا حصہ تھا۔ یہاں بھی راجواڑے حکمران تھے۔ جبکہ راولپنڈی سکھوں کا فوجی مرکز ہوا کرتا۔ وہ یہاں سے ہی شمال اور مغرب میں اپنی فوجی مہمات ترتیب دیا کرتے تھے۔

انگریزوں نے جب مارچ ۱۸۴۹ء میں یہ علاقہ فتح کیا اور یہاں ایک اپنی فوجی چھاؤنی قائم کرنے کا سوچا تو انھوں نے لال کرتی اور اِس نوع کے دوسرے علاقے اپنی رعایا کو اِن شرائط پر سونپ دیے کہ آپ لوگ یہاں مکان بنائیں، زمینیں اور علاقے آباد کریں۔ اگرچہ زمین تو مفت عطا کی، اُسے فری ہولڈ (مفت عطا کردہ) کہا جاتا تھا لیکن کچھ شرائط کے ساتھ جن پر روشنی ڈالنا اِس وقت مقصود ہے۔

چھاؤنی کی کچھ زمین ۹۹ سال کی لیز پر دی گئی۔ یعنی ۹۹ برس کے بعد اگر لیز کی دوبارہ تجدید نہیں ہوتی، تو حکومتِ انگلشیہ اُسے مارکیٹ کی شرح پر (بشرط لیز کا وقت باقی ہو) دوبارہ حاصل کرسکتی تھی۔ اِس کے مقابلے پر وہ زمین جو اُنھوں نے فری ہولڈ کے تحت برائے آبادکاری عطا کر رکھی تھی، اُسے جب چاہے، بلا معاوضہ لے سکتی تھی۔

انگریزوں نے چھاؤنی میں رہائش اور قیام کے لیے بیس بیس کنال پر مشتمل بنگلہ جات تعمیر کرنے کے لیے لیز پر زمین دی۔ اور وہاں جن لوگوں نے بنگلے تعمیر کیے، اُنھیں انگریزوں نے ۱۲۰ روپے ماہوار کرائے پر مستقلاً حاصل کرلیا تھا۔ اب مارکیٹ کی شرح جو ہو، سو ہو، وہ صرف مجوزہ رقم دینے کے پابند ہوتے تھے۔ اِس میں اور کیا تحفظات تھے، وہ اِس مضمون کے احاطے سے باہر ہیں۔

یہ سب کچھ بتانے کا پہلا مقصد تو یہ ہے کہ چھاؤنی میں واقع بیشتر بنگلوں پر ملکیت کے لحاظ سے یا تو اُن دو بھائیوں، سوہن سنگھ اور موہن سنگھ یعنی سابقہ رجواڑوں کے نام کے بورڈ لگے ہوتے تھے یا پھر ایک بوہرے سیٹھ آدم جی کے! ان کے علاوہ خال خال کچھ اور افراد کے نام بھی تھے۔

یوں یہ سکھ برادران صرف ملکیتِ جائیداد کے لحاظ سے انگریزوں کی راجدھانی میں ایک خوشحال، متمول، اہم اور بلا حکومتی اختیارات کے چھوٹے موٹے راجواڑے بن گئے۔

اب آیئے دوبارہ بچن نواس کی جانب۔

۱۹۱۱ء کے لگ بھگ سلطنتِ برطانیہ کے پرنس آف ویلز یعنی سلطنتِ برطانیہ کے اگلے بادشاہ اپنی مملکت ذی شان جسے وہ برطانوی تاج کا ہیرا کردانتے تھے، اُس خطۂ سلطنت کو قدوم میمنت لزوم سے نوازنے تشریف لائے۔ اُن کے پروگرام میں دو تین روز کے لیے راولپنڈی جیسے اہم فوجی مستقر میں جہاں انگریز بہادر کا ناردرن ہیڈکوارٹر بھی قائم دائم تھا، ٹھہرنے کا پروگرام تھا۔

بقول مشہور مصنف اور مزاح نگار میجر جنرل شفیق الرحمٰن جو اِس امر کے راوی ہیں، اُن کے مطابق ''بچن نواس'' جیسی قیام گاہ اُن کی سہ روزہ رہائش کے لیے تعمیر کی گئی تھی۔ غالباً اِسی حوالے سے اُسے ''بچن نواس'' کے نام سے موسوم کیا گیا۔

خیر پرنس آف ویلز آئے، ٹھہرے اور چلے گئے۔ اُن کے جانے کے بعد سکھ برادران کو وہاں رہنے کا شرف حاصل ہوگیا۔ تب یہی دستورِ زمانہ ہوا کرتا تھا۔

جن لوگوں کو پاکستان کے قیام سے پہلے وہاں کسی طور جانے کا موقع ملا، وہ اِس عمارت کے اندرون و بیرون سے اچھی طرح واقف رہے ہوں گے۔ یہ ہر لحاظ سے کسی چھوٹے موٹے شاہی محل سے کم نہ تھی۔ قطعاتِ چمن نوع نوع کے پھولوں بالخصوص رنگ برنگے گلابوں سے مزین تھے۔ ہر قسم کے پھلوں کے پودے وہاں لگے تھے۔

باغ کے اندر چھوٹی سی نہر ہوتی تھی۔ آبشار بھی جس کے عقب میں گھومتی رنگین روشنیوں کا انتظام تھا۔ جب وہ چلتی تھیں، تو آبشار میں روشنیاں اِس طرح پھوٹتی کہ دیکھنے والے مبہوت ہو کر رہ جاتے۔ باغ میں ہی ایک مکینیکل گھوڑا گھر کے گھڑسواروں کی تربیت کے لیے استادہ تھا۔ یہ مکینیکل گھوڑا تیز چلتا تھا، دُلکی چال بھی، بگٹٹ بھی دوڑتا۔ دائیں بائیں بھی ہوسکتا تھا، حتیٰ کہ دولتی بھی جھاڑتا تھا۔ یوں وہ گھر بیٹھے اپنے سوار کو تربیت مہیا کرتا تھا۔

چمن میں جگہ جگہ سنگِ مرمر کی مسندِ آرام میسر تھیں۔ ایک حصے میں بچوں کے کھیلنے کے لیے پلے لینڈ بنے تھے۔ قسم قسم کے درخت تھے۔ اُن پر مختلف نوع کی بیلیں چڑھی ہوئی

تھیں، پھول دار بھی اور طرح دار بھی۔ حتیٰ کہ ربڑ پلانٹ بھی تھے جو تب تک اُس علاقے میں ناپید تھے۔ حالانکہ اب تو شاید ہی کوئی گھر ہو، جو اِس سے آشنا نہ ہو۔

گھر کا اندر تو اَپنے طور پر کارخانہ عجائب تھا۔ مکان کے ڈیزائن سے اُس کی تزئین و آرائش تک ہر ایک جگہ منفرد، کیا فرش، کیا ستون، کیا الماریاں، کیا اُن کے خفی اور جلی خانے۔ اور پھر اُن میں ویسی ہی نادر و نایاب اشیاء، مشروبات اور ماکولات سے لے کر زر و جواہر کو اَپنے اندر سموئے ہوئے۔ ایک سے ایک بڑھ کے البمیں، جن سے اُن کے مکینوں کے رہن سہن، حال حلیے، ملبوسات اور مصروفیات کا علم ہوتا تھا۔ دیکھنے والوں کو یقین نہیں آتا تھا کہ یہ سردارنیاں ہیں یا انگلش ہیں۔

ہر کمرا اَپنی جگہ نہ صرف ایک عجوبہ خوش رنگ بلکہ اپنے مکین کے ذوق و شوق کی منہ بولتی تصویر تھا۔ اور ہوتا بھی کیوں نہیں کیونکہ وہ لوگ بڑے دولتمند تھے۔ اُن کا یورپ انگلستان اکثر آنا جانا لگا رہتا تھا۔ صاحبِ ذوق بھی تھے، اِس لیے اپنے لیے راحت و تسکین کا ہر سامان مہیا کر رکھا تھا۔ اور وہ سب کچھ جس کی کوئی اِس دنیا میں خواہش کر سکتا تھا لیکن جب انسان عروج پر ہو، تو وہ صرف اوپر کی طرف ہی نظر رکھتا ہے۔ اُسے کبھی یہ خیال دور دُور تک نہیں آتا کہ جس ذاتِ باری تعالیٰ نے یہ سب کچھ عطا کر رکھا ہے، وہ کبھی اُسے واپس بھی لے سکتی ہے۔ کیونکہ وہ ہمیشہ یہی سوچتا اور کہتا ہے ایسا کیونکر ہو سکتا ہے؟ لیکن ایسا ہوتا ہے، ہو کر رہتا ہے اور ہوا۔

کیا کبھی ایسے لوگوں میں سے کسی کے ذہن میں یہ بھی بفرضِ محال آیا ہوگا کہ ایک دن تقسیمِ ہند ہوگی؟ پاکستان بنے گا اور اُنھیں یہ سب کچھ یہاں ہی چھوڑ کے کہیں اور رُخصت ہونا پڑے گا؟

پاکستان وجود میں آیا، تو بچن نواس میں آباد سکھ خاندان کو اپنے سب سامانِ عیش و عشرت سے ہاتھ دھونے پڑ گئے۔ یوں تو اکثر جان پہچان والوں کے بارے میں کبھی کبھار ذہن میں آجاتا ہے کہ وہ کہاں ہیں، کس حال میں ہیں، اُن کی زندگی کس طرح گزر رہی ہے۔ لیکن ان برادران کے بارے میں کچھ پتا نہیں، کم از کم ہمیں تو نہیں۔

پاکستان وجود میں آنے کے بڑے ہی مختصر وقفے بعد کشمیر کی کشمکش شروع ہوگئی۔ ساتھ ہی قبائلی پٹھان کشمیر اپنے بھائیوں کی مدد کے لیے آ پہنچے۔ اُن کی آمد و رفت تو ایک الگ موضوع ہے۔ لیکن اُن کا اِس موضوع سے قدرے تعلق ہے۔

جب یہ قبائل لوٹنے لگے، تو راولپنڈی اُن کی واپسی کی رہ گزر میں پڑتا تھا۔ اور اللہ معلوم اُنھوں نے ''بچن نواس'' کے بارے میں کس سے سنا کہ اُنھوں نے راستے میں اِسی عمارت سے استفادہ کرنے کی ٹھان لی اور وُہ وَہاں پہنچ گئے۔ خوب لُوٹ مار کی، جو کچھ اُٹھا کر ساتھ لے جا سکتے تھے، اُسے مالِ غنیمت یا مالِ مفت سمجھ کر ساتھ اٹھا لے گئے۔ بڑے بڑے کمروں میں وال ٹو وال یعنی دیوار تا دیوار قالین تھے۔ اُنھیں وہ اِسی طرح اٹھا کر نہیں لے جا سکتے تھے، اِس لیے اُنھوں نے خنجر نکال کر اُن کے ٹکڑے ٹکڑے کیے اور ساتھ لے گئے۔

اِس ڈاکے کے علاوہ اُنھوں نے لال کرتی میں ایک ہندو ڈاکٹر ایل سی رام کی دکان بھی لُوٹی۔ (یہ صاحب تقسیم کے بعد پاکستان میں رہ گئے جبکہ خاندان کے افراد بھارت چلے گئے تھے۔ کچھ سال بعد وہ چل بسے۔) اُس کی دوسری دکان صدر میں واقع تھی جو لُٹنے سے بچ گئی۔ یہ اُن معدودے چند ہندو افراد میں سے تھے جو یہاں سے نہیں گئے۔ لیکن عجیب اتفاق کہ بچن نواس کو لُٹنے کی افتاد سے ایک بار پھر گزرنا پڑا۔ اب یہ تو یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ اِس بار لُوٹنے والے کیا لے گئے اور کیا چھوڑ گئے۔ بہرکیف اِس مسکن کو ایک دن حکومتِ پاکستان نے اپنی تحویل میں لے لیا۔ اب اِسے مختلف ادوار اور مکینوں سے واسطہ پڑا۔

ایک روایت کے مطابق (جس کے راوی ڈاکٹر محمد باقر تھے جو مترجم اور اَفسر مہمان داری تھے)۔ ۱۹۴۸ء میں جب شاہِ ایران نے اوّلین سربراہِ حکومت کے طور پر پاکستان کا دورہ کیا، تو اُنھیں بھی یہاں قیام کرنے کا موقع ملا۔ کہا جاتا ہے وہ اِس عمارت اور اِس کی آرائش و زیبائش سے انتہا درجے محظوظ ہوئے۔ کئی بار حیرانی کا اظہار کرتے ہوئے کہا، یہ سامان کہاں کہاں سے جمع کیا گیا ہے؟ تب تک ایران تیل کی دولت سے مالا مال نہیں ہوا تھا۔ شاہِ ایران شہنشاہ آریہ مہر کی شان نہیں حاصل کر پائے تھے۔

آئندہ آنے والے دور میں یہاں مختلف وزرا، زعماء نے قیام کیا۔ مثلاً نواب مشتاق احمد گورمانی بطور وزیرِ اُمورِ کشمیر، نواب زادہ میجر جنرل شیر علی خان، جی معین الدین، علیٰ ہذا القیاس۔ ایک غیر مصدقہ خبر یہ بھی رہی کہ نواب زادہ شیر علی خان نے اپنی آبائی جائیداد کے عوض اِس عمارت کے لیے دعویٰ (claim) داخل کروا کے اِسے لینے کی کوشش کی تھی مگر کامیاب نہیں ہوئے۔

جہاں تک گورمانی صاحب کا تعلق ہے، تو اُن کی وزارت کا دفتر اِسی خانوادے کی ایک اور کوٹھی المعروف ''شاہزادہ کوٹھی'' میں ہوا کرتا تھا جو بچن نواس کے قریب ہی ضلع کچہری کے ساتھ تھی۔ یہ عمارت اب گرائی جا چکی۔ اِس کوٹھی کی باقیات میں سے کچھ کھجور کے درخت اور ایک نشست گاہ (اب وہ بھی نہیں) کو سڑک پر سے گزرتے دیکھا جا سکتا تھا۔

بچن نواس مختلف ادوار سے گزرتا ہوا ایک بار پھر اپنی

ہر کمرا اَپنی جگہ نہ صرف عجوبہ خوش رنگ بلکہ اپنے مکین کے ذوق و شوق کی منہ بولتی تصویر تھا

عظمتِ رفتہ کی جانب لوٹا۔ جب بھٹو صاحب کی حکومت کا دور آیا، تو اُنھوں نے صدرِ پاکستان کے قصرِ صدارت کی خاطر بچن نواس کا انتخاب کیا۔ فوراً نہ صرف اِس جگہ کی تزئین و آرائش کا اہتمام کیا گیا بلکہ اِس کے سامنے والی ایک چھوٹی سی سڑک جو مال اور جہلم روڈ کو ملاتی تھی، اُسے اور اُس کے اردگرد کے تمام بنگلوں کو شامل کر کے قصرِ صدارت کی نیو ڈالی گئی۔ یہی عمارت برسہا برس تک اِس مقصد کے لیے استعمال ہوتی رہی جس میں جنرل ضیاء الحق کا دورِ اقتدار بھی شامل تھا۔ اہلِ راولپنڈی کے لیے وہ وقت اور نظارہ توجہ طلب ہوتا جب

سفید گھوڑوں والی بگھی پر مختلف سفراء اپنی اپنی سندِ سفارت پیش کرنے اس عارضی قصرِ صدارت میں داخل ہونے کے لیے مال پر سے گزرتے تھے۔

کچھ برسوں بعد اس تزک و احتشام کا دور بھی اختتام کو پہنچا۔ حتیٰ کہ نئے دور میں شیخ رشید احمد وزیر اطلاعات و نشریات کی مساعی سے وہاں ملک کی پہلی خواتین یونیورسٹی قائم کی گئی جسے "فاطمہ جناح یونیورسٹی برائے خواتین" کا نام دیا گیا۔ بعض زعما نے اکثر ایسے اعلان کیے تھے کہ ہم قصر صدارت کو یونیورسٹی میں بدل ڈالیں گے۔ وہ تو یہ کارنامہ انجام نہ دے سکے کیونکہ 'ایں سعادت بزور بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ' اور اب وہاں یونیورسٹی پھل پھول رہی ہے۔

بچن نواس کے قصے میں ایک لطیف اور پُرلطف واقعہ بیان کر کے داستان یہاں سمیٹیں گے۔ یہ واقعہ تب کا ہے جب چودھری فضل الٰہی اس عمارت میں بطور صدر پاکستان متمکن تھے۔ ایک دن لوگوں نے دیکھا کہ اس پُرحصار عمارت کی بیرونی دیوار پر یہ نعرہ درج تھا: "چودھری فضل الٰہی کو رہا کرو۔"

بظاہر اُن کی صدارت ایسے ہی گئی تھی۔ اللہ جانے کون ستم ظریف یہ لکھ گیا۔ بہرکیف اس پر کوچی پھیر دی گئی لیکن یہ سلسلہ جاری رہا۔

اُنہی دنوں یہ لطیفہ سامنے آیا۔ ایک رات سکیورٹی والوں نے ایک کمبل پوش شخص کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیا جو اس حرکت ناپسندیدہ کا مرتکب ہو رہا تھا۔ دیکھا تو وہ چودھری صاحب بذات خود تھے۔

منافقت سے کام لو

میسولینی کی کار خراب ہونے کے باعث اُسے ایک قصبے میں رکنا پڑا۔ اس نے کار وہیں روکی اور قریبی سینما میں داخل ہو گیا۔ فلم کے خاتمے پر میسولینی کی تصویر دکھائی گئی۔ سب احتراماً کھڑے ہو گئے مگر میسولینی اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ سینما کا مالک بھاگا بھاگا آیا اور کہنے لگا "میسولینی کے بارے میں ہمارے احساسات بھی تمہارے جیسے ہیں۔ تم بھی منافقت کے ساتھ کھڑے ہو جاؤ۔"

شکار کا شوق

مجھے سیر و شکار کی طرف کچھ رغبت تھی، لیکن کوئی خاص شوق نہیں تھا۔ [illegible] جانوروں کو ہلاک کرنا مقصد نہ تھا۔ میں خاص طور پر اس [illegible] ایک مرتبہ کشمیر میں اتفاق سے ایک ریچھ ضرور مارا تھا۔ [illegible] بھی خون نہیں بہایا۔ ہاں،

بالآخر ایک ہرن کا ایسا واقعہ پیش آیا کہ شکار کا یہ تھوڑا بہت شوق بھی [illegible] جانور زخمی ہو کر میرے پاؤں کے قریب آ کر گر گیا اور آنسوؤں سے [illegible] ایک مرتبہ بے چارے نے میری طرف دیکھا۔ یہ پُرنم اور غمگین آنکھیں اب تک مجھے یاد ہیں [illegible] مجھے ستاتا رہا۔

"میری کہانی" ([illegible]) پنڈت جواہر لال نہرو، مکتبہ جامعہ

عمارہ اقبال

انصاف

خواتینِ خانہ کی ہمت و استقامت کو خراجِ عقیدت پیش کرتا طرح دار قصّہ

"ماسی! کون آیا تھا؟"

"وہ..... وہ باجی، میرا بندہ تھا۔"

"بندہ.....؟ اچھا، اچھا خیریت تھی؟" مَیں نے اُس
ے ہاتھ میں موجود تھیلے پر سوالیہ نگاہ ڈالی۔

"جی..... جی باجی، بس میری جوتی ٹوٹ گئی تھی، وہی
ت کرا کر لایا تھا۔"

"ہوں!"

مَیں ہلکا سا مسکرائی، تو اُس کے چہرے پر بھی شرگیں
راہٹ پھیل گئی۔ میری پرانی رگِ تجسس پھڑک اٹھی اور

مَیں نے باقاعدہ اُس سے سوالات شروع کردیے۔

"ماسی! تمہارے شوہر کا کیا نام ہے؟"

"جی! افضل راجا" نام اُس نے شرماتے ہوئے دھیمی
آواز میں لیا تھا۔

"راجا! راجا تمہاری ذات ہے؟" مَیں نے پوچھا۔

"نہیں، نہیں باجی! ہم کہاں کے راجے، بس یونہی نا.....
شروع شروع میں جب ہماری شادی ہوئی تھی، تب یہ خوب
تیار ہو کے شوخیاں کرتا تھا، بڑا خوبصورت ہوتا تھا۔ اب بھی
باجی بڑا خوبصورت ہے میرا بندہ، بہت ہی پیارا۔" یہ بات
کہتے ہوئے وہ دِھیما دھیما مسکراتی رہی۔ "تب وہ کہتا تھا

میری رانی آ گئی نا میرے گھر میں، تو مَیں بھی راجا بن گیا ہوں۔ تُو رانی، مَیں راجا۔" بات کے آخر تک اُس کے مسکراتے لب جذبات کے زور کو روک نہ سکے اور ایک پھوار کی طرح بھرپور سا قہقہہ اُبل پڑا۔

میرا قہقہہ بھی بےساختہ تھا۔ میرے تجسس کو اَور بھی پَر لگ گئے۔ احساسِ محرومی کی شدت کہہ لیجیے یا کچھ اور، جو بھی .....!

"ماسی! کتنا پیارا ہے؟ کیا آپ سے بھی پیارا؟"

"باجی! اتنا سوہنا، اتنا سوہنا، آپ کے شوہر سے تو بہت سوہنا ہے جی میرا بندہ۔"

مَیں بھونچکارہ گئی۔ ساتھ ہی ایک لپٹ سی دل نے محسوس کی اور مجھے ماسی سے خوف آنے لگا جیسے وہ میرے خیالات پڑھ رہی ہو۔ مَیں نے اُسے گھور کر دیکھا۔ وہ خود بھی اپنی بات کی سنگینی محسوس کر چکی تھی۔ لیکن اگلے ہی لمحے مَیں نے مسکراتے ہوئے اپنا اعتماد بحال کیا اور 'کوئی بات نہیں' کہہ کر اندر چلی آئی۔

بہرحال دل کو ایک کھد بد سی لگ گئی کہ نجانے کتنا خوبصورت شوہر ہے اور وُہ کتنی خوش ہے۔ اگلے کئی دن تک مَیں نے غیرمحسوس طریقے سے شوہر کے کام وغیرہ کے متعلق اُس سے پوچھا۔ معلوم ہوا کہ وہ کچھ بھی نہیں کرتا اور گھر رہتا ہے۔ ساتھ میں حسبِ حال جوئے کی بازی بھی کبھی کبھار لگا لیتا ہے۔ یہ سارا تجسس اور کارروائی محض اِس بنا پر تھی کہ مجھے بہت بری عادت ہے چھان بین کی حالانکہ میرے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا۔ پھر بھی نئے نئے لوگوں کے متعلق جاننا میری کمزوری ہے۔

ماسی اور اُس کے شوہر کی اٹوٹ محبت نے مجھے تجسس میں ڈال دیا کہ اتنی غربت اور بےکاری کے باوجود کون سے عوامل ہیں جو اِس رشتے کو اِتنی مضبوطی سے باندھے ہوئے ہیں۔

ساری تفتیش اور دو مزید واقعات نے اِس بات پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی کہ افضل راجا کی خوبصورتی اور اُس کا ماسی کی عزت اور خیال رکھنا، یہ مضبوط رشتے کی دو وُجوہ ہیں۔

بعدازاں مَیں نے اپنے ایک فلسفے کے تحت یہ نتیجہ نکالا کہ اگر پہلی وجہ یعنی خوبصورتی نکال دیں، تو دوسری وجہ بھی اِس رشتے کی مضبوطی کو ایسے ہی برقرار رکھے گی۔ اور سوموار کی رات مَیں نے اپنے گرم کمرے میں انتہائی نرم صوفے پر بیٹھ کر خوب غور و فکر کیا کہ عورت کو اگر مرد کی طرف سے عزت اور پیار ہی مل جائے، تو وہ پہاڑ سی زندگی اور ناسازگار حالات کا مردانہ وار مقابلہ کر سکتی ہے۔

مجھے 'مردانہ وار' کا لفظ ناموزوں لگا اور مَیں نے اپنی سوچ کے گھوڑے خوب دوڑائے لیکن کوئی لفظ نہ ملا اور میری تان بار بار 'زنانہ وار' ہی پر آ کر ٹوٹتی کہ عورت جب حالات کا مقابلہ کرتی ہے، تو اُس کی مثال دینے کے لیے کوئی موزوں لفظ ہے ہی نہیں۔ اِس لیے اِسے زنانہ وار ہی کہنا چاہیے کیونکہ مرد بھی اُن حالات میں تنکے کی طرح بہہ جاتے ہیں جن حالات میں عورت چٹان کی طرح مضبوط کھڑی رہتی ہے۔

منگل کی صبح کا سورج مَیں نے لان میں گیٹ کے قریب کرسی بچھا کر، اخبار اَور چائے کے ساتھ تاپا۔ نو بجے کے قریب ماسی آئی۔ دروازہ کھلا تھا، اُس نے آتے ہی نہایت ہلکی آواز میں سلام کیا اور تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ مَیں اِس خلافِ معمول سلام پر چونک گئی۔ اُس کی طرف غور سے دیکھا، تو باورچی خانے میں گم ہوتی ماسی کو مَیں صرف اتنا دیکھ پائی کہ نقاب جو صرف ٹھوڑی پر ہوتا تھا، اب ناک سے بھی کچھ اوپر اور آدھے سر پر ہونے والا دوپٹے کا کنارا، بھنوؤں سے بھی کچھ نیچے تھا۔

آج پہلی مرتبہ شاید مَیں نے اخبار کو فرصت سے پڑھا تھا۔ خیر تسلی سے پڑھ چکنے کے بعد مَیں اٹھی اور چائے کا مگ لے کر باورچی خانے میں آئی۔ وہ برتن سمیٹ رہی تھی۔ اُس کی نظر صاف ظاہر تھا۔ مَیں نے بھی نظرانداز کیا اور بولی:

"ماسی! آج دوپہر کا کھانا نہیں بنانا، کیونکہ باجی کی طرف جانا ہے۔ آپ بس صفائی کر کے چلی جایئے گا۔"

ماسی نے مجھے اپنی طرف متوجہ پایا، تو مکمل طور پر رُخ موڑ کر نل چلایا اور برتن دھونے لگی۔ مَیں بھی باہر آ کر جانے کے لیے کپڑے دیکھنے لگی۔ پوری الماری بستر پر پھیلائے بیٹھی تھی کہ شیشے میں ایک بچے کا عکس اُبھرا جو اِدھر اُدھر کسی کو تلاش کر رہا تھا۔ پھر اگلے ہی لمحے وہ باورچی خانے میں گھس گیا۔ مَیں ابھی حیران پریشان ہی بیٹھی تھی کہ نل کے پانی گرنے کے شور میں بچے کی اونچی اور تیکھی آواز ٹکرائی۔

"امّاں! جلدی آ۔ ابا نے رمضان کو بہت مارا ہے۔ اُس کا سر پھٹ گیا ہے۔"

ماسی کی چیخ ابھری۔ اگلے ہی لمحے بدحواس ماسی میرے کمرے میں آ گئی۔

"با..... جی..... ب..... باجی! مَیں گھر چلی جاؤں۔ باجی بہت ضروری کام ہے۔"

غربت اور بےکاری کے باوجود کون سے عوامل ہیں جو اِس رشتے کو اِتنی مضبوطی سے باندھے ہوئے ہیں

مَیں اُس سے زیادہ بدحواس ہو گئی، کیونکہ اُس وقت وہ دوپٹے سے بےنیاز میرے سامنے کھڑی تھی۔ مَیں نے بھی بدحواسی میں زور زور سے سر ہلایا اور وُہ کوندے کی لپک کی طرح میرے کمرے اور پھر گھر سے نکل گئی۔ سُوجی آنکھوں، کٹا ہونٹ، نیلوں نیل چہرہ، یہ وہ طرح دار ماسی تو نہیں تھی۔ مَیں نے سینے پر ہاتھ رکھا۔ اُس کے رخسار پہ لگا کٹ اور اُس سے رِستا خون جیسے گھر کی ہر چیز سے ٹپکنے لگا۔ مَیں دہل کر اُٹھی اور تقریباً بھاگتے ہوئے جا کر دروازہ بند کیا۔ باورچی خانے کا نل بند کیا اور آ کر کمرا بھی مقفل کر لیا اور پھر تبھی نکلی جب عارف اور بچے واپس آئے۔

کئی دن اُس کے انتظار کی بےچینی میں گزرے اور مَیں تجسس کے مارے بولائی بولائی پھرتی رہی کہ نہ جانے کیا ہوا تھا؟ ماسی کو کس نے مارا؟ رمضان کون ہے؟ تقریباً پون مہینہ ہونے کو تھا۔ گھر کے کاموں کو بھی جیسے تیسے گھسیٹ ہی رہی تھی، صرف اِس انتظار میں کہ ماسی آ جائے گی۔ میرا دِل کسی اور کو رکھنے پر آمادہ نہیں تھا۔ نجانے کیوں مَیں بلاوجہ انتظار کیے جا رہی تھی۔

شدید دھند میں جب سورج نے بھی باہر نکلنے کی زحمت نہ کی تھی، دروازے پر کسی نے دستک دی۔ پرانا معمول ترک کر چکی تھی۔ اب مَیں ہر وقت دروازہ مقفل رکھتی تھی۔ ایک بےنام سا خوف میرے دل کو جکڑ چکا تھا۔ ماسی کا مسخ چہرہ میرا حافظہ دھندلا نہیں سکا تھا۔

"باجی! مَیں ہوں ماسی فیضاں۔"

یہ آواز سنتے ہی میرا دِل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ مَیں نے کچھ لمحے تامل کیا اور سینے پر ہاتھ رکھ کر اپنی ہمت بندھائی۔ پھر دروازہ کھولا، تو سامنے وہی پرانی ماسی فیضاں ہی تھی۔ صرف رخسار اَور ہونٹ کا نشان باقی تھا۔ وہ ہمیشہ کی طرح ہنستی ہوئی اندر آئی۔ اپنی چادر اُتار کر ایک طرف ڈالی اور میری طرف رخ کر کے عام سے لہجے میں بولی:

"باجی! آپ نے کوئی اور کام والی تو نہیں رکھ لی؟"

مَیں نے یونہی گم صُم نفی میں سر ہلایا، تو اُس کے چہرے پہ خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

"ہاں جی! بھلا ایسا کیسے ہو سکتا تھا۔ مجھے پتا تھا میری باجی بہت اچھی ہے۔ میرا اِنتظار ضرور کرے گی۔"

اُسے اِس طرح دیکھ کر میرا دِل بھی کچھ ہلکا ہوا اَور مَیں اُسے اپنے ساتھ لے کر وہیں لان میں بیٹھ گئی۔

"ماسی! سب سے پہلے تو آپ یہ بتائیں کہ اُس دن کیا

ہوا تھا؟ مَیں تو ڈر ہی گئی تھی اور عارف کو بھی مَیں نے کچھ نہیں بتایا حالانکہ اُنھوں نے کئی بار آپ کا پوچھا۔ لیکن مَیں چھٹیوں کا کہہ کر ٹالتی رہی۔ ماسی نے سر جھکا لیا اور اگلے ہی لمحے اُس کی تیز ملگجی میرون قمیص کے دامن میں دو سرخ دھبے تھے، دہکتے دھبے جیسے انگارے ہوں۔ اُس نے دوپٹے کے پلو سے ناک رگڑی اور آہستہ سے بولی:

"میرے بندے نے مارا تھا۔"

مَیں حیرت زدہ رہ گئی۔ مجھے اُس وقت ہر چیز، ہر شخص کی توقع تھی، ساس، نندیں، دیور، جیٹھ کیونکہ یہ یہاں کا معمول ہے۔ اپنے شوہر کے علاوہ بھی گھر کا ہر فرد ہر عورت کو اَپنی جورو کی طرح اور فخریہ پیٹ سکتا ہے، حتیٰ کہ سسر بھی۔

"لیکن ماسی..... تمھارا بندہ؟ وہ تو بہت اچھا نہیں تھا۔ پچھلی عید پر چوڑیاں بھی دلوائی تھیں اُس نے اور آپ بتاتی تھیں کہ....."

"جی باجی! بتاتی تھی پر جھوٹ بتاتی۔ نکما اور جواری ہے، یہ تو بتایا لیکن شرابی ہونے کا نہیں بتایا تھا آپ کو۔ صرف پیتا ہی نہیں، ٹھکانے بھی لگاتا ہے اُسے۔ اُس دن بھی نشے کی وجہ سے سوتی بیٹی کے کان سے چاندی کی بالیاں اتار لیں۔ باجی صرف پانچ سو روپے کی تھیں۔ کیا تھا، ڈالی تھیں، تو مجھے بڑا چاؤ تھا۔ بیٹی کا کوکا (تھنگلی) بنواؤں، بالیاں ڈالوں۔ ایک ہی تو میری بیٹی ہے۔ اُسے بھی برداشت نہیں کرتا۔ مَیں نے جو کہہ دیا کہ بیٹی کو تو بخش دینا تھا، تو آگے سے کہتا کہ بیٹی کون سا ہمیں بخشے گی۔ کل کو کسی اور کے ساتھ چلی جائے گی۔ یہیں ہمارے پاس رہے، ہمیں کما کر کھلائے پلائے، خرچے پورے کرے، تو بخش دیتا ہوں۔ بس باجی، پھر تو میری بس ہو گئی۔ مَیں بولی تو میرا یہ حال کر دیا۔ حالانکہ باجی ساتھ والیاں بڑھ چڑھ کر شوہر کو بھی مارتی ہیں۔ مَیں نے کبھی ہاتھ نہیں اٹھایا، پھر بھی....."

ماسی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ مَیں نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر دلاسا دیا:

"ماسی! شروع شروع میں تو اچھا ہوتا تھا نا۔ وہ زرا جارانہ والی بات تم نے مجھے بتائی تھی۔"

مَیں نے مسکرانے کی کوشش کی لیکن حلق میں کچھ اٹک گیا۔

"وہ بھی باجی نشے میں کہتا تھا۔"

ماسی اب زار و قطار رو رہی تھی۔ مَیں نے تسلی کے لیے لفظ ڈھونڈنے کی کوشش کی لیکن کچھ ہاتھ نہ آیا۔ تھک کر کرسی سے ٹیک لگائی اور بالآخر بول ہی پڑی:

"ماسی! آپ نے کبھی جان چھڑوانے کا نہیں سوچا؟"

اُس نے چونک کر سر اٹھایا اور بولی:

"سوچا تھا، پر..... اماں ہر دفعہ گھیر گھوٹ کے بھیج دیتی۔ شروع کے دنوں میں تھوڑا بہت کماتا تھا۔ بعد میں تو بالکل ہی چھوڑ دیا۔ مجھے کام پر لگا دیا۔ میرے ساتھ کی دیورانیاں، جیٹھانیاں سارا دِن چاہے مار کھاتی ہیں پر گھر رہتی ہیں۔ ایک مَیں کم نصیب ہوں۔ کہیں ٹھکانہ نہیں ہے۔"

اُس نے تھکے ہارے انداز میں سر نیچے گرا لیا۔ مَیں اٹھی تو وہ بھی دکھوں کے سمندر سے چونک کر نکلی اور میکانکی انداز میں میرے پیچھے چلنے لگی۔ ماسی کے پاس زندگی سے ملے والے دکھوں پر رونے دھونے کا بھی وقت نہیں تھا۔ مار کھا کر بھی اُسے شوہر کو گلاس میں برف ڈال کر دینی پڑتی تھی۔ دکھوں سے چور ہو کر جب وہ چیخیں مار مار کر رونا چاہتی تھی، تب کسی نہ کسی گھر میں برتنوں اور کپڑوں کا ڈھیر اُس کا منتظر ہوتا۔

اُس رات بھی مَیں اپنے مخصوص صوفے پر بیٹھ گئی جسے آج مَیں نے کمرے میں لگائے مخصوص آتش دان کے ذرا پاس گھسیٹ لیا تھا، کیونکہ حالات کی جو خنکی مَیں نے آج محسوس کی تھی، وہ پہلے کبھی نہ کی تھی۔ میری روح پر جیسے کپکپی چھوٹ گئی تھی۔ سرد پاؤں بالکل اُس کے سامنے سٹول پر رکھ دیے اور خشک میوہ جات کا ڈبا لیے فلسفے کی گٹھڑی کھول لی۔

میرا خیال تھا کہ عورت کی مضبوطی کو اظہار اور کھڑے ہونے کے لیے کسی سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ماسی کے لیے میں نے شوہر کی محبت کو سہارا جانا تھا، وہ بھی خام خیال ہوا۔ اب کے میری سوچ کی تان اِس پر ٹوٹی کہ شاید اولاد..... لیکن اگلے ہی لمحے اُس کی بھی تردید ہوئی، کیونکہ ماسی جیسی عورت تنہا بھی بچوں کو پال سکتی ہے۔ شوہر کے مظالم کو برداشت کرنا، حالات کی کٹھنائیاں سہنا، نجانے کون سی بات ہے جو وہ یوں ابھی تک رہ رہی ہے۔

مَیں ایک آسودہ حال عورت ہوں۔ پڑھی لکھی، خوبصورت، بچوں والی جس کا شوہر ذرا بھی گڑبڑ کرے، تو گناہِ عظیم کا مرتکب ہو گا اور کسی ایسی ویسی حرکت کرنے میں تو صورتِ حال اور بھی پیچیدہ ہو جاتی ہے کہ بچوں کی اخلاقی صحت متاثر ہونے کے باعث علیحدگی ناگزیر ہوتی ہے۔ میری سوچ ایک مرتبہ پھر بند ہوئی۔ فلسفے کے دیپ پھر دوبارہ جلے۔ اِس کے بعد مجھے یہی بات سمجھ آئی کہ شاید ماسی کا شوہر بہت خوبصورت ہے اور یہ اُس کے سحر میں اِس بری طرح گرفتار ہے کہ علیحدگی سوہانِ روح ہو گی۔ کچھ دنوں بعد ماسی نے کسی امدادی سکیم کے بارے میں سنا، تو اپنا اور اَپنے شوہر کا شناختی کارڈ لیے میرے پاس آئی کہ اِس سے ہمیں بھی امداد دِلوا دیں۔ مَیں نے شناختی کارڈ پکڑے اور اُن پر سرسری نظر ڈالی۔ مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا، کیونکہ شناختی کارڈ پر نہایت کم صورت آدمی کی تصویر تھی جس میں خوبصورتی تو کیا، کشش نامی چیز بھی ڈھونڈے سے نہ ملتی۔

"ماسی..... یہ ہے تمھارا شوہر؟"

مَیں صدمے کے مارے چلّا اٹھی۔ مَیں نے ایک نظر کبھی حسین رہنے والی عورت پر ڈالی اور ایک شناختی کارڈ پر۔

"جی باجی! یہی ہے۔"

وہ اَیسی شرمائی جیسے دل کے تاروں پر نجانے کون کون سے راگ چھڑ گئے ہوں۔ وہ مجھے ایک دم زہر سے بھی بری لگنے لگی۔ مَیں بے حد مایوسی سے دوبارہ صوفے پر گر گئی۔

"ماسی! آپ بھی کمال کرتی ہیں۔ کیا یہ سب بھلایا جا سکتا ہے۔ اتنی ہتک، اتنا ظلم جو ہمیشہ ہوتا آیا ہو اور ہمیشہ ہوتا ہو۔"

میرا دماغ گھوم کر رہ گیا۔ میری سوچ اب ایک نئی نہج پر چل نکلی تھی۔ ماسی شاید سوچ پڑھنا جانتی تھی۔ دفعتاً اُس کی آواز گونجی:

"باجی! اپنا بندہ تو اَپنا ہی ہوتا ہے۔ جیسا بھی ہو، سوہنا ہی ہوتا ہے۔ کیسا بھی ہے، گھر پڑا ہے نشہ کر کے، مرن جوگا چارپائی توڑتا ہے، پر گھر کا سائیں گھر تو بیٹھا ہے نا باجی! اُسے چھوڑ کر کہاں جاؤں گی۔ یہیں رہنا ہے نا۔ اُسے چھوڑ دیا نا، تو باجی میرے راستے میں ستر بندے ہیں نا، تو ستر ہی پوچھیں گے کہاں سے آئی ہو؟ کہاں جا رہی ہو؟ مَیں کس کس کو جواب دوں گی۔ باجی! ہماری طرف ایسے نہیں ہوتا کہ کسی کو بات پوچھتے، کرتے دس بار سوچو، پھر بات کرو۔ وہاں تو منہ پھاڑ

> لیکن ماسی فیضاں ایک عورت ہونے کے ناتے، مضبوطی کی ایک مستند علامت ہے

کے پوچھتے ہیں۔ اور آپ رمضان کا پوچھ رہی تھیں نا۔ میرا بڑا بیٹا ہے۔ کہیں سے لڑکی بھگا کر لایا ہے۔ اب اُس لڑکی کے پیچھے لگ کر ایک کمرا بھی ہم سے چھیننا چاہتا ہے۔ میری بیٹی جوان ہے، اُسے لے کر کہاں جاؤں؟ نشے میں باپ نے بیٹے کو اتنا مارا کہ اُس کا سر پھاڑ دیا۔ ایک آنکھ سے نظر آنا بھی بند ہو گیا۔ اُس کے بچوں کا خرچہ بھی میرے سر آ گیا ہے۔ ماں ہوں، بھوکے مرتے تو نہیں دیکھ سکتی۔ بیٹی ہے، تو اُس کے نخرے آسمان پر ہیں۔ میرے ساتھ گھروں میں کام کرنے نہیں آ سکتی۔"

ماسی تو نجانے کیا کچھ بول کر چلی گئی، میری آنکھوں کے سامنے جھکڑ سے چلنے لگے۔ میں آج رات پھر اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھی ہوں۔ آگ سلگ رہی ہے، چنگاریاں اُڑ رہی ہیں۔ بقا کی جنگ کیسی اندوہناک ہے۔ ماسی جیسے کسی صحرا میں دکھوں کی برستی آگ اور حالات کی آندھی کے جھکڑوں کے سامنے سوکھے درخت کے تنے کی مانند کھڑی ہے۔ ایسا تنا جس سے نشئی شوہر، بدفطرت بیٹا اور بداخلاق بیٹی ابھی تک چمٹے کھڑے ہیں۔ تنہا ہوتے، تو نہ جانے کہاں خاک دھول کی مانند بے نام ونشان ہوجاتے۔

لیکن ماسی فیضاں ایک عورت ہونے کے ناطے دنیا کی ایک مستند علامت ہے۔ وہ نہ تو کسی پر رعب جھاڑ کر کمانے پر مجبور کر سکتی ہے نہ شوہر، نہ بیٹا بیٹی اور نہ ہی نوکر کہیں لڑھک سکتی ہے۔ اُسے ہر حال میں کھڑے رہنا ہے۔ وہ مردوں کی اس قدر پابند کیوں ہے۔ میں مرد کو اللہ کی طرف سے عطا کردہ حاکمیت کے خلاف نہیں مگر یہ علامتی ناانصافی خون کھولا دیتی ہے۔ مردوں کے تیار کردہ اس معاشرے میں بہادری اور استقامت کا علامتی لفظ 'مردانہ وار' کہلاتا ہے، 'زنانہ وار' کیوں نہیں؟

نوجوان مدیر

مولانا آزاد کی ملاقات مولانا حالی سے ہوئی۔ اِس کا قصہ بھی بڑا پُرلطف ہے۔ مولانا آزاد انجمن کا اجلاس شروع ہونے سے ایک دن پہلے لاہور پہنچ گئے تھے۔ اُسی دن وہاں اُن کی ملاقات مولوی وحید الدین سلیم پانی پتی سے ہوئی۔ سلیم کو جب معلوم ہوا کہ یہی "لسان الصدق" کے مدیر شہیر ہیں، تو اُنھوں نے بجا طور پر اسے عجائب عالم میں سے خیال کیا۔ وہ اُنھیں مولانا حالی کے پاس لے گئے جو جلسے میں شرکت کی غرض سے آئے تھے۔ جب سلیم مولانا آزاد کو ساتھ لے کر حالی کی خدمت میں پہنچے، تو تعارف سے پہلے اُنھوں نے حالی سے پوچھا "آپ کے خیال میں ان کی عمر کیا ہوگی؟"

حالی کی طبیعت کا حزم واحتیاط معلوم ہے۔ اُنھوں نے تامل سے جواب دیا "ابھی بہت کم سن ہیں۔"

اِس پر سلیم نے اصرار کیا، "نہیں فرمایئے، آپ کے خیال میں کیا عمر ہوگی؟"

بالآخر حالی نے کہا "پندرہ سولہ سال کی ہوگی۔"

سلیم نے اُنھیں بتایا کہ یہی "لسان الصدق" کے ایڈیٹر ہیں۔

وہ پرچہ مولانا حالی کی نظر سے بھی گزرتا تھا اور اُس کے مضامین کے مداح تھے۔ ساری دنیا کی طرح وہ بھی یہی گمان کرتے تھے کہ رسالے کے ایڈیٹر کوئی تجربے کار، عالم صحافی ہوں گے۔ یہ معلوم کر کے اُنھیں بہت تعجب ہوا کہ یہ نوعمر صاحب زادے اُس ماہنامے کے مدیر ہیں۔ اُس دن جو تعلقات دونوں میں قائم ہوئے، امتدادِ زمانہ سے اُن میں استواری آئی اور ایک دوسرے سے متعلق عزت اور محبت کے جذبات میں اضافہ ہوتا گیا۔

دل کی آواز

ایک دفعہ کسی اخباری نمائندے نے قائدِاعظم سے دریافت کیا "کیا مستقبل میں گاندھی جی کے ساتھ آپ کی ملاقات کا کوئی امکان ہے؟"

ہنستے ہوئے فرمایا "مسٹر گاندھی کہتے ہیں کہ اس کا انحصار اُن کے دل کی آواز پر ہے، چونکہ میرا وہاں سے گزر نہیں ہوتا، اس لیے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

عبدالقیوم

بس اسٹاپ

روزمرہ زندگی کے ایک مقام کی نیرنگیاں اور اَچھوتے رنگ عیاں کرتا قلمی شہ پارہ

اس مہنگائی کے دور میں اپنی ذاتی سواری کا مالک ہونا بڑی بات ہے۔ اکثر لوگ آمد و رفت کی سہولت سے زیادہ صاحبِ اسکوٹر یا استعمال شدہ کار کا مالک کہلانے کے شوق میں مختلف ذرائع سے قرض وغیرہ لے اُن سواریوں کے مالک بن بیٹھتے ہیں۔ پھر تھوڑے ہی عرصے میں تنگ دستی کے ہاتھوں پیچ و تاب کھانے کے نتیجے میں اُن کا فشارِ خون مسلسل بڑھتا چلا جاتا ہے جبکہ گھر میں عام ضروریات زندگی کی مطلوبہ مقدار میں بتدریج کٹوتی کی وجہ سے بیوی کا فشارِ خون کم ہوتا چلا جاتا ہے۔ ہیولا مزاج شوہر کے دوستوں کے سامنے مالک سواری ہونے کی ڈینگیں مارنے پر وہ کڑھتی ہے کہ "آدھ جل گگری چھلکت جاوے" قسم کے شوہر کے افسوس ناک رویے کا مداوا اُس کے پاس نہیں ہوتا۔

ان ہی دو اندیشوں کے پیشِ نظر میں نے ذاتی سہولت کے لیے اسکوٹر یا سیکنڈ ہینڈ کار نہیں خریدی۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ کوئی مجھے قرض دینے پر تیار نہیں یا میں لاٹھی کے ہاتھ، مال گزاری بے باک قسم کے قرض خواہوں کے ڈر سے قرض نہیں لیتا! دراصل زندگی میں سکون و اطمینان کو میں نے ہمیشہ دنیاوی آسائشوں پر ترجیح دی ہے تاکہ مالی کے ساتھ ساتھ دماغی بدحالی سے بھی محفوظ رہ سکوں۔ لہٰذا "بے کار" کہلانا

مجھے پسند ہے۔ یہ جاننے کے باوجود کہ عوامی سواری میں سفر کرنے والے اچھے بھلے دوست بھی اِس لیے سلام ہلکی سی جنبش سے لیتے ہیں کہ اِس کا اتنا مقدور بھی نہیں کہ ایک کھڑکھڑاتی استعمال شدہ اسکوٹر یا دھکا اسٹارٹ کار ہی سواری کے لیے خرید لے۔

بہرحال اپنے چہرے مہرے کے نوک پلک درست کرنے کے بعد مَیں بس اسٹاپ پر جا کھڑا ہوتا ہوں۔ رواں دواں ٹریفک کے شور کو برداشت کرتا ہوا ڈیزل کے مضرِ صحت دھوئیں سے پھیپھڑوں کو بچانے کے لیے ناک رومال کی اوٹ میں لے لیتا ہوں لیکن دھوئیں کی کڑواہٹ آنکھوں میں جلن ضرور پیدا کر دیتی ہے۔ تاہم پھر بھی مَیں اطمینان سے بس، ویگن یا کوچ وغیرہ میں سفر کرتا ہوں۔

سفر کے دوران مزے سے کسی اخبار، رسالے یا کتاب کا مطالعہ کرتا ہوں اور اگر موقع ملے، تو ہنس مکھ مسافر ساتھی سے گپ شپ بھی مار لیتا ہوں۔ تاہم بات چیت میں سیاست کے حوالے سے تلخی یا بدمزگی کی بے ہنگم لہریں موجزن ہو جائیں یا سنجیدگی کا بوجھل پن در آئے، تو پھر اُس سے قطع تعلق کر کے راہ یا بازار کی اِدھر اُدھر بکھری رونق اور گہما گہمی سے لطف اندوز ہونے لگتا ہوں۔

سچ تو یہ ہے کہ ذاتی سواری کے مالکوں کو اتنا اطمینان اور بے فکری کہاں نصیب ہوتی ہے جو ویگن میں نشست پر بیٹھ کر سفر کرنے والوں کا مقدر ہوتی ہے۔ اُنھیں تو ہر وقت ذہن کو چوکنا، کانوں کو کھلا اور آنکھوں کو بیدار رکھنا پڑتا ہے کہ کہیں سامنے کی گاڑی سے ٹکر نہ ہو جائے یا اچانک بریک مارنے کی صورت میں پیچھے سے کوئی منچلا ڈرائیور ٹکر مار کر کار کا حلیہ نہ بگاڑ دے۔ یا پھر ٹریفک وارڈن غیر معقول وجہ بتا کر جیب ہلکی کرنے کا سبب نہ بن بیٹھے۔

تاہم ایک معقول وجہ میرے ذاتی سواری نہ رکھنے کی یہ ہے کہ مَیں لڑکپن سے مزاجِ عاشقانہ رکھتا ہوں کہ جہاں کہیں چاند سی صورت یا نئے زمانے کی پروردہ مُورت جدید لباس میں نظر آتی ہے، تو پھر میری نظریں اُس پر جیسے چپک جاتی ہیں۔ اُس میں خلل تب پڑتا ہے جب مَیں کسی راہ گیر سے ٹکرا کر شرمندگی سے سوری کہتا ہوں۔ ذاتی سواری کا مالک بن کر میرے لیے یقیناً کسی بس، ویگن یا کار سے ٹکرانے کا تجربہ ہو سکتا ہے اور مَیں زخمی حالت میں اسپتال کے جنرل وارڈ میں اپنے آپ کو کراہتا ہوا پاؤں۔

یادش بخیر! نوجوانی میں ہمارے فٹ بال کے کوچ کچھ زیادہ ہی ٹھرکی قسم کے بندے تھے۔ وہ ہمیں لیکچر دیتے کہ سگریٹ، بیڑی پینا یا چلم کے سُوٹے لگانا فٹ بالر کے لیے زہر ہے۔ ویسے تو عشق و محبت کی لت بھی بندے کو کھیل کود سے بیگانہ کرتی ہے، لہٰذا احتیاط ہو سکے، تو سبحان اللہ۔ تاہم جوانی دیوانی ہوتی ہے۔ اگر کوئی ماں کی لاڈلی دل کو بھا جائے، تو پھر اُسے یک سوئی سے گھورنے کو عادت بنا لینا آدھی کامیابی کی ضمانت ہوتی ہے۔ اگر وہ جواب میں مسکرا دے، تو دولہا بننے کی

ایک معقول وجہ میرے ذاتی سواری نہ رکھنے کی یہ ہے کہ مَیں لڑکپن سے مزاجِ عاشقانہ رکھتا ہوں

امید بندھ جاتی ہے، ورنہ..... اور یوں ہمیں کوچ کی عشق محبت میں کامیابی کی راہِ مستقیم کی رہنمائی اور ہدایت پر عمل کرنے کی تحریک ملی، تو یہ نسخہ اکثر ہم نے آزمایا لیکن نتیجہ خاطر خواہ نہ نکلا۔

آج جب عمر کی آدھے سے زیادہ سیڑھیاں طے کر چکا ہوں، تو جب بھی کوچ کا نسخہ کسی الٹرا ماڈرن یا فیشن ایبل حسینہ پر آزماتا ہوں، تو اُس کی دبی دبی مسکراہٹ اور مجھے دیکھتے ہی کھلکھلا کر ہنسنا شرمندگی کے حصار میں سمٹنے پر مجبور کر دیتا ہے اور جب وہ بڑی لجاجت بلکہ شرارت سے انکل کہہ کر مجھ

سے بات کرتی ہے، تو دل کی دھڑکن کی دھک دھک دھیمی ہونے سے جیسے رک جاتی ہے۔

مَیں تو بڑے اطمینان سے تیار ہو کر بس اسٹاپ پر جا کھڑا ہوتا ہوں اور کسی ایسی بس یا ویگن پر سوار نہیں ہوتا جس میں ڈنڈا پکڑ کر یا کبڑے کی طرح جھک کر سفر کرنا پڑے۔ پیسے خرچ کر کے اذیت اٹھانا کہاں کی عقل مندی ہے؟ مَیں نشست پر بیٹھے جب کسی مسافر کو کھڑے دیکھتا ہوں، تو لگتا ہے کہ جیسے وہ دانت پیس رہا ہے کہ یہ نامعقول بے فکر ہو کر نشست پر براجمان ہے اور وہ خود کتنا احمق ہے جو کبڑا بنا ڈنڈا پکڑے، ہر جھٹکے کے ساتھ آگے یا پیچھے کھڑے مسافروں سے ٹکرانے پر سوری کا لفظ بار بار زبان پر لانے کے لیے مجبور ہے۔ انسانی فطرت میں اِس قسم کے جذبات بڑے طاقتور ہوتے ہیں کہ وہ دُوسروں کی سہولت اور خود کو مصیبت یا مشکل میں دیکھ کر کڑھتا اور رشک کے بجائے حسد کی آنچ سے ذہن کو مشتعل کرتا رہتا ہے۔

تاہم خوش قسمتی ہمیشہ میرا ساتھ نہیں دیتی، اِس لیے مجبوراً مجھے بھی کبھی کبھار اِس تلخ تجربے سے گزرنا پڑتا ہے۔ تب مَیں اکڑوں کھڑا یا ڈنڈا پکڑے پکڑے نشستوں پر براجمان مسافروں کا جائزہ لیتا ہوں۔ کوئی بس ویگن کے بار بار رکنے یا پھر جھٹکے لگنے پر سیخ پا ہوتا ہے، تو کوئی خواتین پر یک سوئی سے نظریں جمائے بے نیازی کے حصار میں قیدی بنا نظر آتا اور وقفے وقفے سے حسرت بھری ٹھنڈی آہیں بھی بھرتا ہے۔

کسی مسافر کا بے چینی سے ڈرائیور یا کنڈیکٹر کو غصّے سے دیکھنا پا کر ادراک کر لیتا ہوں کہ وہ اُس کی سست رفتاری پر چیں بہ جبیں ہو رہا ہے۔ بار بار اُپنی گھڑی دیکھتا اور اُپنے دونوں ہاتھ پٹھوں پر مار مار کر غصّے کی لہروں میں بہنے سے خود کو بچاتا ہے لیکن یہ سوچ کر کہ وہ وقت پر منزلِ مقصود پر نہیں پہنچ سکے گا، دیگر مسافروں کو غصّے سے دیکھتا ہے کہ وہ اُس کے ہم نوا بن کر ڈرائیور کو مجبور کر سکتے ہیں لیکن سب چپ ہیں۔

کچھ تو ایسی بھی ہوتی ہیں کہ جن کی نظریں صرف بس، ویگن کے آنے کی سمت لگی رہتی ہیں

ایسا بھی ہوتا ہے کہ سامنے کی بے ہنگم ٹریفک راستہ نہیں دیتی، تو شور اُور ڈیزل کا دھواں بیزار کیے دیتا ہے۔ دھوئیں کی کڑوی بُو سے الرجک یار بار کھانستے کھنکارتے ہیں لیکن مجبوری پاؤں کی زنجیر بنی رہتی ہے۔ اسی لیے مَیں اِن ساری قباحتوں سے بچنے کے لیے اور نشست کے حصول کی خاطر وقت سے پہلے بس اسٹاپ پر جا کھڑا ہوتا ہوں تاکہ ڈنڈا پکڑ یا کبڑا بن کر کھڑا ہونے کے خون کے گھونٹ پینے کے بجائے نشست پر بیٹھنے کی وجہ سے تلخ تجربے کا کم سے کم احساس ہو۔

بس اسٹاپ پر مختلف سمتوں سے لوگ آ کر اپنی مطلوبہ سواری کا انتظار کرنے لگتے ہیں۔ تاہم انتظار کا احساس اکثر کو نظروں کی تراوٹ کے اسباب موجود ہونے پر کوفت نہیں ہوتی۔ اِس لیے کہ کچھ کی حرکتیں دیکھ کر لگتا ہے کہ وہ اپنی فطری کمزوریوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔

اگر کوئی خوبصورت دوشیزہ یا حسین و جمیل باوقار محترمہ بس اسٹاپ پر آ کر کھڑی ہو جائے، تو پھر عمر سے قطع نظر اکثر غیر شائستہ حرکات کے مرتکب ہونے لگتے ہیں۔ کوئی کن انکھیوں سے دیکھتا ہے، کوئی اپنے کپڑوں کی کریز ٹھیک کرتا ہے اور فرضی گرد جھاڑتا ہے۔ کوئی چند قدم آگے اُس کی طرف بڑھ کر جراَت مندی کا ثبوت دیتا ہے، کوئی زور زور سے اپنے ساتھی سے اس طرح ہنس ہنس کر محوِ گفتگو ہوتا ہے جس میں اُس کی شخصیت کی دلکش جھلکیاں، اُونچے لوگوں سے تعلقات اور بے تکلفی کا مظاہرہ شامل ہوتا ہے تاکہ قریب کھڑی صنفِ لطیف متوجہ ہو۔

کوئی احمق تو اپنی شادی کے متعلق فرضی داستان سنانے

لگتا ہے کہ مَیں نے تو اپنے والدین سے کہہ دیا ہے کہ جو لڑکی مجھے پسند آئی، بغیر جہیز کے بھی اُس سے شادی کر لوں گا اور پھر وہ پاس کھڑی لڑکی کا جائزہ لیتا ہے کہ وہ متوجہ بھی ہے یا نہیں۔ بس اسٹاپ پر فطرتِ انسانی کے اَن گنت زاویوں کا ادراک کر کے مَیں اکثر سوچتا ہوں کہ انسانی طبیعت و مزاج کے کتنے پسندیدہ و ناپسندیدہ چھچھورپن سے مملو اور سنجیدگی کے بُت بس اسٹاپ کو رونق بخش کر بالآخر تتر بتر ہو جاتے ہیں۔

اِس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ بس اسٹاپ پر صنفِ نازک کی کرم فرمائیاں معدوم ہوتی ہیں۔ کچھ تو یوں بن ٹھن کر آتی ہیں کہ دوپٹے سے بے نیاز کھلی زلفوں کو جھٹک کر نوجوانوں کے جذبات میں ہلچل برپا کرنے کے علاوہ عمر رسیدہ حضرات کو بھی عینک کے شیشے بار بار صاف کرنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ کچھ یوں بے باکی کی تصویر بنی ہوتی ہیں کہ وہ جسے گھورتا پاتی ہیں، تو اُس کی طرف منہ کر کے زمین پر تھوک دیتی ہیں۔ یہ عمل وہ ہر ایک دل پھینک سے روا رکھتی ہیں۔

میرے لیے بس اسٹاپ انسانی نفسیات کی ایک دلچسپ کتاب کی طرح ہے جس کا مطالعہ مَیں بڑے انہماک سے کرتا ہوں اور کسی کو محسوس بھی نہیں ہونے دیتا۔ ہر روز کتنوں کی

> جگہ جگہ بس اسٹاپس کی موجودگی کو مَیں انسانی ہمدردی کے بے پایاں جذبے کا سنگِ میل سمجھتا ہوں

کمینگیوں، نازیبا حرکات اور دِل پھینک قسم کی عادات کا گواہ بنتا ہوں لیکن میں ایسا گواہ ہوں جو اُن کی اخلاقی پستیوں کو اپنے دل کے گوشے میں دفن کر دیتا ہے۔ اِس لیے کہ اسٹاپ پر ہجوم ہونے کی صورت میں بس ویگن کی کم یابی کئی قسم کی تفریح و دِلچسپی کا سامان مہیا کرتی ہے اور اِس گہما گہمی میں انسان اپنی نفسیاتی اور اَخلاقی کمزوریوں کو جانے اَن جانے طریقے سے طشت از بام کر دیتا ہے۔

جگہ جگہ بس اسٹاپس کی موجودگی کو مَیں انسانی ہمدردی کے بے پایاں جذبے کا سنگِ میل سمجھتا ہوں۔ لیکن اکثر ڈرائیوروں کی تیز رفتاری کا شوق مسافروں کو مطلوبہ اسٹاپ پر اترنے سے محروم رکھتا ہے کیونکہ جذباتی اور نشے کے عادی ڈرائیور بس اسٹاپ کو شوقِ رفتار یا پھر حریف سے مقابلے کی لگن پر اہمیت نہیں دیتے اور اَپنی من مانی کرتے ہیں۔

ایسے ہی ڈرائیور مسافروں کے جذبات سے بےخبر اپنے بے لگام جذبے کے اسیر ہوتے اور اَکثر قیمتی جانوں کے اتلاف کا سبب بنتے ہیں۔ بس اسٹاپ کا یہی تو مثبت پہلو ہے کہ جو اُس کا احترام کرتے ہیں، وہ بے لگام نہیں ہوتے "اور آگے چلیں گے دم لے کر" کو حرزِ جاں بنائے رکھتے ہیں، تو اُن کے ہوش و حواس قائم رہتے ہیں اور وُہ مسافروں کو بحفاظت منزلِ مقصود تک پہنچاتے ہیں۔ جہاں وہ ذہنی اتھل پتھل کے ہاتھوں بس اسٹاپ کو حقارت سے ضدی بچے کی طرح نظرانداز کرنے کو اپنی تیز رفتاری کی معراج سمجھتے ہیں، اُنھیں حادثے سے دوچار اَور موت یا زخمی ہونے سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ اگر قسمت یاوری نہ کرے، تو وہ اَپنے ساتھ دوسروں کو بھی راہئ ملک عدم کر جاتے ہیں۔

یہ دنیا بھی تو ایک بس اسٹاپ ہے جہاں انسان آتا، اپنی چار روزہ زندگی ہنسی خوشی یا غم و اَلم کے ملے جلے عناصر کے زیرِ اثر شب و روز برے بھلے گزارتا اور دِلچسپی و حیرت و استعجاب سے دنیا کی رنگارنگی کو دیکھتا پرکھتا اور محظوظ ہوتا ہے۔ کوئی بڑا کام کر جاتا ہے، کوئی رزیل عمل و حرکتوں سے دنیا کو داغدار کرتا ہے اور کوئی اِس سرائے فانی میں قدرت کی عطا کردہ زندگی مثبت انداز میں خرچ کر کے اَن مٹ نقوش ثبت کر جاتا ہے۔ جب عمر کی نقدی ختم اور زندگی کی ڈور اَچانک منقطع ہو، تو چار کندھوں پر سوار ہو کر واپس نہ آنے کے لیے چلا جاتا اور اَپنی بری بھلی یادیں چھوڑ جاتا ہے۔

گمنام چراغ

عربی اور فارسی کے ایک قابل معلم اور ایک سچے کھرے مسلمان کو سبق آموز خراجِ تحسین

۷ جنوری ۲۰۲۳ء کو بوقتِ عشاء علم و اَدب کا ایک اور چراغ بجھ گیا۔ مولانا مودودی کے ایک خاموش شیدائی، ماسٹر فتح خان دنیائے فانی سے رخصت ہوئے۔ وہ کیا رخصت ہوئے ایک عہد کا خاتمہ ہوا۔ وضع داری اور تہذیب کا انتہائی نفیس نمونہ ہماری نگاہوں سے اوجھل ہوا۔ سیانے کہتے ہیں کہ عالم کی موت ایک عالَم کی موت ہوتی ہے۔ یہ مثل اُن پر صادق آتی تھی۔

فتح خان صاحب عوام پسند آدمی نہ تھے۔ اُن کا شمار اُن لوگوں میں ہوتا تھا جو عمل اور اِیثار کرنے میں پیش پیش رہتے مگر ذاتی نمود کی خاطر کبھی شہرت کے طالب نہ ہوتے۔ اُن کی رحلت کا افسوس نہیں کیونکہ یہ دنیا دارالفنا ہے۔ سبھی کے پیمانۂ زیست نے بھرنا اور ہر ذی روح نے مرنا ہے۔ افسوس فقط اِس بات کا ہے کہ اب اُن جیسے عربی اور فارسی کے قابل معلم کہاں پیدا ہوں گے۔

جناب فتح خان کے سینے میں اسلام اور قرآن مجید کی سچی محبت کُوٹ کُوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ نماز اور قرآن، بس اِن ہی دو چیزوں کی حرارت سے وہ ہمیشہ متحرک رہے۔ عربی زبان پر اتنا عبور حاصل تھا کہ آزمانے کے لیے کہیں سے کوئی عربی عبارت پڑھی جاتی، تو فوراً ترجمہ کر دیتے۔ قرآن مجید میں سے جہاں سے دل چاہے، کوئی آیت پڑھیے، اگلے ہی لمحے اُس کا ترجمہ اور تفسیر بیان کر ڈالتے۔

اِسی طرح فارسی اور اُردو سے بھی عشق تھا۔ وہ پہلی ہی ملاقات میں آدمی کا دل جیت لیتے لیکن ہر ملنے والا اُن کی علمی اور دِینی لیاقت کا اندازہ نہ کر سکتا تھا۔ وجہ اُن کی عاجزی اور اِنکسار تھا۔ وہ ملنے والے کو پہلی ہی نظر میں تول لیتے، پھر اُس کی ذہنی سطح کو مدِنظر رکھ کر گفتگو کرتے۔ اگر ملاقات کرنے والے سے ذہنی اور قلبی ہم آہنگی محسوس کرتے، تو پھر بھرپور علمی گفتگو فرماتے، ورنہ عام محفلوں میں عموماً خاموش رہتے۔ بات جس موضوع پر بھی کرتے، اُس سے مکمل انصاف کرتے۔ سطحی اور عام گفتگو بہت کم پسند کرتے۔ مولانا مودودی کی ذات سے اُنھیں عشق تھا۔

اکبر الہ آبادی، علامہ اقبال اور مولانا مودودی کو اُمتِ مسلمہ کے خصوصاً مسلمانانِ برعظیم کے حقیقی رہنما اور بالغ نظر مفکر کے طور پر دیکھتے۔ اقبال کے اشعار اِس انداز سے

پڑھتے کہ یوں محسوس ہوتا تھا کہ اُن کے اندر اقبال کی روح بول رہی ہے۔ اقبال کے فارسی کلام پر اُن کی نظر گہری تھی۔ اپنی وفات سے کوئی چھ ماہ پہلے اقبال کے فارسی کلام کے مجموعے مجھے عنایت کر دیے۔ 'زبورِ عجم' کا مطالعہ اکثر اوقات کرتے رہتے۔

راقم الحروف ہر دو ماہ بعد اُن کے ہاں حاضر ہوتا، تو زیادہ گفتگو دینِ اسلام، عربی اور فارسی زبان کی اہمیت، اردو ادب اور ملکی حالات پر ہی ہوتی۔ جب کوئی رائے دیتے یا گفتگو میں حصہ لیتے، تو اپنی بات کے حق میں قرآنی آیت کا حوالہ دیتے۔ احادیث بھی بیان فرماتے اور موقع کے مطابق اکبر یا اقبال کے اشعار سے بھی مدد لیتے۔ ایک بار دورانِ گفتگو اقبال کا یہ شعر ارشاد فرمایا۔

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور
چراغِ راہ ہے، منزل نہیں ہے

تو میں نے کہا کہ دیکھیے اکبر نے یہی بات اپنے مخصوص انداز میں یوں بیان کی ہے۔

وہ بھی کم فہم ہے، جو خضر کا طالب نہ ہوا
وہ بھی نادان ہے، جو خضر کو منزل سمجھا

یہ شعر سنا تھا کہ بے ساختہ زبان سے واہ نکلا اور پھر اُن کی تہہ در تہہ علمی شخصیت کی پرتیں کھلنا شروع ہوئیں۔ گفتگو کے موتی بکھیرنے شروع کر دیے۔

''ماشاء اللہ! آپ نے بہت ہی بامعنی اور عین موضوع کے مطابق شعر سنایا۔ میں دیکھتا ہوں کہ آج کی نئی نسل سمارٹ فون کی جادوگری کا شکار ہو کر مطالعۂ کتب سے بہت دور جا چکی۔ آپ سے مل کر اسی لیے خوشی ہوتی ہے کہ آپ کا رجحان سطحی اور عام مشاغل کے بجائے علم و ادب کی جانب ہے۔ یہ آپ کی خوش قسمتی ہے، ورنہ تو آج کے نوجوان کو کیا پڑی کہ وہ اکبر، اقبال [illegible] حاصل کرے۔ باقی

اکبر نے تو یورپی استعماری نظامِ تعلیم کے خلاف قلمی جہاد کیا ہے اور یہ اُن کا بہت بڑا کارنامہ ہے، ورنہ برطانوی اقتدار کے عروج کے زمانے میں برملا یہ کون کہہ سکتا تھا۔

توپ کھسکی پروفیسر پہنچے
جب بسولا ہٹا، تو رندا ہے

دیکھیے اقبال نے بھی یہی بات کی ہے۔

محکوم کے حق میں ہے یہی تربیت اچھی
موسیقی و صورت گری و علمِ نباتات

اور مولانا مودودی ایسی تعلیمی اسناد کو ''ڈیتھ سرٹیفکیٹ'' کہتے ہیں۔ ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم اپنے اُن قابلِ فخر محسنوں کے ارشادات پڑھنے کے باوجود بھی ذہنی طور پر اُسی نظامِ تعلیم کے غلام ہیں۔ اکبر اور مولانا مودودی کی اسلام دوستی ہم نے تنگ نظری کہہ کر انھیں اپنے نصاب سے دور کر دیا ہے۔ رہے اقبال تو فارسی سے ہم دور کر دیے گئے ہیں۔ ویسے بھی اقبال کو ایک مشکل شاعر کہہ کر نصاب میں برائے نام جگہ دی جاتی ہے جبکہ فارسی کو نصاب ہونا چاہیے تھا تاکہ ہم اپنے عظیم تخلیقی سرمائے سے آشنا ہو سکتے۔ لیکن اب کہاں عربی اور کہاں کی فارسی؟ اب ہم نئی پود سے کیونکر یہ توقع کریں کہ وہ اپنے اُن قابلِ فخر اسلاف سے آشنا ہو گی۔''

اسی طرح ایک بار میر انیس کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے کہنے لگے:

''غالب کی طرح میر انیس بھی 'عندلیب گلشن ناآفریدہ' تھے۔ میر انیس جیسے بلند قامت اور عظیم شاعر کی شخصیت اور ادراک ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ پھر بدقسمتی سے میر انیس کو صرف بطورِ مرثیہ نگار ہی جانا گیا ہے جبکہ اُن کی تخلیقات کا بڑا حصہ جو رباعیات کی صورت میں ہے، اُس سے بہت کم لوگ آشنا ہیں۔ جو آدمی میر انیس کو صرف مرثیہ نگار کہتا ہے، وہ انیس فہمی کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ اِس سے زیادہ سبق آموز پیغام اور کیا ہو سکتا ہے کہ وہ جو انیس اپنی اِس رباعی میں دے رہے ہیں۔

کیوں زر کی ہوس میں در بدر پھرتا ہے
جانا ہو تجھے کہاں، کدھر پھرتا ہے
اللہ رے پیری میں ہوسِ دنیا کی
تھک جاتے ہیں جب پاؤں، تو سر پھرتا ہے''

اِس کے بعد بھی بڑی دیر تک میر انیس کی شاعرانہ عظمت کے حق میں دلائل دیتے رہے۔

وہ فطرتاً بہت اعتدال پسند اور میانہ رو انسان تھے۔ فرقہ بندی سے سخت نفور تھے اور فرقہ واریت کو ہوا دینے والے واعظین کرام اور مولوی حضرات کو سخت ناپسند کرتے۔ ہر مسلک کی مسجد میں نماز پڑھ لیتے۔ دین فہم تھے مگر شدت پسندی انھیں چھو کر بھی نہ گزری تھی۔ اُن کا گھر مسجد کے قریب تھا۔ بیچ میں صرف ایک دیوار لگی ہوئی تھی۔ اتفاق سے مسجد کے امام صاحب روایتی مولوی تھے جو اپنے سوا سب کو جادۂ گمراہی کا مسافر سمجھتے اور ہر کسی کو اپنے مسلکی چشمے سے دیکھتے۔

آج کی نئی نسل سمارٹ فون کی جادوگری کا شکار ہو کر مطالعۂ کتب سے بہت دور جا چکی

امام صاحب صبح نماز کے فوراً بعد مائیک پر کھڑے ہو کر جوشِ تبلیغ کا ایسا مظاہرہ کرتے کہ غالباً مردے بھی قبروں میں خوابِ عدم سے جاگ پڑتے ہوں گے۔ ہمارے ہاں بعض مذہبی حضرات کا رویہ بھی عجیب ہوتا ہے۔ کچھ کریں یا نہ کریں مگر شور و غوغا کرنے میں اُن کا ثانی نہیں ہوتا۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ یہ حضرات اپنے عمل سے اصلاح کی طرف مائل کریں نہ کہ خالی لب و لہجے سے بس لفاظی پر زور دیں۔ تو وہ مولوی صاحب بھی بس خالی خولی بے ربط اور تہی از دلائل بیان سے دوسروں کی دل آزاری ہی کا فریضہ انجام دیتے تھے۔

ایک بار راقم الحروف فتح خان صاحب سے ملنے گیا، تو بہت خاموش تھے۔ میں نے سببِ خاموشی دریافت کیا، تو بتانے لگے کہ آپ جانتے ہیں کہ ہمارا بچوں والا گھر ہے اور ''تسمیہ'' (فتح صاحب کی پوتی جس کی والدہ اُس کی پیدائش کے فوراً بعد فوت ہو گئی تھیں) چونکہ ابھی چھوٹی ہے اور اُسے اپنی پھوپھو سے بہت جذباتی لگاؤ ہے کہ ماں کو تو اُس نے دیکھا ہی نہیں، لہٰذا وہ پھوپھو ہی کو والدہ سمجھتی ہے۔ وہ مولوی صاحب کی اِس شعلہ بیانی سے صبح جلدی جاگ جاتی ہے اور وہ پھوپھو کو دوسرے سکول جانے والے بچوں کا ناشتا تیار کرنا تو دور، نماز بھی پڑھنے کی فرصت نہیں دیتی۔

آج مولوی صاحب سے میں نے یہ صورتِ حال بیان کر کے گزارش کی کہ آپ جو بیان کرنا چاہیں، وہ مائیک کے بغیر ہی نمازی حضرات کے گوش گزار کر دیا کریں، تو بہتر ہو گا۔ جواباً مولوی صاحب نے کہا کہ یہ تو اُس بچی کی خوش قسمتی ہے کہ وہ میرا بیان سننے کی خاطر جاگ جاتی ہے۔ یوں جو بات میں نے مولوی صاحب کو سمجھانا چاہی، وہ موصوف کی سمجھ ہی میں نہیں آئی۔ عجیب زمانہ آ گیا ہے کہ یہ ''صاحبانِ جبہ و دستار'' بچوں اور مریضوں کو چند لمحوں کی نیند بھی نہیں نصیب ہونے دیتے۔ دیکھیے ہمارے وطن میں جہاں دیگر مذاہب کے ماننے والے پوری آزادی کے ساتھ رہ رہے ہیں، وہاں محض اختلافِ مسلک کی بنا پر اپنے کلمہ گو بھائیوں کو برداشت نہ کرنا یہ ہٹ دھرمی اور کم عقلی ہے اور ہمارا حال تو وہی ہے جو اکبر نے بیان کیا ہے کہ۔

کبھی اسلام لائے تھے کہ ہو دینِ خدا قائم
اور اَب مشرب بدلتے ہیں کہ ہو اپنا جتھا قائم

اِسی طرح نومبر ۲۰۲۰ء کی بات ہے۔ میں اُن سے ملنے گیا ہوا تھا کہ اُنہی دنوں اردو ڈائجسٹ کے بانی و مدیر ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی صاحب نے رحلت فرمائی۔ میں نے جب

ڈاکٹر صاحب کے انتقال کا بتایا، تو آبدیدہ ہوگئے۔ فرمایا:

"قریشی برادران کو اُن کی حق گوئی پر داد دینی چاہیے کہ آمریت کا جبر اُنھیں جھکا نہ سکا اور ہر دور میں وہ آزادیٔ صحافت کی خاطر صعوبتیں برداشت کرتے رہے۔" پھر بڑی دیر تک افسردگی کے عالم میں رہے۔

جن دنوں امریکی افواج نے افغانستان سے انخلا شروع کیا اور پھر بعدازاں جب طالبان برسرِ اقتدار آئے، تو اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے کہنے لگے:

"جو قوم قوتِ ایمانی سے کام لے کر باطل کے مقابلے میں ڈٹ جاتی ہے، اُس قوم کو اُس کے نظریۂ حیات سے دور کرنا ناممکن ہے۔"

لیکن جب طالبان نے لڑکیوں کی تعلیمی درس گاہوں کو بند کر کے اُن کے لیے اعلیٰ تعلیم ممنوع قرار دی، تو اس پر وہ طالبان کے طرزِ عمل سے مایوس ہوگئے۔ اس سوچ کو وہ بہت خطرناک اور پسماندہ قرار دیتے تھے۔ اُن کے خیال میں تعلیمی اداروں کو بند کرنے کے بجائے وہاں عیسائی مشنریوں کا رائج کردہ نصاب تبدیل کرنے کی ضرورت تھی۔ اُن کا اس حقیقت پر ایمان تھا کہ ایک تعلیم یافتہ عورت ہی بہترین ماں ثابت ہوسکتی ہے۔ وہ صرف جسمانی پرورش ہی کو والدین کا فریضہ نہ سمجھتے بلکہ اُن کے نزدیک بچوں کی مثبت تعلیم و تربیت ہی اصل فریضہ تھی۔

چھوٹے بچوں کو پڑھتے یا لکھتے دیکھتے، تو نہ صرف خوش ہوتے بلکہ انعام بھی دیتے۔ اُن کی نواسیاں میرے پاس پڑھتی تھیں اور مَیں روزانہ اُنھیں دو چار بار تختی لکھوایا کرتا۔ کبھی کبھار اپنی بیٹی کے ہاں تشریف لاتے، تو بچوں کو تختی لکھتے دیکھ کر بہت خوش ہوتے۔ وہ بچیاں مجھے ماموں کہتی تھیں کہ اُن کی والدہ نے مجھے اپنا منہ بولا بھائی کہا ہوا تھا۔ ایک [illegible] ادھر [illegible] سے تھے [illegible] گفتگو ہو رہی [illegible] اُن کی

پانچ برس کی نواسی نُبیہ ایمان پاس آکر مجھ سے بولی:

"ماموں! مَیں آب دان سے لوٹا بھر کر بیت الخلا سے آؤں؟"

پانچ برس کی بچی کی زبان سے وہ "آب دان" اور "بیت الخلا" جیسے لفظ سن کر بہت خوش ہوئے۔ پھر فوراً بچی سے کہا "بیت الخلا کو انگریزی میں کیا کہتے ہیں؟"

بچی نے جواب دیا "بابا جی! انگریزی میں باتھ روم کہتے ہیں۔"

اس پر ننھی بچی کو سو روپے انعام کے طور پر دیے۔ پھر مجھ سے گفتگو کرتے ہوئے یوں گویا ہوئے:

"آج کے تعلیمی اداروں میں انگریزی پر بہت زور دیا جاتا ہے جبکہ اردو اور خوشخطی پر کوئی خاص توجہ نہیں دی جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ اُن اداروں سے نکلنے والے بچے اپنی مادری اور قومی زبان میں بھی اپنے خیالات کی بھرپور ترجمانی نہیں کر سکتے۔ آپ نے بچوں کی خوشخطی اور اُردو ذخیرۂ الفاظ بڑھانے پر جو خصوصی توجہ مرکوز کر رکھی ہے، یہ عمل بہت مثبت ہے۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ سکول میں جس پہلو پر کم توجہ دی جاتی ہے، آپ اُس کی تلافی شام کو تین چار گھنٹوں میں بخوبی کر دیتے ہیں۔" یوں جہاں چھوٹی بچی کی حوصلہ افزائی کی، وہاں پڑھانے والے کی محنت کو بھی سراہا۔

مجھے فطرتاً علم و ادب سے وابستہ بزرگوں سے ملنے کا اشتیاق رہتا ہے۔ جب معروف محقق، نقاد اور شاعر ڈاکٹر تحسین فراقی سے نیاز حاصل ہوا، تو میں وقتاً فوقتاً اُن کی خدمت میں خط لکھتا رہتا اور آج بھی میری اُن سے خط کتابت ہے۔ ایسے ہی کسی خط کے ہمراہ مَیں نے ڈاکٹر صاحب کو فتح خان صاحب کی نواسیوں یشفع ایمان اور نُبیہ ایمان کی لکھائی کے نمونے ارسال کر دیے۔ فراقی صاحب ٹھہرے ایک صاحبِ دل اور شفیق ہستی، سو جب مارچ ۲۰۲۲ء میں ڈاکٹر صاحب اسلام آباد اکادمی ادبیات میں تشریف لائے، تو مَیں خدمت میں حاضر ہوا اور ننھی یشفع ایمان کو فراقی صاحب سے ملوانے ساتھ لے گیا۔ فراقی صاحب بچی کی خوشخطی اور ذہانت سے بہت خوش ہوئے اور بچی کو ایک ہزار روپے انعام کے طور پر عنایت فرمائے۔ واپسی پر مَیں نے جب فراقی صاحب کی اس محبت و شفقت کا ذکر کیا، تو پھر اُن سے ملنے کا اشتیاق ظاہر کیا اور غائبانہ مداح بن گئے۔ مَیں نے جب فراقی صاحب کا یہ شعر سنایا کہ

اے ذاتِ اَحد کے ناز بردار

اُمت تری خادم بتاں ہے

تو بے ساختہ واہ واہ پکار اُٹھے۔ پھر یوں گویا ہوئے:

"ہر دور میں غدار تو رہے ہیں نا۔ تاریخ شاہد ہے کہ مسلمانوں کو شکست ہمیشہ اپنی صفوں میں موجود ملت فروشوں کی وجہ سے ہوئی۔ جنگِ عظیم اوّل کو ذہن میں رکھیے، پھر شریفِ مکہ کا کردار بھی دھیان میں رہے، تو پھر خود ہی غور کیجیے کہ اکبر کے اس لافانی شعر کا پس منظر اور مفہوم کیا ہے؟

نئے زمانے کی ہسٹری کے عجیب مفہوم بن رہے ہیں

کہ خدمتِ دَیر کے عوض حرم کے مخدوم بن رہے ہیں"

پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگے:

"آپ خوش قسمت ہیں کہ ڈاکٹر تحسین فراقی جیسے بزرگ اور صاحبِ علم انسان سے آپ کا رابطہ ہے۔ ایسے صاحبِ علم اب آئندہ پیدا نہ ہوں گے۔ آپ کو ڈاکٹر صاحب سے مزید رہنمائی لینی چاہیے۔"

فتح خان صاحب کی فطرت میں صاف گوئی داخل تھی۔ وہ یا تو کھلے دوست ہوتے یا سراسر مخالف۔ ذاتی مفاد کی خاطر مصلحتاً خاموش ہو جانا یہ منافقت ہے اور اُنھیں اس سے سخت نفرت تھی۔ اُن کا خاندان بہت بڑا تھا۔ خاندان کے باقی لوگ مختلف سیاسی جماعتوں سے وابستہ تھے۔ جب بھی انتخابات میں اُن کے پاس ووٹ کے لیے کوئی وفد آتا، تو

صاف صاف کہہ دیتے کہ میری زندگی جماعتِ اسلامی کے لیے وقف ہے اور حقیقت بھی یہی تھی کہ وہ اپنی ذات نہیں، دوسرے انسانوں کی بھلائی کے لیے زیادہ تر سوچتے تھے۔

آج سے کوئی پندرہ سولہ سال قبل جب اُن کے گاؤں میں واٹر سپلائی کا منصوبہ شروع ہوا، تو گاؤں والوں کی اکثریت نے مخالفت کی کہ ہمارے ہاں کنوئیں، نلکے اور موٹریں وغیرہ لگی ہوئی ہیں، لہٰذا ہمیں اس اسکیم کی کوئی ضرورت نہیں۔ فتح خان صاحب نے پہلے تو سب کو بلا کر سمجھایا کہ یہ ہم سب کا فائدہ ہے۔ آپ لوگ یونہی مخالفت نہ کریں، آج یہ کام ہو رہا ہے، تو ہونے دیں۔ اگر آج یہ منصوبہ رک گیا، تو پھر آنے والے وقت میں شاید ہی ہمیں ایسا کوئی موقع ملے۔ لیکن سب مخالفت پر ڈٹے رہے۔

آخر کار اُنھوں نے تجویز دی کہ آپ لوگ کام ہونے دیں، آپ میں سے کسی سے بل وصول نہ کیا جائے گا۔ جو شخص پانی حاصل کرے گا، اُس کا بل میں اپنی جیب سے ادا کروں گا۔ یوں واٹر سپلائی کے ذریعے سب کو صاف ستھرا پانی میسر آ گیا اور فتح خان صاحب نے ہمیشہ اپنے وعدے کا پاس رکھا اور پورے گاؤں کے پانی کا بل وہ خود اپنی جیب سے ادا کرتے رہے۔ وفات سے قبل اُنھیں سب سے زیادہ فکر بھی یہی تھی کہ میرے بعد یہ ذمے داری کون اٹھائے گا۔ وہ اپنے بھتیجے، چچازاد بھائی کو آخر اس کام کے لیے نصیحت کر گئے کہ میرے بعد یہ پانی کا بل آپ ادا کرتے رہنا۔

وہ بنیادی طور پر عربی کے استاد تھے۔ ۱۹۶۴ء سے لے کر ۱۹۹۴ء تک تیس سال اُنھوں نے قوم کے بچوں کو عربی پڑھائی۔ وہ بچوں کی تعلیم و تربیت کے متعلق بہت سنجیدہ رہتے تھے۔ اپنے بچوں کو اچھی تعلیم دلوائی۔ بچیوں کو خصوصی طور پر 'تفہیم القرآن' کا مطالعہ کرایا تاکہ وہ کل کو اپنے خاندان کی بہترین بنیاد رکھیں۔ پردے کے بہت حامی تھے اور نماز تو گویا اُن کی روحانی مسرت کا سب سے بڑا ذریعہ تھی۔

راقم الحروف نے اُنھیں ۷۵ برس کی عمر میں دسمبر کی سرد ترین راتوں میں ٹھنڈے پانی سے وضو کر کے ربِ کائنات کے آگے سجدہ ریز ہوتے دیکھا۔ آخری برسوں میں اُنھیں پیشاب کی تکلیف رہتی تھی اور کپڑے پاک نہ رہتے۔ مگر وہ ہمیشہ ایک اضافی شلوار اپنے پاس رکھتے تھے۔ جہاں کہیں بھی نماز کا وقت ہوتا، فوراً شلوار تبدیل کر کے نماز ادا کرتے۔

باجی تبسم نے مزید حالات بتاتے ہوئے آگاہ کیا ''جب میری رخصتی ہوئی، تو ابا جان نے مجھے رخصت کرتے وقت جو نصیحت کی، وہ یہ تھی کہ بیٹی! اب آپ نئے گھر میں جا رہی ہو۔ ہو سکتا ہے وہاں تمھیں ماں کی شفقت اور باپ کا پیار نہ ملے مگر بیٹی اپنی آواز نیچی رکھنا اور یاد رکھنا کہ اگر آپ بھی اُن لوگوں کے شور کے بدلے شور مچاؤ گی، تو معاشرے والے اُنھیں کچھ نہ کہیں گے، الٹا آپ کے متعلق یہ کہیں گے کہ اِسے تربیت ہی نہیں دے کر بھیجی گئی۔ لہٰذا صبر سے کام لینا اور نماز و قرآن مجید سے دور نہ رہنا۔ اللہ پاک آپ کے لیے آسانیاں پیدا فرمائے گا۔'' یہ نصیحت گویا کوزے میں دریا بند ہے۔

فتح خان صاحب موسمِ سرما میں اکثر علیل ہو جاتے تھے۔ اِس بار بھی ۱۵ دسمبر کو علیل ہوئے مگر کسی کو اندازہ نہ تھا کہ یہ علالت ہمیشہ کی جدائی کا پیش خیمہ بنے گی۔ اُن سے ملاقات کو تقریباً چار ماہ بیت چکے تھے۔ علالت کی خبر بھی مجھے مل چکی تھی، لہٰذا میں ۱۹ دسمبر کو حاضرِ خدمت ہوا۔ سلام کا جواب ہمیشہ کی طرح بارعب آواز میں دیا۔ میں نے خیر خیریت دریافت کی، تو فرمایا:

''الحمدللہ خیریت ہے۔ بس تھوڑا علیل ہوں۔ آپ دعا کریں کہ اللہ صحت عطا کرے یا خاتمہ بالخیر ہو۔'' پھر افسوس بھرے لہجے میں بولے ''آپ بہت دور سے صرف ملنے آئے ہو بیٹا لیکن میرا عالم یہ ہے کہ میں اب گفتگو کرتے ہوئے تھکاوٹ محسوس کرتا ہوں۔ اللہ آپ کو سلامت رکھے۔''

یہ کہہ کر آنکھیں موند لیں۔ صاف طور پر نظر آ رہا تھا کہ اب یہ چراغ بجھنے کے قریب ہے۔ میں بہت اداس ہو کر واپس آ گیا۔ بعدازاں اُن کے بیٹوں سے حال احوال دریافت کرتا رہتا تھا اور پھر زیارت کا قصد بھی تھا کہ جنوری کو بعد از نمازِ عشاء یہ خبر آ گئی کہ عربی کا یہ قابل معلم اور قرآن مجید و نماز کا یہ عاشق اپنے رب کے حضور حاضر ہو گیا۔ ۸ جنوری بروز اتوار دِن کے دو بجے اُن کی نماز جنازہ ادا کی گئی اور پھر اُنھیں سپردِ خاک کر دیا گیا۔ ع

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

وہ علم کی دولت سے مالا مال ہونے کے ساتھ ساتھ دنیاوی شان و شوکت کے مالک بھی تھے۔ اُن کی ذاتی جائیداد کوئی تین سو ایکڑ سے زیادہ تھی۔ مگر اُنھوں نے بچپن ہی سے قبائے امارت کے بجائے علم کی خلعت اوڑھ لی تھی۔ دنیا میں یوں زندگی بسر کر گئے جیسے کوئی مسافر تھوڑی دیر کے لیے چھاؤں میں بیٹھتا ہے۔ میں سوچتا ہوں اب اُن جیسے شفیق، باعلم اور وضع داری کے نمونے کہاں ملیں گے۔

راقم الحروف نے اُن کی رحلت پر درج ذیل نظم کی صورت میں اپنے درد و کرب کو بیان کیا ہے۔

آج پھر ہمارے صبر کا امتحان ہوا
جدا ہم سے آج اک مہربان ہوا
تا عمر رہے گا یہ احساس ہائے یتیمی
گھر آپ کا، تو دل میرا ویران ہوا
فرقہ بندی و خوشامد و تعصب سے دور رہے
دل اُن کا ہمیشہ رفیقِ زبان ہوا
مجھ سے پوچھو کہ اُن کی رحلت سے
کتنا شہرِ علم و ادب کا نقصان ہوا
جس کے اخلاقِ کریمانہ کی یاد نہ جائے گی دل سے
افشاں رخصت آج دنیا سے ایسا انسان ہوا

تازہ افسانہ ــــ رُوبینہ قریشی

ادراک

ازدواجی زندگی میں چھوٹی چھوٹی باتوں کو اَنا کا مسئلہ بنانے سے نتیجہ اچھا نہیں نکلتا

پچھلے تین منٹ سے سمیر، موٹر سائیکل کا ہارن بجا رہا تھا لیکن میرا دروازہ کھولنے کے لیے نہیں آئی۔ آخر جھنجھلا کر اس نے خود ہی گیٹ پر لگی کال بیل بجانے کا سوچا۔ جب گیٹ پر پہنچا تو دیکھا کنڈی کھلی ہوئی تھی۔ صرف گیٹ کے اوپر اندر سے کھلنے والا سادہ کنڈا بند تھا۔

سمیر نے گیٹ کے اوپر سے ہاتھ ڈال کر کنڈا کھولا۔ موٹر سائیکل اندر لایا۔ شدید گرمی، حبس اور بہتے ہوئے پسینے سے اُس کی حالت خراب ہو رہی تھی، پھر دھوپ میں اتنا انتظار کرنے کے بعد جب اُس نے دیکھا کہ گیٹ بھی مکمل بند نہیں تھا تو اُس کا پارہ چڑھ گیا۔ وہ دھاڑا:

''میرا! میرا..... بہری ہو۔ کب سے گیٹ پر کھڑا ہوں اور آج پھر گیٹ کھلا ہوا تھا۔ کسی دن تم نقصان اٹھاؤ گی، تب تمھیں سمجھ میں آئے گا، میں کیوں بکواس کرتا تھا کہ گیٹ مکمل بند رکھا کرو۔''

میرا آٹے والے ہاتھوں کے ساتھ باورچی خانے میں سے باہر جھانک کر بولی:

''سوری میرا! ابھی شازیہ دہی مانگنے آئی تھی، تو میں نے اسے کہا تھا، تم گیٹ اوپر سے بند کر کے جانا، پھر میں آ کر نیچے کی کنڈی لگا لوں گی۔''

سمیر کو یقین ہی نہیں آیا کہ یہ میرا ہی ہے جو اتنے آرام سے اس سے بات کر رہی ہے۔

تھوڑی دیر میں میرا ہاتھ دھو کر ٹھنڈے پانی کا گلاس لے کر آئی: ''یہ آپ تھوڑا سا پانی پی لیں، میں سکنجبین بنا کر لا

رہی ہوں۔"

اب تو عمیر کو شک ہونے لگا کہ آج شاید سمیرا کے دماغ کی کوئی کل واقعی ڈھیلی ہوگئی ہے۔

وہ آپس میں خالہ زاد تھے۔ اُن کی شادی کو سات سال ہو چکے تھے۔ شادی کے پہلے تین سال کے دوران اِن دونوں کے پیار کی سب لوگ مثالیں دیتے تھے۔ اور اَب یہ حالات تھے کہ اگر عمیر کبھی سمیرا سے یہ کہتا "آگے سے ہٹنا، مجھے دیر ہو رہی ہے۔"

سمیرا کہتی "میں بالکل ہی ہٹ جاؤں گی، آپ کی زندگی سے ہی نکل جاؤں گی۔ آپ ہر وقت میرے ساتھ لڑتے رہتے ہیں۔"

گھر میں دونوں میاں بیوی کی لڑائی کی وجہ سے چھ سالہ عزیر اور چار سالہ عینی بھی بہت چڑچڑے ہو چکے تھے۔ عزیر باپ کی طرح چلّا چلّا کر بولنا سیکھ چکا تھا اور عینی جونہی کسی کو اونچا بولتے ہوئے سنتی، تو خوف زدہ ہو کر منہ کے بل گر جاتی۔ کئی مرتبہ وہ اِسی حالت میں سو جاتی۔

گھر کے حالات دن بدن خراب ہوتے جا رہے تھے جن کی ذمے داری عمیر، سمیرا پر ڈالتا تھا۔

☆☆

عمیر نہ صرف سمیرا کی خالہ کا بیٹا بلکہ اُس کی پہلی محبت بھی تھا۔ بچپن کی دوستی جوان ہونے پر محبت میں بدل گئی۔ سمیرا کی شادی عمیر سے طے پائی، تو باقی سارے خاندان والوں نے حیرت کا اظہار کیا۔ سمیرا نسبتاً زیادہ آسودہ حال گھرانے سے تھی جبکہ عمیر کے گھر کے مالی حالات زیادہ اَچھے نہیں تھے۔

پہلے تین سال تو ٹھیک گزر گئے، لیکن جب سے سمیرا کی نند بختاور کی ملازمت شروع ہوئی اور پھر اُس کی شادی اپنے میکے سے بہتر گھر میں ہوئی، تو سمیرا ہر وقت اپنا اور اُس کا موازنہ کرتی رہتی۔

اُسے دکھ ہوتا کہ وہ بڑے گھر سے چھوٹے گھر میں آ گئی جبکہ نند چھوٹے گھر سے بڑے گھر میں گئی تھی۔ اور جب بختاور نے شادی کے پہلے سال میں ہی اپنی گاڑی الگ خرید لی تب سے سمیرا ہر وقت اندر ہی اندر کڑھتی رہتی تھی۔

آخر اُس دن لاوا پھٹ پڑا جب بختاور کے پہلے بچے کی پیدائش پر عقیقہ کے لیے جانا تھا۔ بختاور نے کہا کہ شوہر کے سارے رشتے دار آئے ہوئے ہوں گے۔ اُن کے سامنے آپ لوگ رکشے پر مت آئیں، کسی دوست سے گاڑی مانگ لیں یا گاڑی کرائے پر لے کر آئیں۔"

سمیرا نے چڑ کر کہا "آپ کی بہن کے تو ٹھاٹ باٹ نرالے ہیں۔ اُس کا شوہر کتنا اچھا ہے۔ اُس کی ہر بات مانتا ہے۔ اُسے الگ گاڑی بھی لے کر دے دی ہے۔"

"شوہر نے گاڑی نہیں دی بلکہ وہ خود ملازمت کرتی ہے۔ اُس نے خود قسطوں پر لی ہے۔" عمیر نے نرم لہجے میں اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔

اگلے روز کرائے کی گاڑی میں عمیر اور سمیرا بچوں کے ساتھ بختاور کے گھر پہنچے۔ اُس کے جیٹھ زبیر بھائی بھی اپنے کنبے اور والدہ کے ساتھ پہلے سے موجود تھے۔ زبیر نے ہی عرصہ پہلے ایک استعمال شدہ گاڑی خریدی تھی۔ بختاور کے گھر بیٹھنے کا انتظام لان میں تھا جبکہ اطراف میں کھانے کی میزوں پر کھانا لگایا جا چکا تھا۔

سب لوگ جا کر اپنی مرضی سے کھانے کے لوازمات لیتے اور واپس اپنی کرسیوں پہ بیٹھ کر کھانا کھانے میں مشغول تھے۔ بچوں نے کھانا شروع ہونے سے پہلے خوب شور مچایا تھا۔ جیسے ہی ماؤں نے بچوں کی پلیٹوں میں حسب پسند کھانا ڈالا تو بچے سکون سے کھانے میں مصروف ہو گئے۔

کھانے کے دوران عزیر نے اپنے بڑے کزن سے کہا "پتا ہے آج ہم گاڑی میں آئے ہیں۔ بہت مزا گاڑی میں آنے کا۔"

''لیکن یہ مزا بس آج کے دن تک ہی ہے۔ تمہارے باپ کی کون سی اپنی گاڑی ہے، کرائے پر لی ہے۔''

سمیرا بھی قریب ہی کھڑی یہ سب سن رہی تھی۔ اُس نے فوراً جیٹھ کے بیٹے کو ڈانٹ کر کہا: ''تمہارے باپ نے بھی ابھی دو مہینے پہلے ہی گاڑی خریدی ہے۔ اِس سے پہلے تم لوگ بھی ویگنوں پر دھکے کھاتے تھے۔''

عمیر اُسی میز پر پلیٹ میں کھانا نکال رہا تھا۔ سمیرا کی بات سنی، تو اُس نے کولڈ ڈرنک لے کر آتے بختاور کے شوہر ابراہیم کا لحاظ کیے بغیر بیوی کو برے طریقے سے اُس کے سامنے ڈانٹا:

''سمیرا! مسئلہ کیا ہے تمہارے ساتھ؟ بچوں کے ساتھ لڑائی کرتے ہوئے شرم آنی چاہیے تمہیں..... دماغ خراب ہے تمہارا۔''

بختاور کا شوہر چند سیکنڈ کے لیے رُکا، سمیرا کو دیکھا اور آگے چل دیا۔

بے عزتی کے احساس سے سمیرا کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ آنسو روکتے ہوئے اُس نے کھانے کی پلیٹ وہیں رکھی اور تیزی سے لاؤنج میں آئی۔

ڈانٹ، ڈپٹ اور لڑائی جھگڑا تو روز کا معمول تھا لیکن بختاور کے شوہر کے سامنے اپنی بے عزتی سے اُس کے آنسو نہیں رک رہے تھے۔

تھوڑی دیر میں ہی وہ آنکھ میں کچھ پڑنے کا بہانہ بنا کر بچوں کے ساتھ واپس جا چکی تھی۔

شادی کے بعد اُس نے عمیر سے یہ وعدہ لیا تھا کہ لوگوں کے درمیان کبھی مجھے نہیں ڈانٹیں گے لیکن اُس دن بختاور کے شوہر کے سامنے ہوئی بے عزتی اُسے بری طرح کھل رہی تھی۔

اب سمیرا نے گویا تہیہ کر لیا کہ ہر بات میں عمیر کو طعنے دینے ہیں اور چھوٹی سی بات بڑھا کر لڑائی شروع کر دینی ہے۔

ابھی مہینا بھر پہلے اُن کی شدید لڑائی ہوئی۔ نتیجے میں عمیر نے اپنا بیگ تیار کیا اور سمیرا سے کہا:

''مَیں اب اِس جہنم میں مزید نہیں رہ سکتا۔ تم یہیں رہو، تمہیں ہر ماہ خرچہ ملتا رہے گا۔''

''وہ خرچہ! وہ چند ہزار رُوپے۔ وہ بھی مت بھیجنا، مَیں اپنے باپ کے گھر چلی جاؤں گی۔'' سمیرا نے غراتے ہوئے کہا۔

''میری جتنی تنخواہ ہے، تمہاری ہتھیلی پر لا کر رکھ دیتا ہوں..... آخر تم چاہتی کیا ہو؟'' اب عمیر نے بے بسی سے کہا۔

''بس، آپ مجھے ملازمت کی اجازت دیں۔ اگر آپ کی بہن کر سکتی ہے، تو کیا مَیں نہیں کر سکتی؟''

''سمیرا! تم بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ وہ شادی سے پہلے بھی ملازمت کرتی تھی۔ پھر اُس کے گھر میں اُس کی ساس ہیں۔ وہ گھر کو.....''

''بس کر دیں، بس کر دیں..... مجھے مت بتائیں کہ اُس کی ساس اُس کے ساتھ رہتی ہے اور مَیں ساس سے الگ رہتی

ہوں۔'' سمیرا نے غصّے سے چلّاتے ہوئے اُس کی بات کاٹ دی۔

''یہ کوئی جھوٹ نہیں کہ تمہارے ہی کہنے پر مَیں الگ ہوا تھا۔ اکٹھے رہنے میں ہم دونوں بھائیوں کا فائدہ تھا۔ اب گھر کا کرایہ.....''

''ہاں، ہاں! اب گھر کا کرایہ، بجلی، گیس کے بل سب تمہیں یاد آ جائیں گے۔ گویا وہاں پر تو گیس اور بجلی ہمیں مفت میں ملے ہوئے تھے۔'' اب پھر سمیرا نے اُس کی بات کاٹی۔

''آپ جہاں مرضی جائیں یا نہ جائیں لیکن مَیں آپ کو

بتا رہی ہوں کہ مَیں اب ضرور ملازمت کروں گی۔ مَیں اپنی چھوٹی چھوٹی خواہشات کے لیے ترستی رہتی ہوں۔ میرے پاس تعلیم ہے، مجھ میں کام کا جذبہ ہے.....“

اُس کی بات بیچ میں ہی رہ گئی اور چھوٹا عزیر آ کر بابا کی ٹانگوں سے لپٹ گیا:

”بابا! مت جائیں، مت جائیں بابا۔“

عمیر نے بیٹے کا منہ چوما، اپنا بیگ واپس رکھا اور کمرے میں خاموشی سے جا کر لیٹ گیا۔

☆☆

پچھلے ایک ہفتے سے سمیرا اور عمیر کی بات چیت بند تھی۔

سمیرا نے اپنی ملازمت کے سلسلے میں اِدھر اُدھر کئی لوگوں سے کہہ رکھا تھا۔ کئی جگہوں پر سی وی بھی بھیج رکھی تھی۔

آخر ایک جگہ سے اُس کی ایک سہیلی کے حوالے سے ملازمت مل گئی اور آج وہ دفتر جا رہی تھی۔

جب وہ دفتر پہنچی، تو ایک بڑے سے ہال نما کمرے میں میز اور کرسیوں کے ساتھ تمام ملازمین کی الگ الگ بیٹھنے کی جگہ بنی ہوئی تھی۔

باس کا کمرا بھی اُس ہال کے درمیان میں تھا جس کی پارٹیشن شیشوں کی مدد سے کی گئی تھی۔ وہاں سے باس کی نظر تمام عملے پر پڑتی تھی۔ اِس کے علاوہ کیمرے بھی جا بجا نصب تھے۔

سمیرا نے اچھے سے بال بنائے ہوئے تھے۔ ہلکا ہلکا میک اپ کیے، دوپٹہ گلے میں لیے وہ کافی پُر اعتماد دکھائی دے رہی تھی۔

اندر داخل ہوئی، تو دفتر میں موجود لوگ سر جھکائے کام میں مصروف تھے۔ ہلکی سی بھنبھناہٹ میں لوگ بہت کم آواز میں بات چیت کر رہے تھے۔ اُسے ابھی ایک ہفتے کے لیے ٹرائل پر رکھا گیا تھا۔

تھوڑی دیر میں باس اپنے شیشے کی پارٹیشن سے باہر آ کر کمپنی کے نفع اور نقصان کی پالیسیوں کے متعلق اکا دکا لوگوں سے کچھ باتیں کرنے لگا۔ پھر ایک خاتون ملازمہ کا نام لے کر اُسے کھڑا کیا اور سخت لہجے میں بات کی۔

”آپ جانتی ہیں، آپ کی غلط انفارمیشن دینے کی وجہ سے کمپنی کو کتنا بڑا نقصان پہنچ سکتا تھا؟“

”مَیں معذرت چاہتی ہوں جناب! مجھ سے غلطی ہوئی ہے۔ دراصل میرا بیٹا سیڑھیوں سے گر گیا تھا جس وجہ سے مَیں پریشان تھی، اب خیال رکھوں گی۔“

”دیکھیں محترمہ! ہر انسان کی زندگی میں بہت سارے مسائل ہوتے ہیں لیکن جب آپ اپنے کام کرنے کی جگہ پر آئیں، تو گھر کی پریشانیاں وہیں چھوڑ کر آیا کریں۔ یہاں ہم آپ کے مسائل سننے کے لیے نہیں بیٹھے۔“

”جی سر! آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔“

”شمائلہ! دو ہفتے پہلے آپ کی ساس بیمار تھیں، اب آپ کا بیٹا گر گیا ہے..... یہ ہم نے امدادی مرکز نہیں کھولا ہوا کہ آپ چھٹی پر چھٹی کرتی جائیں اور ہم آپ کو تنخواہ دیتے رہیں۔“

”جی سر! مَیں اب خیال رکھوں گی۔“

”یاد رکھیں!!! یہ آپ کے لیے آخری موقع ہے، اس کے بعد بغیر کسی پیشگی اطلاع کے آپ کو فارغ کر دیا جائے گا۔“

وہ خاتون تو بیٹھ گئی لیکن سمیرا سوچ رہی تھی کہ اتنے سارے لوگوں میں کسی خاتون کو اِس بری طرح ڈانٹنے کا کسی کو بھی کوئی حق نہیں۔ آئندہ کیسے ایسا نہیں ہوگا۔ کیا اِس کے بچے شرارت نہیں کریں گے۔ کیا اِس کی ساس جوان ہو کر صحت مند ہو جائیں گی اور کبھی بیمار نہیں پڑیں گی؟؟؟ اور بھرے لوگوں کے سامنے خاتون کی ہتک.....

اُس کے شوہر نے تو اُسے، محفل میں ڈانٹا تھا جہاں سب لوگ اپنی خوش گپیوں میں مصروف تھے اور شاید کسی کو علم بھی

کتنے مہینوں سے نہیں ہوا تھا کہ عمیر نے اُسے ڈانٹا ہے اور وُہ اور خود اپنے آپ کو تکلیف دے رہی تھی۔

وہ بچوں اور ہم گھریلو خواتین اپنے شوہر کی ڈانٹ کو اپنی انا کا مسئلہ بنا لیتی ہیں اور کہاں یہ ایک پرایا مرد بیسیوں مردوں اور عورتوں کے سامنے ایک عورت کو کھڑا کر کے ڈانٹ رہا تھا۔

چند سیکنڈ میں اُسے اپنی گھریلو زندگی کی اچھائیاں نظر آنا شروع ہو گئیں۔ اُس کی طبیعت خراب ہو، تو عمیر سے کہنا کہ کھانا باہر سے ہی لے آئیں۔ وقت، بے وقت آرام کر لینا، گھر کے کاموں کو اپنی مرضی سے آگے پیچھے کر کے انجام دے لینا۔

پھر اُس کی تمام غلطیاں آنکھوں کے سامنے گھوم گئیں۔ اُس کا عمیر کے ساتھ بدتمیزی سے بات کرنا، اُس کی زبان درازی کی وجہ سے عمیر کا غصّے میں بے قابو ہو کر اول فول بولنا، معصوم عینی کا سہما ہوا چہرہ اور عزیر کا باپ کی طرح چلّا چلّا کر بات کرنے کا انداز......

سمیرا نے فیصلہ کرنے میں دیر نہیں لگائی۔

☆☆

”عمیر! آپ کمرے میں آ کر لیٹ جائیں۔ مَیں سکنجبین لے کر وہاں ہی آ رہی ہوں۔“

سمیرا ہاتھ میں جگ، گلاس والا ٹرے پکڑے ہوئے عینی اور عزیر کو ساتھ لیے کمرے میں جاتے ہوئے عمیر سے بولی۔

عمیر خوشگوار حیرت کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ باہر کی کڑکتی دھوپ سے ٹھنڈے کمرے میں پیارے پیارے بچوں اور بیوی کے ساتھ بیٹھ کر بے ساختہ اُس کی زبان سے نکلا ”الحمدللہ!“

”کیا ہوا؟“

سمیرا نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

”کچھ نہیں یار! باہر گرمی بہت تھی، تو تمہیں ڈانٹ دیا۔“

”چلیں چھوڑیں اُس بات کو..... بچوں کو اندر ہی روک کر رکھیں۔ باہر بہت گرمی ہے۔ مَیں کھانا یہاں ہی لے کر آتی ہوں۔“

سمیرا کھانا نکالتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ اب عمیر کو کبھی نہیں تنگ کرنا، اور اُسے یہ بھی بتانا ہے کہ آج کے واقعے کو دیکھ کر مجھے، اُس کی قدر و منزلت کا کتنا اچھا ادراک ہوا ہے۔

آزادی کی فکر

ایک بار برطانیہ کے وزیرِ اعظم لائیڈ جارج پارلیمنٹ میں تقریر کرتے ہوئے بولے:

”ہم ڈنمارک اور ناروے کی آزادی کے لیے لڑیں گے۔ ہمیں عوام کی خاطر لڑنا پڑے گا۔ ہم سوئٹزرلینڈ کی آزادی کے لیے لڑیں گے۔“

اُنھوں نے کئی ممالک کے نام گنوا دیے۔ حزبِ اختلاف کے سربراہ نے جھلّا کر کہا:

”اور ہم جہنم کی آزادی کی خاطر لڑیں گے۔“

”ضرور، ضرور!“ مسٹر لائیڈ مسکراتے ہوئے بولے۔

”ہر شخص کو اپنے وطن کی آزادی کی فکر ہوتی ہے۔“

بیکار چپل

گاندھی جی ایک مرتبہ ریل میں سفر کر رہے تھے۔ ایک اسٹیشن پر اپنے ڈبے کے دروازے پر کھڑے تھے۔ ریل گاڑی آگے بڑھی، تو جھٹکے سے اُن کے پیر کی چپل نیچے گر گئی۔ گاڑی بھی رفتار پکڑ چکی تھی۔ اُنھوں نے فوراً اپنا دوسرا چپل بھی باہر پھینک دیا۔ ساتھیوں نے حیرت سے وجہ پوچھی، تو اُن کا جواب بے حد معقول تھا۔

”جس کسی کو وہ چپل ملے گی، وہ اُس کے لیے بے کار ہو گی اور یہ جو میرے پاس رہ گئی تھی، یہ میرے لیے بے کار تھی، لہٰذا مَیں نے اُسے باہر پھینک دیا کہ جسے پہلی چپل ملے گی، ڈھونڈے گا، تو دوسری بھی مل ہی جائے گی۔“

شگفتہ شگفتہ

ایک لوہار کی

ایک منفرد کردار کا دلچسپ خاکہ، ایسے سبھی کے خاندان میں مل جاتے ہیں

ہمارے بچپن کا ذکر ہے۔ ہمارے گھر میں بہت سے رسائل، بچوں کی کتب اور مواد پڑھنے کا موجود ہوتا تھا۔ بس یوں سمجھیں کہ جیسے آج کل انٹرنیٹ پر چیزیں اور تفریح کے لیے سامان ہوتا ہے، وہ سب کتب کی صورت ہمارے یہاں موجود تھا۔ اُن ہی میں ایک کتاب تھی جو ہمیں بہت پسند تھی۔ سال خوردہ اور سرورق سے محروم، بوسیدہ صفحات، مٹیالی تحریر پر مشتمل یہ کتاب بچوں کی کہانیوں کی تھی۔

بڑے ہوئے تو معلوم ہوا کہ بہت ہی گراں قدر اور مایہ ناز مصنفین کی تصانیف موجود تھیں جیسے الطاف فاطمہ کی "مائی لاڈو حقہ" اور سعید لخت کی "ہائے اللہ سانپ"۔ رضا ہمدانی کی بھی تحریر تھی جس کا عنوان ذہن میں نہیں مگر یہ یاد ہے کہ کہانی بتول اور اُس کے طوطے پر مبنی تھی جو ... آیا ... کر ... بادام کھا کر رحلت فرما گیا۔

اُن ہی کہانیوں میں ایک کسی دل جلے مصنف کی ... جو ایک بھائی جان کے گرد گھومتی تھی جو کہ نہایت سنگ دل ... ہوئے تھے۔ اُنھوں نے ایک دن مصنف سے وعدہ کیا ... شادی میں لے جائیں گے اور وعدہ پورا بھی کیا مگر اُنھیں ... کی وردی پہنوا کر لے گئے اور شامیانے کے اُس حصے میں ... دیا جہاں برتن دھوئے جا رہے تھے۔ مصنف وہاں ... بھوکے پیاسے شادی میں شرکت کر کے آگئے۔

ہمیں مصنف اور عنوان دونوں ہی یاد نہیں۔ دراصل کہا... اِس قدر وحشت ناک لگی کہ ایک شاید دو بار کے علاوہ ... پڑھنے کی ہم نے زحمت ہی نہیں کی اور پہلی ہی بار پڑھ کر ... قدرت کا شکر ادا کیا کہ اُس نے بھائی جان جیسی نعمت سے ... نہیں نوازا۔ ہمیں لگا کہ بھائی بڑا ہو یا چھوٹا، یقیناً نامعقول ہی ہوتا ہوگا۔

شاید اُس کہانی کا اثر تھا یا نجانے کیا کہ جب اچانک ... میں ایک نووارد بھائی جان کو دیکھا، تو سہم ہی گئے۔ یہ ہمارے عم زاد تھے مگر اِس قدر قدیم کہ اگر چچا بھی کہتے، تو لوگ تعجب ... لیتے۔ بہر حال اب سوچتے ہیں، تو اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کہاں ... بے خوفناک نہ تھے مگر نجانے کیوں ہم یہی تاثر لیے بیٹھے رہے۔ وہ ہمیشہ ہمیں اپنی ناک میں رکھتے کہ جیسے کسی غلطی کو کریدنے، کسی خطا کو پکڑنے وہ موجود ہیں۔ ہمیں درحقیقت اُن کا اندازہ نہیں تھا۔

والد قبلہ سے اُن کا بڑا یارانہ تھا اور ہم سے بزرگی برقرار۔ اب بھلا ہم اِس صورتِ حال میں کر ہی کیا سکتے تھے کہ کرکٹ ٹیم کے کھلاڑیوں کی طرح پہلے کے والدین بچوں کی قطار پُربہار بناتے تھے۔ اُس میں اوّلین بھائی اور تمت بالخیر میں باپ بیٹے جتنا فرق ہو جاتا تھا۔ اِس لیے چچا بھتیجا دوست اور عم زاد اور بڑا بھائی باپ بن جاتے۔ سو مجبوری جو ٹھہری، ادب آداب کا لحاظ تو کرنا ہی تھا۔ ویسے موصوف اتنے بھی شر اور ضرر رساں نہیں تھے مگر زبان دانی کا ایسا اعلیٰ معیار رکھتے تھے کہ لمحوں میں مدِ مقابل کو چاروں شانے چت گرانے میں ملکہ ہی نہیں بادشاہی بھی رکھتے تھے۔

زبان دانی کا ایک قصہ تو کچھ یوں ہے کہ گرما کی ایک سخت دوپہر تھی۔ ہمشیرائیں یونیورسٹی، کالج سے آ کر پورا اصطبل بیچ بستر توڑ رہی تھیں۔ اُن کی نیند ہمیشہ سے اِس قدر گہری ہوتی تھی کہ دنیا اِدھر کی اُدھر ہو جائے مگر وہ صورِ اسرافیل (والدہ کی گرج اور ساتھ میں کسی ہتھیار یعنی چپل جوتے کی مرمت) کے بغیر بیدار ہونا اپنی توہین تصور کرتی تھیں، تو ایسی ہی گرما کی دوپہر میں بھائی جان کی سواری بادِ بہاری کی تشریف آوری ہوئی۔

دروازے پر دستک دی۔ گھنٹی پر زور آزمائی اِس قدر فرمائی کہ بے چاری اپنے گلے کو پھاڑ کر آواز کی اصل شکل سے محروم ہوگئی۔ مگر یہ نہ تھی اُن کی قسمت کے در و بام وا ہوتے، سو نامراد لَوٹنے والے تھے کہ والدہ مع ہمارے تشریف لے آئیں۔ (اُس زمانے میں گرمیوں کی دوپہر میں خواتین بجلی، پانی کے بل بینک میں جمع کروانے جاتی تھیں اور ہم بھی وہیں سے واپس آئے تھے۔) وہ کسی ضروری پیغام کے ساتھ آئے تھے جو اُنھوں نے والدہ کو دیا اور جاتے جاتے اُن کی تربیت پر کوڑا برسا گئے "کیا دادا کی دوا استعمال کرنے لگی ہیں بچیاں۔"

پرانے وقتوں میں ڈاکٹر حضرات پیٹ کی گیس اور مختلف عوارض کے لیے حقہ، کبھی سگریٹ اور کبھی افیون تجویز کرتے تھے جو بعد میں مریض کے لیے ضروری ہو جاتا تھا۔ دادا مرحوم بھی قلیل مقدار میں ہی سہی، افیون استعمال کرتے تھے اور اِس جرم میں وہ اپنی قبر میں اِس بات کو سن کر یقیناً اضطراب سے کروٹیں لے رہے ہوں گے اور اِدھر والدہ ماجدہ نے بستر توڑتی حسیناؤں کی کمر توڑنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

ایک دفعہ کسی کے تقویٰ کا ذکر ہوا، تو فرمانے لگے:

"اُن کے تقویٰ میں لقوہ ہے۔"

والد بزرگوار کی کتب جو عموماً ہمارے دیوان خانے کی

بھائی جان اُس ننھی سی جان کی پھنکار سن کر دم سادھ کر بیٹھ گئے

میز پر دھری رہتی تھیں۔ مہمانوں کی خاطر مدارت کے وقت اُنھیں اِدھر اُدھر منتقل کیا جاتا تھا جس پر والد محترم عموماً پریشان ہو جاتے، کیونکہ وہ عموماً دو تین کتب حوالے کے لیے کھولے بیٹھے ہوتے تھے۔ ایسے میں بھائی جان، والد صاحب کی بوکھلاہٹ پر بار بار فرماتے:

"کباب تجھے ہو جائے مگر کتاب نہیں۔"

ویسے شعلہ بیانی کے علاوہ اُنھوں نے خاندان میں گراں قدر کارنامے انجام دیے جس میں کسی کو ویزا دلوانا، کسی رشتے دار کو ملازمت پر لگوانا، پھر اپنے گھر میں جگہ دینا۔ ہم بہنوں کی شادیوں میں والد صاحب کا ساتھ دینا اور بہنوں اور والدہ کو اُنھی کی فراہم کردہ رقم سے حج کی سعادت نصیب ہونا

اور اِس کے علاوہ بھی بہت کچھ مگر درحقیقت انسان قدرت کا عجیب نمونہ ہے۔ ایک طرف رشتوں سے گندھا اُن کے بغیر ادھورا اُور دُوسری سمت اُن ہی سے جلد کبیدہ خاطر ہو جانے والا۔

خیر قصہ مختصر کہ شادی تک یہ بھائی جان ہمارے حواسوں پر سوار رہے۔ بعد میں ہم کہاں، وہ کہاں مگر ایک خوف اور جھجک جو ازل سے تھی، اُس کا خاتمہ ہوا اُور ہم جو ہمیشہ اُن کی بزرگی پر شکوہ کناں رہتے تھے، اُس کا بھی خاتمہ ہوا۔

ہمارے دلِ بے قرار کو بھی قرار آیا کہ ایک دن ہم ایک عزیزہ کی عیادت کرنے اسپتال گئے۔ سب ہی خاندان کے افراد جمع تھے۔ بھانت بھانت کی آوازیں تھیں۔ ہم بھی اپنے ساتھ پیش آنے والے ایک واقعے کو پوری تصویر کشی کے ساتھ سنانے میں مگن تھے۔ غالباً وہ واقعہ ہم دوسری دفعہ کسی کے گوش گزار کر رہے تھے جو عم زاد کو مکرر گوارا نہ ہوا۔ ویسے ہی بار گراں تھا یہ صور اسرافیل سو ایک جنبشِ قلم نوک بیٹھے کہ اب بس بھی کردو۔ مقابل موجود خاتون جو کچھ ہم سے سال دو سال یا بہت زیادہ چار سال قدیم ہوں گی، وہ ہماری لن ترانی کو نہایت اشتیاق وانہماک سے سننے میں محو تھیں۔ ہم بھی واقعے کو پورے سیاق وسباق کے ساتھ دوبارہ سنا رہے تھے۔

جب عم زاد کی آواز کانوں سے ٹکرائی اور زبان تالو سے لگنے ہی والی تھی کہ محترمہ نے نہایت رعب سے بھائی جان کا نام لے کر ڈانٹ کر چپ کرایا کہ وہ ہماری بات سن رہی ہیں اور اُن کی اِس مصروفیت میں وہ خلل انداز نہ ہوں۔ ہم حیرت کی اتھا گہرائیوں میں ڈوب کر جلدی سے ابھرے کہ واقعہ بھی تو مکمل کرنا تھا۔ بھائی جان اُس ننھی سی جان کی پھٹکار سن کر دم سادھ کر بیٹھ گئے۔

گھر آکر رشتے داروں سے مکمل کوائف اُن خاتون کے معلوم کیے، تو پتا چلا کہ محترمہ اُن کی والدہ کی رشتے کی بہن ہیں اور اُسی رشتے کے حق کو استعمال کر رہی تھیں۔ اور ہم حیران کر وہ جو اَپنے چچاؤں کو کسی شمار قطار میں رکھنے کے روادار نہیں اور اُس ننھی سی خالہ سے ڈر گئے۔ پھر خیال آیا بلی بھی تو شیر کی خالہ ہے اور تبھی تو کہتے ہیں:

”سو سنار کی ایک لوہار کی۔“

کھانے کا دھوکا

جب دلّی اُجڑنے لگی اور مغلیہ سلطنت کا چراغ ٹمٹمانے لگا، تو دلّی کے بڑے بڑے کاریگر لکھنؤ جا بسے۔ لیکن وہاں بھی دلّی والوں نے لکھنؤ والوں کے دانت کھٹے کر دیے۔ اِن میں دلّی کے ایک شہزادے مرزا آسماں قدر اُور واجد علی شاہ کا ایک قصہ مشہور ہے۔

دلّی کا یہ مغل شہزادہ لکھنؤ گیا، تو واجد علی شاہ کا مہمان ہوا۔ واجد علی شاہ نے دستر خوان پر ایک مربہ لا کر رکھا گیا جو دیکھنے میں بڑا خوبصورت لگتا تھا۔ گویا ابھی تازہ اور لذیذ بنا ہے۔ مغل شہزادے نے اُسے کھایا، تو چکرا گیا، کیونکہ وہ مربہ نہیں بلکہ نمکین قورمہ تھا جس کی شکل مربے کی تھی۔ یوں دھوکا کھا جانے پر شہزادے کو بڑی خفت ہوئی۔

اُس نے بھی واجد علی شاہ کی دعوت کی۔ لکھنؤ کے بادشاہ یہ سوچ کر آئے تھے کہ دستر خوان پر اُن کے ساتھ کوئی دھوکا ہوگا، مگر وہ چوکنے رہنے کے باوجود دھوکا کھا گئے اور کھاتے چلے گئے۔

مغل شہزادے نے دستر خوان پر طرح طرح کے کھانے چنے ہوئے تھے۔ واجد علی شاہ جس چیز کو چکھتے وہ میٹھی اور شکر کی بنی ہوئی تھی۔ سالن تھے، تو شکر کے، چاول اور پلاؤ تھے تو شکر کے۔ روٹیاں، اچار اور چٹنی تک سب شکر کی۔ یہاں تک کہ سب برتن بھی شکر کے تھے۔ واجد علی شاہ گھبرا کر ایک ایک چیز پر ہاتھ ڈالتے اور دھوکا کھاتے چلے گئے۔

چابی

دورِ جدید کے اچھے بُرے تقاضوں سے نبرد آزما ایک بوڑھی کی دِل افروز کتھا

...بی پوکن نے باہر جانے کے لیے ...کا آغاز کیا۔ یہ شدید گرمی کے دنوں میں خصوصاً ایک ...مرحلہ تھا۔ سب سے پہلے اُس نے اپنے فربہ جسم پر تنگ ...گھر میں رنگے اُلجھے بالوں کو کنگھی کرکے باندھا۔ ...بوسے کا تھیلا لگ رہے تھے۔ بعدازاں اُس ...ربڑی بوسیدہ بمشکل جوتوں میں ڈالے۔ اب اپارٹمنٹ ...نے اچھے سے بند کرنے کا مرحلہ تھا تاکہ اُس کی عدم ...کا طریقے سے گھر میں گھس کر کچھ چوری نہ کرلے۔ ...کوئی پڑوسی گھر میں انسانوں کے ساتھ ساتھ شریر ...دینے والوں میں انسانوں کے ساتھ ساتھ شریر ...قوتیں بھی ملوث تھیں۔ اُسے ہردم ہوشیار رہنا ...

...ایک بار اُس نے اپنی عینک ڈریسنگ ٹیبل پر رکھی تھی جو ...بعد اُس کی جوتی میں پائی گئی۔ وہ بال رنگنے کا شیمپو ...الماری میں چھپا کر رکھتی تھی لیکن ایک دن وہ اُسے ...

اپنے تکیے کے نیچے ملا۔ ایک دفعہ اُسے اچھی طرح یاد ہے کہ اُس نے گوشت سے بھرا برتن ریفریجریٹر میں رکھا تھا، لیکن کسی بھوت نے اُسے نکال لیا اور جیسی کو کافی تلاش بسیار کے بعد وہ الماری میں سے ملا۔ خدا ہی جانتا ہے کہ اُسے کن کن اذیتوں سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ اُس نے کتنی دھونس اور دھمکیاں برداشت کیں اور پاگل پن سے بچنے کے لیے کیا کیا جتن کیے تھے۔ فون اس لیے کٹوا دیا تھا کہ کچھ دھوکے باز اور

شرارتی قسم کے لوگ اُسے دن رات فون کر کے ٹن گن لیتے تھے تاکہ اُس کے راز معلوم کر سکیں۔ ایک پورٹو ریکن دودھ والا ایک بار اُس کے اپارٹمنٹ پر قبضہ کرنا چاہتا تھا اور ایک سبزی فروش نے سگریٹ نوشی کرتے ہوئے اُس کا تقریباً سارا گھر جلا دیا تھا۔ جیسی پینتیس سال سے وہاں رہ رہی تھی۔ ہر بار مقررہ وقت پر بل ادا کرنے کے باوجود عمارت کی انتظامیہ اُس سے اپارٹمنٹ خالی کروانا چاہتی تھی۔ جیسی کا خیال تھا کہ وہ اکثر چوہے اور لال بیگ اُس کے کمروں میں چھوڑ دیتے ہیں۔

جیسی کو بہت پہلے احساس ہو گیا تھا کہ گھس بیٹھیوں کو کوئی چیز نہیں روک سکتی، دھاتی دروازے نہ خصوصی تالے اور نہ ہی پولیس سے شکایت۔ یہاں تک کے میئر کا دفتر، ایف بی آئی اور خود واشنگٹن میں صدر بھی اُس کی مدد نہیں کر سکتے تھے۔ وہ جانتی تھی جس طرح آپ سانس لیتے ہیں اور آپ کو کھانے کی ضرورت ہے۔ اُسی طرح آپ کو اپنی مدد آپ کے تحت اپنی چیزوں کی حفاظت خود کرنی پڑے گی۔

کھڑکیاں مضبوطی سے بند رکھیں، گیس کا وال چیک کرتے رہیں، الماری کی درازوں کو مقفل رکھیں۔ اُس نے اپنی دولت کو احتیاط سے انسائیکلوپیڈیا کی جلدوں میں، جغرافیہ میگزین کے پچھلے شماروں اور سام پاپکن کے بہی کھاتوں میں چھپا رکھا تھا۔ مختلف کمپنیوں کے حصص اور بانڈز متروک آتش دان میں لکڑی کے کندوں کے درمیان محفوظ تھے اور زیورات کو کرسیوں کی نشستوں کے نیچے اور گدوں میں دفن کر رکھا تھا۔ اگرچہ اُس کے پاس بینک میں محفوظ ڈیپازٹ باکس تھے، لیکن اُسے یقین تھا کہ وہاں کی انتظامیہ کے پاس دوسری چابیاں بھی ہوتی ہیں۔

جیسی کو تیاری میں تقریباً پانچ بج گئے۔ اُس نے آخری بار اپنا عکس چھوٹے دھندلے آئینے میں دیکھا۔ اُس کی پیشانی تنگ، ناک چپٹی اور آنکھیں چینیوں کی طرح چھوٹی تھیں۔ ٹھوڑی پر سفید بال نکل رہے تھے۔ اُس نے ہلکے رنگ کا پھول دار لباس پہنا ہوا تھا اور سر پر ایک سادہ تنکوں والی ٹوپی تھی جس پر سجاوٹ کے لیے لکڑی سے بنے انگور اور چیری کے [illegible] تھے۔ پیروں میں پرانے مرمت شدہ جوتے تھے۔ جانے سے پہلے اُس نے تینوں کمروں اور باورچی خانے پر ایک نظر ڈالی۔ ہر طرف کپڑے، جوتے اور لفافہ بند خطوط بکھرے تھے۔ اُس کا شوہر سام پوپکن تقریباً بیس سال پہلے فوت ہو گیا تھا۔ اُس نے موت سے کچھ دن پہلے اپنی ریئل اسٹیٹ کمپنی کو ختم کر دیا تھا کیونکہ وہ ریٹائر ہو کر فلوریڈا میں سکونت اختیار کرنے والے تھے۔

سام اُس کے لیے مختلف کمپنیوں کے حصص، بانڈز، سیونگ بینک پاس بکس اور رہن چھوڑ کر مرا تھا۔ آج بھی جیسی کو کاروبار کی رپورٹیں اور چیک ملتے رہتے تھے اور ٹیکس وصول کرنے والے ادارے کے بل بھی۔ تقریباً ہر ماہ جنازہ ادا کرنے والی کمپنی کی طرف سے اطلاع آتی تھی کہ ایک دو قبرستان میں پلاٹ موجود ہیں۔ ابتدائی برسوں میں جیسی عموماً خطوط کے جواب دیتی، چیک جمع کرتی اور آمدنی اور اخراجات کا حساب رکھتی تھی، لیکن کچھ عرصے سے اُس نے یہ نظر انداز کر دیا تھا۔ یہاں تک کہ اخبار خریدنا اور مالیاتی صفحے پڑھنے بھی چھوڑ دیے تھے۔ راہداری میں آ کر جیسی نے کچھ گتوں کو موڑ کر دروازے اور فریم کے درمیان کی درز میں پھنسا دیا اور چابی کے سوراخ کو لُبدی سے بند کر دیا تاکہ کوئی اندر نہ جھانک سکے۔ رشتے داروں اور دوستوں سے دور بے اولاد بیوہ اِس سے زیادہ اَور کیا کر سکتی ہے۔ اِس سے پہلے کہ پڑوسی دروازے کھول کر باہر دیکھتے اور اُس کی ضرورت سے زیادہ احتیاط پسندی کا مذاق اڑاتے، وہ چل دی۔

جیسی پڑوسیوں سے بات کرنا پسند نہیں کرتی تھی۔ اُسے لگتا تھا کہ وہ اُس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اُس کی نگاہ بہت کمزور ہو چکی تھی۔ کئی سال پہلے تجویز کیے گئے عینک کا اب کوئی فائدہ نہیں تھا اور نئی عینک بنوانے کے لیے عینک ساز کے پاس جانا مشکل کام تھا۔ یہاں تک کہ لفٹ میں داخل ہونا اور باہر نکلنا بھی اُس کے لیے کارِ گراں تھا جس کے دروازے ہمیشہ ایک آواز کے ساتھ بند ہوتے تھے۔ اُس نے پچھلے برسوں میں شاذ و نادر ہی گھر سے دو بلاکس سے زیادہ فاصلے کا سفر کیا تھا۔ براڈوے اور ریور سائیڈ ڈرائیو کے درمیان کی سڑکیں بدنام، پُرشور اور گنجان ہوتی جا رہی تھیں۔ نیم برہنہ بچوں کی ٹولیاں اِدھر اُدھر دوڑتی رہتیں، گھنگریالے بالوں، جنگلی جانوروں جیسی آنکھوں اور سیاہ چمڑی والے مرد اپنی پست قامت بیویوں کے ساتھ ہسپانوی زبان میں جھگڑتے رہتے، جو ہمیشہ حاملہ نظر آتی تھیں۔ وہ ہاتھ پر ہاتھ مار کر بات کرتیں۔ کتے مسلسل بھونکتے رہتے اور بلیاں خوفناک آواز میں روتی تھیں۔ وقتاً فوقتاً کہیں نہ کہیں آگ بھڑک اٹھتی اور فائر بریگیڈ کی گاڑیاں، ایمبولینس اور پولیس کی سائرن بجاتی گاڑیاں دوڑتی رہتی تھیں۔ غرض ہر وقت چیخ و پکار مچی رہتی۔ اب براڈوے پر کریانے کی دکانوں کے بجائے سپر مارکیٹیں نمودار ہو گئیں تھیں جہاں آپ کو ہر چیز کا انتخاب خود کرنا ہوتا، اُسے ہاتھ گاڑی میں رکھنا اور پھر قیمت کی ادائیگی کے لیے قطار میں کھڑا ہونا پڑتا تھا۔ اوہ خدا! جب سے سام مرا ہے، دنیا کتنی بدل گئی ہے، اُسے خیال آیا۔

> ابتدائی برسوں میں جیسی عموماً خطوط کے جواب دیتی، چیک جمع کرتی اور آمدنی اور اخراجات کا حساب رکھتی تھی

تمام مہذب لوگوں نے علاقہ چھوڑ دیا تھا اور چوروں، ڈاکوؤں اور بری لڑکیوں کے گروہ کے گروہ وہاں آباد ہو گئے تھے۔ اُس کا پرس تین بار چوری ہوا اور جب وہ پولیس کے پاس شکایت کرنے گئی، تو وہ صرف ہنس کر رہ گئے۔ وہاں جان خطرے میں ڈال کر ہی سڑک پار کرنا ممکن تھا۔ جیسی ایک قدم اٹھا کر رک گئی۔ لوگ اُسے چھڑی لے کر چلنے کا مشورہ دیتے تھے، لیکن وہ اپنے آپ کو بوڑھی یا معذور عورت ظاہر کرنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ مہینے میں تقریباً ایک بار اپنے ناخنوں کو مینی کیور کرتی اور اُن پر سرخ رنگ کی نیل پالش لگاتی اور جب گٹھیا کے درد کا زور کم ہوتا، تو وہ الماری میں سے کپڑے نکالتی، اُنھیں یکے بعد دیگرے پہنتی اور خود کو دیر تک آئینے میں دیکھتی رہتی۔

جلد ہی جیسی سپر مارکیٹ کے قریب پہنچ گئی۔ اُس کے لیے شیشے کا بھاری دروازہ کھولنا ممکن نہیں تھا۔ اُسے کسی دوسرے اندر جانے والے فرد کا انتظار کرنا پڑا۔ ایسے اسٹور کے قیام کا تصور صرف شیطان ہی پیش کر سکتا تھا۔ وہاں اتنی تیز روشنیاں تھیں، جیسے سورج نصف النہار پر ہو۔ گاہک ہاتھ گاڑیاں تیزی سے لڑھکاتے اِس طرح چلے جا رہے تھے کہ ڈر ہوتا تھا، اپنے راستے میں آنے والوں کو مار بیٹھیں گے۔ شور اِتنا تھا کہ بہرا ہو جانا ممکن تھا اور سڑک پر آگ برساتی گرمی کے مقابلے میں اندر اِتنی ٹھنڈ تھی کہ یہ صرف ایک معجزہ تھا کہ جیسی کو اَب تک نمونیا نہیں ہوا تھا، لیکن جیسی سب سے زیادہ اشیاء کے انتخاب کے معاملے میں پریشان تھی۔

وہ کانپتے ہاتھوں سے چیزوں کو اُٹھاتی۔ نام اور قیمت کو جانچنے کی کوشش کرتی۔ اُس کا مقصد کم قیمت شے کو ڈھونڈنا نہ تھا بلکہ معاملہ عمر کے ساتھ آنے والی ہچکچاہٹ سے تھا۔ اُس کے حساب کے مطابق آج کی خریداری میں پونے گھنٹے سے زیادہ وقت نہیں لگنا چاہیے تھا، لیکن دو گھنٹے گزر چکے تھے اور جیسی کی خریداری ابھی تک ختم نہیں ہوئی تھی۔ آخر کار جب وہ ہاتھ گاڑی لیے قطار میں لگنے کے بعد سامان کی ادائیگی کر رہی تھی، تو اُسے اچانک یاد آیا کہ اُس نے دلیا نہیں لیا۔ وہ واپس گئی اور اپنی باری کھو بیٹھی اور پھر جب باقی سامان کی ادائیگی کا وقت آیا، تو ایک اور مصیبت آئی۔ اُسے پچھلے سامان کا بل دکھانا تھا۔ جیسی نے بل بیگ کے دائیں حصے میں رکھا تھا، لیکن

آئزک بشواس سنگر ۱۹۰۲ء۔۱۹۹۱ء پولش نژاد امریکی ادیب تھے۔ وہ پولینڈ میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۲۵ء میں [illegible] لکھی۔ ۱۹۳۵ء میں امریکا منتقل ہوگئے۔ سنگر کو جدید دور کے کہانی کاروں میں ممتاز مقام حاصل ہے۔ اُن کی تحریروں میں [illegible] عقل اور حکمت کا بھرپور اِمتزاج نظر آتا ہے۔ اُن کا اسلوب اگرچہ سادہ ہے، لیکن قاری کے لیے دلچسپ اور پُرکشش ہے [illegible] ۱۹۷۸ء میں ادب کا نوبل انعام ملا تھا۔ وہ فلوریڈا میں چل بسا۔

چابی آئزک بشواس سنگر کی اہم کہانی ہے۔ اِس میں ایک بوڑھی بیوہ عورت کا قصہ بیان کیا گیا ہے جو لوگوں سے ملنا جلنا پسند نہیں کرتی۔ وہ وَہم اور بدگمانی میں مبتلا ہے۔ پڑوسیوں اور لوگوں کو اَپنا دشمن سمجھتی ہے۔ شہر میں ہونے والی تبدیلیوں سے بھی خائف ہے اور اُنھیں پسند نہیں کرتی۔ کہانی میں امریکی سماج کی جن تبدیلیوں کی عکاسی کی گئی ہے، آج ہمارے بڑے شہروں کے بھی لوگ اُس کا شکار نظر آتے ہیں۔

وہ وَہاں نہیں تھا۔ سب کچھ باہر نکالنے پر آخرکار وُہ دُوسری طرف کے حصّے میں ملا۔ کون یقین کرے گا کہ اُس کے ساتھ کیسے عجیب واقعات ہوتے تھے؟ کسی کو بتائیں، تو وہ سوچے گا، اُس کے پاگل خانے جانے کا وقت آ گیا ہے۔

بیسی دوپہر کے وقت خریداری کرنے نکلی تھی اور اَب اندھیرا ہو رہا تھا۔ سنہرا سورج دریائے ہڈسن سے دور دُھند سے بھری پہاڑیوں میں ڈوب گیا تھا۔ دن بھر کی گرمی کے بعد براڈوے کے گھروں کی کھڑکیاں کھول دی گئی تھیں اور سب وے کی سرنگ کی باڑ سے گھڑگھڑاہٹ کے ساتھ بدبودار دُھواں اٹھ رہا تھا۔ بیسی نے ایک ہاتھ میں سامان کا بھاری تھیلا اور دُوسرے میں مضبوطی سے پرس پکڑا ہوا تھا۔ براڈوے اُسے کبھی اتنا گنجان اور گندا نہیں لگا تھا۔ وہاں سے نرم تارکول، پٹرول، سڑے ہوئے پھلوں اور کتے کے بول و براز کی بُو آ رہی تھی۔ فٹ پاتھ پر پھٹے اخباروں اور سگریٹ کے ٹوٹوں کے درمیان کبوتر چھلانگیں لگا رہے تھے۔ یہ سمجھنا ناممکن تھا کہ وہ راہگیروں کے پیروں تلے آنے سے کیسے بچتے تھے۔

مصنوعی گھاس کی نمائش کے سامنے پسینے سے تر قمیصوں میں ملبوس مرد بیٹھے اور اَناناس کا رس اپنے اندر ڈال رہے تھے جیسے وہ اَندر جلتی ہوئی آگ کو بجھانے کی کوشش کر رہے ہوں۔

اُن کے سروں پر ریڈ انڈینز کی طرح ناریل کی شکل کے [illegible] تھے۔ ایک گلی میں سیاہ اَور سفید فام بچوں نے ایک نل کھلا رکھا تھا اور ہودی میں نیم برہنہ ہو کر نہا رہے تھے۔ گرمی کی [illegible] لہر میں لاؤڈ اسپیکر لگی ایک اشتہاری گاڑی کہیں سے چلی آئی اور بہرا کر دینے والی موسیقی کے دوران مقامی اُمیدوار کی تعریف کرنے لگی۔ پھر ایک لڑکی جس کے بال تاروں کی طرح اُلجھے ہوئے تھے، ایک ڈبے سے پمفلٹ نکال کر لوگوں کو بانٹنے لگی۔

بیسی یہ اودھم برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اُس نے [illegible] قدموں سے گلی کو پار کیا اور اَپنے اپارٹمنٹ بلڈنگ کی طرف چل دی۔ وہاں پہنچ کر وہ لفٹ کے ذریعے پانچویں منزل پر آئی۔ کریانے کے سامان کا تھیلا دہلیز پر رکھا اور چابیاں ڈھونڈنے لگی۔ پھر اُس نے چابی ڈال کر ہینڈل گھمایا، لیکن چابی ٹوٹ گئی اور ہاتھ میں صرف اُس کا سر باقی بچا۔ بیسی کو فوراً اندازہ ہو گیا کہ ایک اور آفت آ گئی ہے۔ عمارت کی انتظامیہ کے پاس دیگر مکینوں کی اضافی چابیاں ہوتی تھیں، لیکن اُس کی نہیں۔ کیونکہ وہ کسی پر بھروسا نہیں کرتی تھی اور ایک بار اُس نے آرڈر دے کر ایسا پیچیدہ قفل بنوایا تھا جسے کوئی اور چابی نہیں کھول سکتی تھی۔ وہ ہمیشہ ایک چابی گھر سے لے کر نکلتی تھی، دوسری چابی، الماری کی دراز میں کہیں چھپا رکھی تھی۔ ”اوہ... یہ تو حد ہوگئی۔“ اُس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

[illegible] بیسی کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ پڑوسی اُس کے دشمن بنے [illegible] عمارت کی انتظامیہ اُس کے مرنے کا انتظار کر رہی تھی۔ اُس کا گلا رندھ گیا۔ وہ چیخ کر رو بھی نہیں سکتی تھی۔ اُس نے اِس [illegible] پیچھے مڑ کر دیکھا کہ وہاں شیطان کھڑا ہنس رہا ہوگا جس نے اُسے آخری ضرب لگائی تھی۔ بیسی نے بہت پہلے موت کی حقیقت کو سمجھ لیا تھا، لیکن سیڑھیوں یا گلی میں مرنا بہت دردناک تھا اور کون بتا سکتا تھا کہ یہ اذیت کب تک رہے گی؟ وہ سوچنے لگی۔ کیا اب بھی کہیں کوئی ورکشاپ ہے جہاں چابیاں بنائی جاتی ہیں؟ اور اگر ہے تو تالہ بنانے والا چابی کی نقل کیسے لے گا؟ اُسے اپنے اوزاروں کے ساتھ یہاں آنا پڑے گا بلکہ اُسے ایک ایسے کاریگر کی ضرورت ہے جو مخصوص کمپنی کے خصوصی تالوں کے بارے میں بھی جانتا ہو اور کیا اُس کے پاس کچھ فاضل پیسے ہیں؟ کیونکہ وہ کبھی بھی خریداری کے لیے ضرورت سے زیادہ پیسے لے کر نہیں جاتی تھی۔ جبکہ سپر مارکیٹ کے کیشیئر نے اُسے صرف بیس سینٹ بچا کر دیے تھے۔

”او ماں.....“ وہ بڑبڑائی۔ کافی ہچکچاہٹ کے بعد، اُس نے دوبارہ سڑک پر جانے کا فیصلہ کیا کہ شاید کوئی چابی بنانے والے یا ہارڈ ویئر کی دکان ابھی کھلی ہو۔ اُسے یاد آیا کہ پہلے اِس بلاک میں کہیں ایک ایسی دکان تھی۔ اکثر لوگ اپنی چابیاں توڑ دیتے ہیں، لیکن وہ اِس سامان کا کیا کرے؟ اُسے ساتھ لے جانا بہت مشکل تھا۔ اِس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا کہ اُسے بیگ دروازے پر چھوڑنا ہوگا۔ کوئی سامان چوری نہ کرلے؟ بیسی نے سوچا۔ شاید پڑوسیوں نے جان بوجھ کر تالے کے ساتھ گڑبڑ کی ہے، تاکہ وہ اَپارٹمنٹ میں داخل نہ ہو سکے۔ وہ اندر موجود ہیں اور رقم کی تلاش میں ہر چیز کو اُلٹ پلٹ رہے ہیں۔ اُس نے سڑک پر جانے سے پہلے سُن گُن لینے کے لیے ایک کان دروازے سے لگایا، لیکن ہلکی مسلسل گھنٹی کے سوا کچھ سنائی نہیں دیا۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ یہ آواز کہاں سے آ رہی ہے۔

کبھی وہ گھڑی کے الارم کی آواز لگتی، کبھی عجیب سی سرسراہٹ، جیسے کوئی انجان مخلوق دیواروں یا پائپوں میں آ بیٹھی ہو۔ بیسی نے ذہنی طور پر پہلے ہی اُن اشیاء کے متعلق ہاتھ دھو لیا تھا جنھیں فریج میں رکھنا ضروری ہے۔ اُسے معلوم تھا، اُنھیں گرمی میں نہیں چھوڑا جا سکتا۔ مکھن پگھل جاتا اور دُودھ کھٹا ہو جاتا۔ ”یہ سزا ہے! مَیں بڑی بدقسمت ہوں۔“ وہ بڑبڑائی اور اَپنے فلور پر لفٹ کو بلانے کے لیے بٹن دبایا۔ لفٹ میں ایک پڑوسن موجود تھی۔ بیسی کو خوف آیا اگر یہ چوروں میں سے ہوئی اور اِس نے مجھ پر حملہ کر دیا، تو؟ مگر نیچے پہنچ کر پڑوسن نے اُس کے لیے دروازہ کھولا۔ وہ شکریہ ادا کرنا چاہتی تھی، لیکن کچھ نہیں بولی۔ اتنا کچھ ہونے کے بعد دشمنوں کا شکریہ ادا کرنا ضروری نہیں تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ یہ سب اِن کی سازش ہے۔

جب بیسی باہر آئی، تو رات ہو چکی تھی۔ نالے میں پانی بہہ رہا تھا۔ گلیوں میں جلتے لیمپوں کے عکس اُس میں دکھائی دے رہے تھے۔ قریب ہی کہیں پھر آگ بھڑک اٹھی تھی۔ اُس نے آگ بجھانے والی گاڑی کا سائرن سنا۔ جب وہ براڈوے پر آئی، تو اُس نے تیز گرم ہوا کو چہرے پر ٹکراتا محسوس کیا۔ وہ دِن کے وقت بھی بمشکل دیکھ پاتی تھی۔ شام کو تو تقریباً نابینا ہو جاتی۔ دکانوں میں قمقمے جل رہے تھے، لیکن بیسی کو راستہ دیکھنے میں مشکل ہو رہی تھی۔ تیزی سے گزرتے راہگیر اُس سے ٹکرا رہے تھے۔ پہلی بار اُسے بنا چھڑی چلے آنے کا افسوس ہوا۔

آخر وہ دُکانوں سے آتی روشنی میں آگے بڑھنے لگی۔ اُس نے ایک دوائیوں کی دکان دیکھی، پھر ایک مٹھائی کی، پھر ایک قالین کی، وہ ایک جنازہ گھر کے پاس سے بھی گزری، لیکن اُسے ہارڈ ویئر کی دکان نہیں ملی۔ بیسی سوچ رہی تھی، وہ شخص کیا کرے جس کی چابی ٹوٹ گئی ہو؟ کیا زندگی کو الوداع

کہہ دے؟ کیا پولیس کے پاس جائے؟ اُن کے پاس ایسے لوگ ضرور ہونے چاہئیں جو ایسے معاملات سے نمٹیں، لیکن انھیں کیسے تلاش کیا جائے؟

کوئی حادثہ ضرور ہوا تھا۔ متجسس لوگوں کا ہجوم فٹ پاتھ پہ اور پولیس کی گاڑیاں اور ایمبولینس سڑک پر نظر آ رہی تھیں۔ کوئی سڑک پر پائپ سے پانی ڈال رہا تھا، شاید خون دھونے کے لیے۔ بیسی کو ایسا لگتا تھا کہ تماشائیوں کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی ہیں۔ وہ کسی اور کی بدقسمتی پر خوش ہیں۔ اُس نے سوچا۔ اِس بدقسمت شہر میں اُس کی اشک شوئی اور مدد کرنے والا کوئی نہیں۔

آخر بیسی چرچ کے قریب جا پہنچی جس کا بند دروازہ کئی سیڑھیاں چڑھ کر آتا تھا۔ وہ بہت تھک گئی تھی اور بیٹھنا چاہتی تھی۔ اُس کے گھٹنے کانپ رہے تھے، پنڈلیوں میں درد ہو رہا تھا اور جوتے انگلیوں کو کاٹ رہے تھے۔ ''برائی کی تمام طاقتوں نے مجھ پر یلغار کر دی ہے۔'' وہ بڑبڑائی۔ اُسے بھوک محسوس ہو رہی تھی اور متلی بھی۔ منہ میں کڑواہٹ بھری تھی۔ اُس نے دعا کی۔ ''آسمانوں کے مالک! توبہ کے بغیر میرا خاتمہ نہ ہو۔''

اُسے یاد آیا کہ اُس نے کبھی وصیت کرنے کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ آخر اُسے بیٹھے بیٹھے نیند آ گئی۔ جب اُس کی آنکھ کھلی، تو ہر طرف گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی، دکانیں بند ہو گئی تھیں اور گلی خالی اور اندھیرے میں ڈوبی تھی۔ اب گرمی بھی ختم ہو گئی تھی اور اُسے ہلکے لباس میں سردی لگ رہی تھی۔

ایک لمحے کے لیے اُسے خیال آیا کہ اُس کا پرس چوری ہو گیا ہے، لیکن وہ ہاتھ سے پھسل کر نیچے والی سیڑھی پر چلا گیا تھا۔ بیسی نے اُسے اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا، لیکن اُس کی انگلیاں بے جان ہو چکی تھیں۔ [illegible]

[...] کی طرح بھاری ہو رہا تھا، ٹانگیں اکڑ گئی تھیں اور کان پانی سے بھرے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔

اُس نے پلک اٹھا کر چاند کو دیکھا۔ چاند ہموار چھت پہ موجود تھا اور اُس کے ساتھ سبز ستارہ چمک رہا تھا۔ کئی برسوں سے اُسے اوپر دیکھنے کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ وہ صرف نیچے دیکھتی تھی۔ اُس کے اپارٹمنٹ کی کھڑکیوں پر موٹے پردے لگے تھے تاکہ مخالف سمت سے کوئی جھانک نہ سکے۔ وہ سوچنے لگی، آسمان پر خدا، فرشتے اور جنت ہیں، میرے ماں باپ اور سام کی روحیں کہاں ہوں گی؟ وہ اپنے تمام فرائض کے بارے میں بھول گئی تھی۔ وہ کبھی سام کی قبر پر نہیں گئی تھی اور اُس کی برسی پر ایک موم بتی بھی روشن نہیں کی تھی۔ وہ گلی کی قوتوں کے ساتھ لڑائیوں میں اِس قدر مصروف تھی کہ وہ اگلی [دنیا] کے بارے میں بھول گئی تھی۔ بہت برس بعد پہلی بار اُس نے دعا کرنے کی ضرورت محسوس کی۔

خدا اُس پر رحم کرے حالانکہ وہ اِس کی مستحق نہیں تھی۔ کچھ عبرانی الفاظ اُس کی زبان کی نوک پر آ رہے تھے لیکن [...] اُسے یاد نہیں تھے۔ ''سنو بنی اسرائیل!......'' اِس کے آگے کیا ہے؟ ''خدا مجھے معاف کر دے۔'' اُس نے سرگوشی کی۔ ''مَیں ہر اُس چیز کی مستحق ہوں جو مجھ پر نازل ہوئی ہے۔''

ماحول پُرسکون اور ٹھنڈا تھا اور سگنل کی روشنیاں سبز ہو گئی تھیں، لیکن سڑک پر کوئی گاڑی نہیں تھی۔ اچانک کہیں سے ایک سیاہ فام آدمی نکل آیا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا بیسی کے پاس آ کر رک گیا اور اُس کی طرف دیکھا پھر آگے بڑھ گیا۔ بیسی کو یاد آیا کہ اُس کے بیگ میں کئی قیمتی چیزیں موجود ہیں، لیکن وہ پہلی بار اپنے سامان سے لاتعلق ہو گئی تھی۔ سام اُس کے لیے بہت کچھ چھوڑ کر مرا تھا، لیکن اُس نے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا تھا۔ [...] بڑھاپے کے لیے بچاتی رہی، جیسے وہ ابھی جوان ہو۔ ''میری عمر کتنی ہے؟ اور مَیں نے اِن برسوں میں کیا کیا؟

وہ کسی پر بھروسا نہیں کرتی تھی اور ایک بار اُس نے آرڈر دے کر ایسا پیچیدہ قفل بنوایا تھا جسے کوئی اور چابی نہیں کھول سکتی تھی

[...] نہیں گئی؟ اپنی خوشیوں سے انکار کیوں کیا؟ کسی کی مدد نہیں کی؟'' وہ خود سے سوال کر رہی تھی۔ اُس کے اندر کوئی کہتا: ''یہ پاگل پن ہے۔ مَیں نے خود ہی نارمل لوگوں کی طرح رہنا چھوڑ دیا ہے۔ مَیں اِس کے لیے کسی دوسرے کو قصوروار کیسے ٹھہرا سکتی ہوں؟'' وہ چونک گئی، ایسا لگتا تھا کہ وہ لمبی نیند سے جاگ اٹھی ہے۔ ٹوٹی ہوئی چابی نے اُس کے لیے زندگی میں ایک دروازہ کھول دیا تھا جو سام کی موت کے بعد سے بند تھا۔

چاند چھت کے دوسری طرف چلا گیا تھا۔ آج اُس کا چہرہ غیر معمولی طور پر بڑا، سرخ اور کچھ دھندلا لگ رہا تھا۔ ہوا ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ بیسی کانپ رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اُسے نمونیا ہو سکتا ہے، لیکن اُسے نہ موت کا خوف تھا اور نہ بے گھر ہونے کا۔ دریائے ہڈسن کی طرف سے تازہ ہوا چل رہی تھی۔ آسمان پر نئے ستارے چمک رہے تھے۔ گلی کے دوسری طرف سے ایک بلی اُس کے پاس چلی آئی۔ وہ ایک لمحے کے لیے فٹ پاتھ کے کنارے کھڑی اپنی سبز آنکھوں سے یک ٹک بیسی کو گھورتی رہی۔ پھر آہستہ آہستہ اور احتیاط سے قریب آنے لگی۔

بیسی کو تمام جانوروں سے نفرت تھی، کتے، بلیاں، کبوتر اور یہاں تک کہ چڑیوں سے بھی۔ اُس کا خیال تھا کہ وہ ہر قسم کی بیماری اور گندگی پھیلاتے ہیں۔ اُسے یقین تھا کہ ہر بلی میں شیطان چھپا ہوتا ہے اور وہ بدقسمتی کی علامت ہے۔ ایک دن بلی کو دیکھ کر اُسے ایک خاص وحشت کا تجربہ بھی ہوا تھا، لیکن آج اُس کے اندر ایک بے گھر مخلوق کے لیے محبت پیدا ہو رہی تھی جس کے پاس نہ تو چابی تھی اور نہ ہی دروازہ اور جو صرف خدا کے رحم و کرم پر زندگی بسر کرتی تھی۔ بلی نے پہلے اُس کے تھیلے کو سونگھا، پھر اپنی ٹانگ اُس سے رگڑنے لگی، آخر اُس نے دم اٹھائی اور میاؤں میاؤں کرنے لگی۔ بیچاری بھوکی ہے لیکن میرے پاس اِس کے لیے کچھ نہیں۔ مَیں ایسی مخلوق سے کیسے نفرت کر سکتی ہوں؟ مَیں اتنے عرصے کسی سحر میں مبتلا تھی۔ مَیں اب ایک نئی زندگی شروع کروں گی اور اُس کے ذہن میں یہ پُرفریب خیال آیا کہ کیا مجھے دوبارہ شادی کرنی چاہیے؟

اندھیری رات ہیجان انگیز تھی۔ اُس نے ہوا میں ایک سفید تتلی کو دیکھا جو ایک گاڑی کے اوپر چکر لگا رہی تھی اور پھر کہیں اڑ گئی۔ بیسی جانتی تھی کہ یہ ایک نوزائیدہ بچے کی روح ہے، کیونکہ اصلی تتلیاں غروبِ آفتاب کے بعد نہیں اڑتیں۔ پھر اُس کی آنکھ لگ گئی، لیکن کچھ دیر بعد وہ ایک آگ کے گولے کو دیکھتے ہوئے بیدار ہوئی جو صابن کے بلبلے کی طرح ایک چھت سے اڑ کر دوسری چھت پر گیا اور اُس کے پیچھے ڈوب گیا تھا۔ اُسے یقین تھا کہ یہ کسی ایسے شخص کی روح ہے جو ابھی فوت ہوا ہے۔ آخر بیسی گہری نیند سو گئی۔ پھر جب وہ جاگی، تو پو پھٹ رہی تھی۔ ہر طرف ہلکی روشنی ہو گئی تھی۔

کچھ دیر بعد سورج سنٹرل پارک کی سمت سے نکل آیا۔ بیسی اُسے یہاں سے نہیں دیکھ سکتی تھی، لیکن براڈوے پر آسمان گلابی ہو گیا تھا۔ عمارت کے بائیں جانب کی کھڑکیاں بحری جہاز کے پورٹ ہولز کی طرح جلتی، ٹمٹماتی اور دھندلا جاتی تھیں۔ ایک کبوتر اڑتا ہوا اُس کے پاس زمین پر آ بیٹھا۔ پھر اُس نے سرخ پنجوں پر چلتے ہوئے فٹ پاتھ پر کسی چیز پر چونچ ماری، شاید روٹی کے باسی ٹکڑے یا سوکھی مٹی پر۔ بیسی چونک گئی۔ وہ سوچ رہی تھی، یہ پرندے کیسے رہتے ہیں؟ یہ رات کو کہاں سوتے ہیں؟ یہ بارش، سردی اور برف باری میں کیسے زندہ رہنے کا انتظام کرتے ہیں؟ اُس نے آہ بھری۔ بس اب مجھے گھر جانا چاہیے، اُس نے فیصلہ کیا۔ اب لوگ مجھے سڑک پر برداشت نہیں کریں گے۔

☆☆

اُس کے لیے اٹھنا دردناک عمل ثابت ہوا۔ ایسا لگتا تھا کہ جسم سیڑھی سے چپک گیا ہے۔ اُس کی پیٹھ میں درد ہو رہا تھا اور اکڑی ہوئی پنڈلیوں کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ وہ

ہمت کر کے اٹھی اور آہستہ قدموں سے گھر کی طرف چل دی۔
صبح کی نم ہوا میں گھاس اور کافی کی خوشبو بسی تھی۔ اُس نے گہری سانسیں لیں۔ اب وہ تنہا نہیں تھی، لوگ گھروں اور گلیوں سے نکل کر کام پر جا رہے تھے، وہ ہاکر سے اخبار خریدتے اور سب وے میں اتر جاتے۔ وہ خاموش اور حیرت انگیز طور پر احسان مند نظر آ رہے تھے۔ گویا اُنھوں نے بھی گزشتہ شب زندگی کی غلطیوں پر غور اور تزکیہ نفس کرتے ہوئے گزاری تھی۔

جب ایک نوجوان نے بیسی کو صبح بخیر کہا، تو وہ حیران رہ گئی۔ اُس نے سوچا، نہیں اِس بلاک میں کوئی غنڈہ اور قاتل نہیں ہے۔ اُس نے مسکرانے کی کوشش بھی کی۔ مگر اُس پر انکشاف ہوا کہ وہ اِس فطری نسوانی ردِعمل کو عرصہ ہوا بھول چکی جو اُس کی ماں نے بطور پہلا سبق زندگی میں اُسے دیا تھا اور جسے اُس نے تمام زندگی آسانی سے استعمال کیا تھا۔ وہ عمارت کے قریب پہنچی۔ صدر دروازے پر عمارت کا وہ نگران کھڑا تھا

"سنو بنی اسرائیل!..... "خدا مجھے معاف کردے۔" اُس نے سرگوشی کی۔ "میں بڑا کنجوس ... ہوں جو مجھ پر نازل ہوئی ہے۔

جس سے وہ نفرت کرتی تھی۔ وہ کچرا اُٹھانے والوں سے بات کر رہا تھا۔ چپٹی ناک، موٹا اوپری ہونٹ اور نوکیلی ٹھوڑی والا دیو۔ اُس کے آدھے گنجے سر کے پچھلے حصے پر سرخ بال تھے۔
اُس نے بیسی کو حیرت سے دیکھا اور پوچھا:
"اماں! کیا ہوا؟"
بیسی نے لڑکھڑاتی آواز میں اُسے پورا قصہ سنایا اور چابیوں کا گچھا دکھایا جسے وہ رات بھر اپنے ہاتھ میں دبائے رہی تھی۔
"خدا کی پناہ! آپ میرے پاس کیوں نہیں آئیں؟"
اُس نے کہا۔
"تم کیا کرتے؟" بیسی نے پوچھا۔
"میں دروازہ کھول دیتا۔"

"لیکن تمہارے پاس چابی نہیں ہے۔"
"ایمرجنسی کی صورت میں، میں کوئی بھی دروازہ کھول سکتا ہوں۔"
نگران چند لمحوں کے لیے اپنے کمرے میں گیا اور کچھ اوزار اور چابیوں کا گچھا لے کر واپس آیا۔ دونوں لفٹ میں اوپر آئے۔ کھانے کا تھیلا ابھی تک دروازے پر ٹکا پڑا تھا لیکن ایسا لگتا تھا کہ راتوں رات اُس کا وزن کم ہو گیا ہے۔ نگران تالا کھولنے کے لیے جھک گیا۔ وہ بڑبڑا رہا تھا "او خدا! مجھے حیرت ہے کہ آپ نے اِس عمر میں ساری رات سڑک پر گزاری۔"
اِسی دوران اگلے اپارٹمنٹ کا دروازہ کھلا اور ایک عورت جس نے رنگے ہوئے سنہرے بالوں کو گھونگرالے کرنے کے لیے کرلر لگائے ہوئے تھے، باہر آئی اور پوچھا:
"آپ کہاں تھیں؟ مَیں نے کئی بار دروازہ کھول کر دیکھا۔ یہ بیگ ہر بار موجود تھا۔ مَیں نے مکھن اور دودھ نکال کر اپنے فریج میں رکھ دیا تھا۔"
بیسی کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ "آپ کتنی مہربان ہیں۔ مَیں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔" وہ دِھیرے سے بولی۔
نگران نے چابی کا باقی آدھا حصہ تار کی مدد سے سوراخ سے نکالا، پھر ایک اور تار ڈال کر دیر تک کچھ کرتا رہا۔ آخر دروازہ کھل گیا۔ وہ اَپارٹمنٹ میں داخل ہوئے۔ بیسی کو بڑے عرصے سے بند گھروں کی کثیف بُو محسوس ہوئی۔
نگران نے کہا "اگر کبھی ایسا ہو، تو فوراً مجھے اطلاع دیں۔ اِسے ٹھیک کرنا میری ذمے داری ہے۔"
بیسی اُسے کچھ انعام دینا چاہتی تھی، لیکن اُس کے اُنگلیوں میں اتنی جان نہیں تھی کہ وہ اَپنا پرس کھول سکے۔ پڑوسن دودھ اور مکھن لے کر آئی۔ بیسی خواب گاہ میں جا کر لیٹ گئی۔ اُسے یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی بھاری پتھر اُس کے سینے پر رکھا ہو۔

...نے ملی ہوئی تھی اور ٹانگوں سے لے کر سینے تک پورے جسم میں کوئی چیز زور زور سے دھڑک رہی تھی جسے وہ بغیر آواز کے سن رہی تھی۔ جسم کی یہ بے قاعدگی تجسس کا باعث تھی۔
اُن کے لیے عمارت کا نگران اور پڑوسن کچھ باتیں کر رہے تھے، لیکن اُن کی باتیں بیسی کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔ یہ اُس کے ساتھ تقریباً تیس سال پہلے بھی ہو چکا تھا۔ جب وہ آپریشن سے پہلے بے ہوشی کی کیفیت میں تھی۔ ڈاکٹر اور اُس کی بہن بات کر رہے تھے، لیکن اُن کی آوازیں بہت دور سے اور کسی ناقابلِ فہم زبان میں سنائی دے رہی تھیں۔
جلد ہی خاموشی چھا گئی۔ پھر کہیں سے سام نمودار ہوا۔ یہ دن کا وقت تھا نہ رات کا۔ کچھ عجیب سا دھندلکا چھایا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ سام مر چکا، لیکن کسی طریقے سے اُس کے پاس چلا آیا ہے۔ وہ بہت کمزور اور کچھ شرمندہ لگ رہا تھا۔ وہ بول نہیں رہا تھا۔ بیسی اٹھی اور اُس کے ساتھ چل دی۔ وہ ایسی جگہ پر پہنچے جہاں آسمان تھا اور نہ زمین صرف ایک سرنگ تھی جس میں ناقابلِ فہم چیزوں کا ڈھیر تھا۔ وہ چلتے رہے۔ آخر اُنھوں نے اپنے آپ کو وہاں پایا جہاں دو پہاڑ آپس میں مل رہے تھے اور سورج کے غروب یا طلوعِ آفتاب کی سی روشنی پھیلی تھی۔ وہ ہچکچاتے ہوئے ہلکی سی شرمندگی کے ساتھ کھڑے تھے جیسے اپنی شادی کی رات جب وہ ایلن ویل گئے تھے اور ہوٹل کے مالک نے اُنھیں ہنی مون سویٹ دکھایا تھا۔ بیسی نے پھر وہ الفاظ سنے جو اُس نے کہے تھے۔ "یہاں کوئی چابی نہیں ہے۔ بس داخل ہو جاؤ۔ خدا کامیاب کرے۔"

اَن پڑھ بیٹا

مٹھاں والا کے ایک ملک صاحب نے اپنے دونوں بیٹوں کو قانون کی تعلیم دلائی۔ اُس علاقے میں کاشت کا انحصار بارش پر تھا۔ بارش ہوئی، تو کھیت پانی سے لبریز ہو گئے۔ اُس موقع پر ہمسائے کے ایک مَلک کا اَن پڑھ لڑکا اُن کے کھیت کے پٹے میں شگاف کر کے سارا پانی اپنے کھیت میں لے گیا۔ دونوں تعلیم یافتہ نوجوان یہ منظر دیکھتے رہے اور پھر بولے کہ آؤ گھر چلیں اور والد سے کہیں کہ وہ اِس نوجوان کے خلاف تعزیرات کی فلاں فلاں دفعات کے تحت مقدمہ چلائیں۔ اِسے یقیناً سزا ہو جائے گی۔
جب وہ گھر پہنچے اور باپ کو معاملے کی تفصیلات بتائیں، تو وہ گاؤں کی مسجد کی چھت پر چڑھ گیا اور زور سے بولا "گاؤں میں کوئی بھلا مانس ایسا ہے جو یہ میرے دونوں گریجویٹ بیٹے لے لے اور اِن کے بدلے ایک اَن پڑھ بیٹا مجھے دے دے۔"
"چشم دید" فیروز خاں نون، فیروز سنز، لاہور، جولائی ۱۹۹۴ء

راستی کے معنی

استاد: "راستے کے معنی بتاؤ۔"
شاگرد: "جس پر لوگ چلتے ہیں۔"
استاد (دوسرے شاگرد سے): "اور تم راستی کے معنی بتاؤ۔" شاگرد: "جس پر عورتیں چلتی ہیں جناب!"

گوشۂ والدین

بچوں کے مستقبل کی سرمایہ کاری

مَیں نہ بھی ہوا، تو یہ منصوبہ زندگی کے ہر موڑ پر اُن کی حفاظت کرے گا

نعمان امام

میرے ایک دوست ہیں اسد اللہ، یہ مضمون اُن کے ساتھ پیش آنے والے روزمرہ معاملات میں سے ایک معاملے کے متعلق ہے۔ بات سادہ ہے کہ اُنھوں نے ایک جنازے میں شرکت کی۔ مگر جو گفتگو اُن کی اُس موقع پر ایک صاحب سے ہوئی اور جو اُنھوں نے اُس سے سبق سیکھا، وہ قابلِ غور ہے۔ آیئے اُنھی کی زبانی ساری رُوداد سنتے ہیں:

ہر دل اُداس اور ہر چہرہ متفکر تھا۔ ارشد سب کا ہر دلعزیز تھا۔ ہنستا مسکراتا ملنسار آج اُن میں نہ تھا۔ اچانک حادثے نے اُس کی جان لے لی تھی۔ تدفین کے بعد ارشد کے گھر لوٹے، تو مَیں اپنے قریبی ساتھی کے پاس آ بیٹھا۔ ارشد میرے اُس دوست کا عزیز تھا، لہٰذا مَیں اُس کے بارے میں کچھ خاص علم نہ رکھتا تھا۔ چونکہ اُس میں کچھ اعلیٰ صفات تھیں جس کا لوگ اُس کی وفات پر ذکر کر رہے تھے، تو مجھے بھی خواہش ہوئی کہ اپنے قریبی دوست سے کچھ گفتگو کروں کہ ارشد کی زندگی کیسی تھی۔

مجھے معلوم ہوا کہ ارشد کی وفات کے وقت عمر ۴۴ برس تھی۔ اُس نے اپنے پیچھے دو بچے چھوڑے جن کی عمریں ۱۷ اور ۱۵ سال تھیں۔ لڑکا بڑا اور لڑکی چھوٹی تھی جبکہ بیوی کا پانچ برس قبل انتقال ہو چکا تھا۔ یوں اب دونوں بچے تنہا رہ گئے تھے۔ اُن کے قریبی رشتے داروں میں ایک ماموں اور دو خالائیں رہ گئی تھیں جبکہ ارشد کا اپنا کوئی بہن یا بھائی نہیں تھا۔

مَیں نے ارشد کے متعلق مزید پوچھا۔ وہ اُس کے بچپن کا دوست تھا۔ وہ ساتھ ہی پڑھے اور بڑے ہوئے اور اب اِسی شہر میں مختلف اداروں میں ایم بی اے کر کے مینیجر تھے۔ ارشد ایک ٹیکسٹائل مِل میں کام کرتا تھا جبکہ اُس کا دوست بسکٹ بنانے والی فیکٹری میں تھا۔

دورانِ گفتگو ارشد کے اُس قریبی دوست نے جس کا نام عاطف تھا، مجھے ارشد کے اچھے اخلاق، تواضع، دوسروں کے کام آنے، بڑوں کی عزت کرنے اور اِس طرح کی بہت سی اچھی عادات کے متعلق روشناس کرایا۔ مَیں اُس کے بچوں کے مستقبل کے بارے میں بھی سننا چاہتا تھا جبکہ اِس ذکر سے گفتگو ابھی تک خالی تھی۔ لہٰذا مَیں نے سوال کر دیا: ''ارشد نے اپنے بچوں کے لیے سرمایہ کاری کا کوئی منصوبہ بھی چھوڑا؟''

میرے سوال پر عاطف ایک لمحے کے لیے رکا اور پھر گویا ہوا: ''جی ہاں! بڑا منافع بخش منصوبہ چھوڑا ہے۔ ایسا کہ اُس کے بچے ساری زندگی خوش حال رہیں گے، اُنھیں کچھ فکر نہ ہو گی۔ زندگی کے ہر موڑ پر اِس انویسٹمنٹ پلان کا منافع اُنھیں اگلی منزل کی طرف گامزن رکھے گا۔''

مجھے اطمینان ہوا کہ الحمدللہ بچوں کے لیے تکافل جیسی کوئی اسکیم ارشد چھوڑ گیا ہے۔ حال ہی میں مَیں نے اپنے تینوں بچوں کے لیے سالانہ ایک ایک لاکھ روپے کے تین پلان لیے تھے جن کی بدولت پندرہ سال بعد اُنھیں فی کس پچیس لاکھ روپے ملنے تھے۔ مَیں خوش تھا کہ میرے بچے جن کی عمریں دس، بارہ اور چودہ برس تھیں، جب شادی کی عمر کو پہنچیں گے، تو یہ بلاسودی تکافل پلان اُن کے کام آئے گا۔ مَیں نہ بھی رہا، تو بھی بچوں کے لیے وہ کیے جا رہا ہوں جو اُن کی شادیوں کے اخراجات اور دُوسری ضروریات کے سلسلے میں انتہائی مددومعاون ثابت ہوگا۔

یہ خیال کرتے ہوئے مَیں نے عاطف سے کہا ''چلیں بچوں کی طرف سے تو بے فکری ہوئی کہ ارشد کی موت کے باعث تکافل کے رائج اصول کے مطابق اُس کے انویسٹمنٹ پلان کی رقم ابھی بچوں ہی کے ہاتھ میں آجائے گی۔''

عاطف نے میری طرف مسکرا کر دیکھا اور کہا ''جی ہاں! نہ صرف فوری طور پر بلکہ خاصی مقدار میں اور وُہ بآسانی اُس کی بدولت اپنی اگلی زندگی میں خود اعتمادی کے ساتھ قدم رکھیں گے اور اِن شاء اللہ ہر منزل اور ہر موڑ پر کامیاب ہوتے چلے جائیں گے۔ الحمدللہ!

مَیں نے پوچھا ''عاطف صاحب! یہ بتائیں کیا ایک لاکھ روپے والا پلان تھا یا اُس سے بھی زیادہ کا؟''

عاطف نے کہا ''کہیں زیادہ کا۔'' اور پھر میری جستجو دیکھ کر گویا ہوا: ''مَیں آپ کو اُس کی تفصیل بتائے دیتا ہوں۔ شاید آپ بھی سرمایہ کاری کا یہ منصوبہ پسند کریں۔''

عاطف نے مجھے جو بتایا، وہ کچھ یوں تھا:

''ارشد کا انویسٹمنٹ پلان تین جز و رکھتا ہے۔ اُس نے اپنے بچوں پر اِس طرح سرمایہ کاری کی تھی کہ اُسے دنیا سے اچانک چلے جانے کی فکر اور خوف نہ رہا۔ اُس نے اُنھیں اللہ پر کامل بھروسا، اعلیٰ اخلاقی تربیت اور خدا خوفی کی دولت سے مالا مال کر دیا۔ یہ ایسا انویسٹمنٹ پلان تھا کہ ارشد اُن کی طرف سے بالکل مطمئن ہو چلا تھا۔ خاص دوست ہونے کے باعث ایک دفعہ اُس نے مجھ سے اِس کا تذکرہ بھی کیا۔ اور آپ کو جان کر حیرت ہوگی کہ اُس نے یہی الفاظ استعمال کیے تھے

> کسی باپ نے اپنے بیٹے (اولاد) کو
> حُسنِ ادب سے بہتر تحفہ نہیں دیا

'یار عاطف! مَیں نے بچوں میں انویسٹمنٹ کر دی ہے۔ اُنھیں اللہ پر یقینِ کامل کا درس دیا ہے۔ اپنی زندگی کے عملی واقعات سے اُنھیں توکل علی اللہ کا طریقہ باور کرایا ہے۔ اُنھیں جو واقعات پیش آنے ہیں، اُن میں اللہ کے بھروسے کے پہلوؤں کی نشان دہی کی ہے۔

''اِسی طرح دوسرے نمبر پر دن رات اُن کی اخلاقی تربیت کی ہے۔ میرے پیش نظر ہمیشہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث رہی کہ ''کسی باپ نے اپنے بیٹے (اولاد) کو حُسنِ

ادب سے بہتر تحفہ نہیں دیا۔'' (ترمذی: حدیث نمبر ۱۹۵۲)
اِسی وجہ سے مَیں نے اُنھیں اچھے اخلاق سکھائے ہیں۔ اُن کی تربیت کی ہے۔ اُن کے ساتھ وقت گزارا ہے۔ اچھی باتیں بتائی ہیں۔ جہاں اُن سے کی کوتاہی ہوئی ہے، شفقت سے اُنھیں سمجھایا ہے۔ جہاں ضرورت محسوس کی ہے، وہاں ڈانٹ ڈپٹ بھی کی۔ اُنھیں نماز کا پابند بنایا ہے۔ آپؐ کی حدیث کے مطابق سات سال کے ہونے پر اُنھیں نماز سکھائی ہے اور اگر دس برس کے ہونے پر نہیں پڑھی، تو تادیبی کارروائی بھی کی ہے۔ اِس حدیث میں عمر کے ایسے برسوں کا ذکر ہے کہ اگر کوئی اپنے بچوں کو اُن کے مطابق نماز کی تلقین کرے، تو وہ یقیناً ساری زندگی نمازی بنے رہیں گے۔

''اِسی طرح تیسرے نمبر پر مَیں نے اُنھیں اللہ سے ڈرنے کا سبق دیا۔ زندگی کے ہر عمل کے لیے اُنھیں اُس کی میزان تھمائی۔ آپؐ کا ارشاد ہے کہ ''اللہ سے ڈرو، اللہ سے ڈرنا تمھارے ہر کام کی زینت کا باعث ہوگا۔'' اور اَب مَیں سمجھتا ہوں کہ یہ جہاں بھی ہوں، یہ اِن شاء اللہ سیدھی اور کامیابی کی راہ پر قائم رہیں گے۔ مجھے فکر نہیں کہ معاشرتی برائیاں اُن پر اثرانداز ہوسکیں گی۔

''یہ میرا اِنویسٹمنٹ پلان ہے۔ مَیں نہ بھی ہوا، تو یہ تین نکاتی سرمایہ کاری کا منصوبہ اُنھیں زندگی کے ہر موڑ پر حفاظت اور کامیابی کے ساتھ رواں دواں رکھے گا۔ میرے دنیا سے چلے جانے پر اُن کے پاس اللہ پر بھروسے کی وہ دَولت ہوگی جو اُنھیں تھامے رکھے گی، گرنے نہ دے گی۔

''میری موت کا سوگ گزار کر وہ اللہ کے بھروسے پر آگے بڑھیں گے۔ خود اعتمادی سے اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی کوشش کریں گے۔ ماموں اور خالاؤں پر بوجھ نہ بنیں گے۔ اُن کی طرف دیکھنے کے بجائے اللہ پر نظر رکھیں گے۔ اور مجھے امید ہے کہ اللہ پر بھروسا اُنھیں کافی ہوگا کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''جو شخص اللہ پر بھروسا کرے گا، اللہ اُس کے لیے کافی ہوجائے گا۔'' (سورۃ طلاق، آیت نمبر ۳)
بڑوں کی عزت کریں گے۔ چھوٹوں پر شفقت کریں گے۔ سلام کرنے میں پہل کریں گے۔ جھوٹ نہ بولیں گے، غیبت نہیں کریں گے۔ رشتے داروں سے معاملات ہوں، چاہے ہمسائے سے، اعلیٰ اخلاق کا سبق اُن کی ہر معاملے میں رہنمائی کرے گا اور وہ سرخرو ہوں گے۔ اچھے اخلاق کی بدولت اُن کی ہر جگہ عزت ہوگی۔

''چوتھے نمبر پر اللہ کا خوف یعنی تقویٰ اُنھیں ایسی جگہ سے رزق پہنچائے گا جہاں اُن کا گمان نہ جاتا ہوگا۔ تقویٰ اُنھیں برائی سے بچائے گا۔ اُن کے ہر کام میں آسانی پیدا کرے گا۔ اللہ قرآن میں فرماتا ہے:

''جو شخص اللہ سے ڈرے، اللہ اُس کے لیے ایک راہ نکال دے گا اور اُسے ایسی جگہ سے رزق دے گا جہاں سے اُس کے وہم و گمان میں نہ ہوگا۔'' (سورۃ طلاق، آیت ۲۔۳)

''عاطف! مَیں سمجھتا ہوں کہ یہاں رزق سے مراد اِنسان کی ہر قسم کی ضرورت ہے۔ بقول کسی بزرگ کے عقل و فہم، قوت و طاقت اور ایمان بھی رزق ہے۔ اِسی طرح اللہ قرآن میں فرماتے ہیں:

''اپنی بات ختم کرتے ہوئے عاطف گویا ہوا کہ جناب یہ تھا، میرے دوست ارشد کا انویسٹمنٹ پلان (یعنی وہ سرمایہ کاری جو اُس نے اپنے بچوں میں کی تھی)۔ اللہ پر بھروسا، اچھے اخلاق اور خداخوفی کا سبق۔''

مَیں نے تکافل والا انویسٹمنٹ پلان اپنے تینوں بچوں کے لیے لیا تھا مگر ارشد کے جیسے انویسٹمنٹ پلان پر میرا خیال آج تک نہ گیا تھا۔ شاید یہ میرے لیے لمحۂ فکریہ تھا۔ مجھے اپنے بچوں کے لیے ایک لاکھ روپے کے تکافل پلان کے ساتھ ارشد جیسے انویسٹمنٹ پلان کی بھی ضرورت تھی۔

جبلِ رحمت سے غارِ حرا تک

مکہ مکرمہ کے چپے چپے پر پھیلی مقدس زیارتوں کا اچھوتا احوال

''سب سے پہلے سرورِ کائنات آقائے دوجہاں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی جائے پیدائش ہے۔
اُس وقت مکہ المکرمہ اتنا بڑا نہیں ہوتا تھا۔ آپ سمجھیں، اُس وقت کا مکہ اب پورا حرم شریف ہے۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی جائے پیدائش شعب ابی طالب کے قریب تھی۔ اُسی جگہ آپؐ کا قبیلہ بنو ہاشم آباد تھا۔ یہ جگہ آج بھی موجود ہے۔ مسجد الحرام کے شمال مشرقی صحن مروہ کے مقابل ہے۔ خلیفہ ہارون الرشید کی والدہ نے اُس جگہ مسجد بنوا دی تھی۔ بعد میں ۱۹۵۰ء میں وہاں ایک لائبریری کی عمارت بنادی گئی جس پر مکتبہ مکہ المکرمہ کا بورڈ لگا ہے۔ وہ جگہ آپ سب لوگوں نے دیکھی ہوئی ہے۔ روزانہ آپ اُس کے قریب سے گزر کر مسجد الحرام میں جاتے رہے ہیں۔ اُس کے ساتھ ہی زم زم بھرنے کی ٹونٹیاں لگی ہوئی ہیں۔

''دارِ اَرقمؓ، شعب ابی طالب، دار الندوہ، سیّدہ خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا مکان اہم تاریخی مقام تھے جو اَب ختم ہوچکے۔ یہ

بس آہستہ آہستہ رینگ رہی تھی۔ ہجوم زیادہ تھا۔
حاجی صاحب کہہ رہے تھے:
''مَیں آپ کو اُن مقامات کی زیارت کراؤں گا۔ زیادہ تر مقامات ہم سب مسلمانوں کو پہلے سے ہیں۔ اِس لیے مَیں زیادہ تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ ورنہ ایک ایک مقام پر ایک کتاب لکھی جاسکتی ہے۔ یاضیوف الرحمٰن! مکہ شریف میں ہمارے لیے ہر چیز متبرک اور تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔ یہاں قدم قدم پر اللہ کے رسولؐ کی یادیں بکھری ہوئی ہیں۔ مکہ شریف اور یہاں حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی یادوں اور معجزات پر بے شمار کتابیں لکھی جاسکتی ہیں۔ مَیں کمزور اور کم علم انسان اُن سب باتوں کا احاطہ نہیں کرسکتا۔ نہ ہی قافلے والے ہر جگہ لے جاسکتے ہیں۔ نہ ہی وہ سب مقامات اُسی طرح موجود ہیں۔ مجھ سے جتنا ہوسکا، اُن مقامات کے نام بتاؤں گا۔ آپ سب مسلمانوں نے پڑھا ہوا ہے۔

مقامات مسجد الحرام میں ضم ہو چکے ہیں۔ اِن سب مقامات پر کتابیں لکھی جا سکتی ہیں اور کتابیں لکھی بھی گئی ہیں۔ علاوہ ازیں چند مقامات اب تک موجود ہیں۔ بے شک وہ آقائے دو جہاں کے وقت جیسے نہیں ہیں۔ اُن میں مسجد بیتِ عقبہ، مسجد جن، مسجد شجرہ، مسجد رایہ، مسجد خالدؓ بن ولید کے علاوہ بھی کئی نام ہیں۔ اِن کے علاوہ منیٰ، مزدلفہ اور میدانِ عرفات جائیں گے۔ غارِ ثور اَور غارِ حرا کی بھی زیارت کریں گے۔ پہلے ہم غارِ ثور جائیں گے بلکہ بس ابھی وہاں پہنچنے ہی والی ہے۔"

ہماری بس مکہ شہر کی بارونق سڑکوں سے گزر رہی تھی۔ ہر طرف چہل پہل تھی۔ بس نے اچانک بڑی سڑک چھوڑ دی اور دائیں طرف ایک سڑک پر چلنے لگی۔ یہاں بھی رونق تھی بلکہ چہل پہل پہلے سے زیادہ تھی۔ ہم جیسے جیسے آگے جا رہے تھے، سڑک کے کناروں پر بسیں کھڑی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ لوگ پیدل چلتے نظر آ رہے تھے۔ سب آگے ہی جا رہے تھے۔

ایک دو موڑ مڑنے کے بعد بس ایک کھلی سی جگہ میں رک گئی۔ یہاں پہلے ہی چھ سات بسیں کھڑی تھیں۔ تین اطراف رہائشی مکانات تھے۔ صرف ایک طرف خالی تھی جہاں سے پہاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ حاجی صاحب نے مائیک سنبھالا اور کہنے لگے:

"یا ضیوف الرحمٰن! ابھی ہم جبلِ ثور کے پاؤں میں کھڑے ہیں۔ یہاں سے راستہ غارِ ثور کو جاتا ہے۔ آج کل سڑکیں بننے کی وجہ سے بسوں کو کئی چکر کاٹ کر آنا پڑتا ہے۔ ورنہ یہ جبلِ ثور حرم پاک سے تقریباً چار کلومیٹر جنوب میں ہے۔ غارِ ثور پہاڑ کی چوٹی پر اور سطحِ زمین سے تقریباً ۴۵۸ یا ۴۶۰ میٹر بلند ہے۔ اِس غار کے دو دہانے ہیں۔ مغربی سمت سے ہمارے آقا و مولا حضرت محمد ﷺ اِس غار میں داخل ہوئے تھے۔ آپ لوگوں نے تفصیل پڑھ رکھی ہوگی۔

ہمارے آقا و مولا سردارِ دو جہاں حضور پاک ﷺ ہجرت کے سفر میں یہاں آئے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پہلے خود غار میں داخل ہوئے اور اِسے صاف کیا۔ پھر حضور پاک ﷺ اندر تشریف لے گئے۔ حضرت ابوبکرؓ کے صاحبزادے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سارا دِن مکے میں رہتے۔ رات کو یہاں آ کر مکہ کے حالات سے باخبر کرتے اور صبح ہونے سے پہلے پہلے واپس مکہ چلے جاتے۔ حضرت ابوبکرؓ کے غلام حضرت عامرؓ بن فہیرہ دِن میں اِدھر بکریاں چرایا کرتے، تاکہ حضرت عبداللہؓ کے پاؤں کے نشانات مٹ جائیں۔

"اِس غار کا ذکر قرآن پاک کی سورۃ توبہ کی آیت نمبر ۴۰ میں ہے۔ آپؐ نے تین راتیں حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ اِس غار میں گزاریں۔ تھوڑا اِطمینان ہونے کے بعد یہاں سے رختِ سفر باندھا۔ نئے راستے کی رہنمائی کے لیے عبداللہ بن اریقا دو اُونٹنیوں کے ہمراہ آ گیا۔ ایک اونٹنی پر آپؐ سوار ہوئے۔ دوسری پر حضرت ابوبکرؓ اپنے غلام عامرؓ بن فہیرہ کے ہمراہ رَوانہ ہوئے۔ اب وہ غارِ ثور آپ کے سامنے ہے۔ آپ حضرات نیچے تشریف لے جائیں اور دُور سے ہی زیارت کر لیں۔ غار تک جانے میں دو اڑھائی گھنٹے لگ جاتے ہیں۔ رمضان کا مہینہ ہے۔ ہم نے دوسری زیارتیں بھی کرنی ہیں۔ اتنی دیر ہم کسی کا انتظار نہیں کر سکتے۔ دس پندرہ منٹ میں آپ لوگ واپس آ جائیں۔"

ہم سب بس سے اتر کر جبلِ ثور کی طرف چل پڑے۔

ذرا سی دوری پر سب رک گئے۔ یہاں اور بھی اَن گنت بسیں تھیں۔ ایران اور ترکیہ کے لوگ زیادہ تھے۔ اُن کے بڑے بڑے گروہوں کے معلم یا گائیڈوں کے پاس چھوٹے چھوٹے مائیکروفون تھے۔ وہ انھیں اپنے منہ سے لگائے اپنے ساتھیوں کو جبلِ ثور کے بارے میں بتا رہے تھے۔ اُن بڑے گروہوں کی عورتیں مرد مکمل یکسوئی سے سُن رہے تھے۔ اُن میں سے کوئی بھی آگے نہیں گیا تھا۔ لیکن کافی لوگ آگے جا بھی رہے تھے۔ پہاڑ پر کئی آڑھی ترچھی قطاریں نظر آ رہی تھیں۔ اچھے بھلے انسان چھوٹے چھوٹے بونوں کی طرح لگ رہے تھے جس سے پہاڑ کی اونچائی کا اندازہ ہو رہا تھا۔ ہم اِدھر سے دیکھ کر ہی وہ وقت یاد کر رہے تھے۔ اب تو پہاڑ پر جانے کے لیے ٹھیک ٹھاک راستے بنے ہوئے تھے۔ حضور پاک ﷺ کے وقت نہ تو راستے تھے، نہ کوئی سہولت۔

آہستہ آہستہ لوگ بس کی طرف آنے لگے۔

چند منٹ بعد ہی بس چل پڑی۔

"یا ضیوف الرحمٰن! یہاں سے ہم میدانِ عرفات جائیں گے۔ میدانِ عرفات اور مسجدِ نمرہ ایامِ حج کے اہم ترین مقامات ہیں۔ ہم ان شاء اللہ پہلے مسجدِ نمرہ جائیں گے۔ اُس کے بارے میں آپ سب جانتے ہیں۔ مَیں آپ کی اُن معلومات کو تازہ کرنے کی کوشش کروں گا۔ مسجدِ نمرہ عرفات کے بالکل مغربی حدود میں ہے۔

"ہمارے پیارے آقا و مولا حضرت محمد ﷺ نے حج کے موقع پر اس جگہ ایک خیمے میں قیام فرمایا تھا۔ وہاں قریب ہی خطبۂ حج ارشاد فرمایا تھا اور نمازِ ظہر اور عصر اکٹھی قصر ادا فرمائی تھیں۔ جس جگہ آپؐ نے خطبہ ارشاد فرمایا، نماز ادا فرمائی، وہاں دوسری صدی ہجری میں مسجد بنا دی گئی تھی۔ اب سعودی حکومت نے وہاں بہت بڑی مسجد بنا دی ہے۔

"مسجد کا پچھلا حصہ دو منزلہ ہے۔ ایک طرف ایک حصے پر شیڈ ڈال کر سایہ کر دیا گیا ہے۔ اُس مسجد میں تقریباً ساڑھے تین لاکھ سے زیادہ نمازیوں کی گنجائش ہے۔ مسجد دو حصوں میں ہے۔ ایک حصہ عرفات سے باہر ہے۔ مسجد کے اندر عرفات کی حدود واضح کرنے کے لیے نشانیاں موجود ہیں تاکہ حجاج اکرام نماز پڑھ کر مسجد کے پچھلے حصے میں آ جائیں یا عرفات کے میدان میں نکل آئیں۔ کیونکہ وقوف صرف عرفات میں ہے۔

"اب بس مسجدِ نمرہ والی سڑک پر کھڑی ہے۔ مسجد نمرہ کے اونچے اونچے چھ مینار نظر آ رہے ہیں، تو تین بڑے گنبد بھی۔ اِس مسجد میں دس بڑے اور چوّن (۵۴) چھوٹے دروازے ہیں۔ سینکڑوں ایئر کنڈیشنر لگے ہیں۔ اس مسجد میں نشر و اشاعت کا ایک ہال ہے جہاں سے پوری دنیا میں حج کا خطبہ براہِ راست نشر کیا جاتا ہے۔ بے شمار بیت الخلا اور اَن گنت وضو کی ٹونٹیاں ہیں۔ یہ مسجد سال میں ایک ہی دن کھلتی ہے۔ اب یہ بند ہے۔ کوئی اترنا چاہے، تو اُتر کر تصویر بنا سکتا ہے لیکن مسجد کے قریب جانے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ اس لیے سب بسیں یہاں ہی رکتی ہیں۔ یہ بس جس جگہ رکی ہوئی ہے، یہ پیدل چلنے والوں کی سڑک ہے۔ دیکھ لیں کس قدر چوڑی سڑک ہے۔ اس پر ہر پچاس میٹر کے بعد چار چار پانی کے کولر نصب ہیں۔

تھوڑی تھوڑی دوری پر بیت الخلا کے بلاک ہیں۔ پورے عرفات میں اسی طرح پانی کے کولروں اور بیت الخلا کا جال بچھا ہوا ہے۔ یہاں آپ کو ہر طرف تھوڑے تھوڑے فاصلے پر سٹریٹ لائٹ پول کی طرح کے پول نظر آ رہے ہیں، اُن کے اوپر جو باریک باریک پائپ نظر آ رہے ہیں، یہ واٹر نوزل ہیں۔ حج کے روز اُن سے ٹھنڈے ٹھار پانی کی ہلکی ہلکی پھوار ہر طرف پھیل جاتی ہے۔ گرمی کا اثر ختم ہو جاتا ہے اور موسم بڑا ہی سہانا لگنے لگتا ہے۔

چند لوگ ہی بس سے اترے جن میں مَیں بھی شامل تھا۔ اور بھی قافلے والے موجود تھے جو اپنے مسافروں کو تفصیلات بتا رہے تھے۔ ہمیں حاجی صاحب بتا چکے تھے، اس لیے لوگ فوراً ہی واپس آ گئے۔

''یاضیوف الرحمٰن! اب ہم جبلِ رحمت کی طرف جا رہے ہیں۔ یہ سارا علاقہ عرفات ہے۔ کسی زمانے میں نہ ہی یہاں سڑکیں تھیں، نہ ہی درختوں کی بہتات تھی۔ چٹیل میدان ہوتا تھا۔ اب حج والے دن یہاں تقریباً پچیس لاکھ انسان سمائے ہوتے ہیں۔ جبلِ رحمت، مسجدِ نمرہ سے زیادہ دُور نہیں۔ زیادہ تر لوگ خطبۂ حج اور نماز کے بعد یہاں آ جاتے ہیں۔

''جبلِ رحمت زمین سے تقریباً ساٹھ ستر میٹر اونچا ہے۔ اوپر جانے کے لیے سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں۔ پہاڑی اوپر سے کافی کھلی اور ہموار ہے اور درمیان میں تقریباً ساڑھے آٹھ میٹر اونچا مینار یا ستون ہے جس پر سفید رنگ کیا ہوا ہے۔ کافی دور سے نظر آتا ہے۔ آپ اُسے دیکھ ہی رہے ہیں۔ اس پہاڑی کے ایک طرف نہرِ زبیدہ کے آثار اب بھی موجود ہیں۔ مَیں آپ لوگوں کو دکھاؤں گا۔''

بس اب ایک عمارتوں والے علاقے میں پہنچ گئی تھی۔ بس رکتے ہی حاجی صاحب نے کہا: ''آپ سب میرے ساتھ ساتھ رہنا، ہمیں جلد واپس آنا ہے۔'' ہم بس سے اتر گئے۔ یہاں تو کافی زیادہ عمارتیں تھیں۔ ... بڑا ... تھا، اسٹیشن تھا، فائر بریگیڈ کا دفتر تھا، کیفے ٹیریاز تھے، دکانیں تھیں۔ خاصا بارونق علاقہ تھا اور بے شمار ہجوم۔

جبلِ رحمت میں

بہت بڑے گول دائرے میں سڑک تھی جس پر ہر طرف بسیں ہی بسیں کھڑی تھیں۔ گول دائرے یا راؤنڈاباؤٹ کے اندر تقریباً سو میٹر کے فاصلے پر جبلِ رحمت والی پہاڑی تھی۔ پہاڑی اور سڑک کی درمیان سو میٹر خالی جگہ پر اَن گنت لوگ تھے۔ اُن لوگوں کے درمیان بہت ہی بناؤ سنگھار والے اونٹ کھڑے تھے۔ ساربان لوگوں کو اُن پر بٹھا کر سیر کرا رہے تھے جس طرح کراچی کلفٹن کے ساحل پر ہوتا ہے۔ یہاں بھی چار موٹے موٹے ٹائروں والے سکوٹر یا بائیک بھی تھے۔ وہ بھی لوگوں کو کرائے پر دیے جا رہے تھے۔ ایسے لگتا تھا کہ لوگ میلہ دیکھنے آئے ہیں۔

بے شمار چھوٹی چھوٹی عارضی دکانیں تھیں۔ دکانوں سے مراد عمارات والی دکانیں نہیں، بلکہ بے شمار مرد عورتیں زمین پر پلاسٹک کی چٹائیاں بچھائے بیٹھے تھے۔ اُن چٹائیوں پر اپنا اپنا سامان رکھ کر فروخت کر رہے تھے۔ کوئی تسبیح، ہار یا انگوٹھیاں فروخت کر رہا تھا، تو دوسرا مختلف قسم کی ٹوپیاں اور کپڑے۔ عورتیں زیادہ تر مختلف قسم کے اسکارف اور زنانہ کپڑے فروخت کر رہی تھیں۔ کوئی کھجوریں فروخت کر رہا تھا، تو کوئی کھلونے۔ گاہکوں کو آوازیں دے دے کر بلایا جا رہا تھا۔ مصروف ترین بازار تھا جہاں سے سیڑھیاں اوپر جا رہی تھیں۔

وہاں بڑے بڑے نیلے رنگ کے بورڈ لگے تھے جن پر مختلف زبانوں میں ہدایات درج تھیں۔ یہ کہ ان مقامات سے مٹی یا پتھر اٹھانا درست نہیں۔ ان مقامات کو چومنا، ان سے لپٹنا یا یہاں دھاگے باندھنا درست نہیں۔ بہت سی ہدایات تھیں جو غیر شرعی کاموں سے روکتی تھیں۔ وہاں ہی دو تین چھوٹے چھوٹے کیبن بنے ہوئے تھے جہاں سے مختلف زبانوں میں شائع شدہ کتابچے مفت تقسیم کیے جا رہے تھے۔ ایک پر مختلف زبانوں میں ہدایات دی جا رہی تھیں۔

نہرِ زبیدہ

حاجی صاحب ہمیں نہرِ زبیدہ کے آخری حصے کے پاس لے گئے۔ اُس کا بھی ایک حصہ ٹوٹا ہوا تھا لیکن اندر نظر آ رہا تھا کہ پانی کیسے یہاں تک آتا ہوگا۔ یہ نہر پاکستانی نہروں کی طرح بہت بڑی نہ تھی۔ اڑھائی یا تین فٹ چوڑی اور تقریباً چار فٹ گہری تھی۔ اوپر چھت پڑی ہوئی تھی تاکہ پانی میں مٹی وغیرہ نہ پڑے اور پانی دھوپ کی تپش سے خشک بھی نہ ہو۔ یہ سطحِ زمین سے چھ سات فٹ اونچی تھی۔ یہ صرف ایک ٹکڑا تھا۔

پھر حاجی صاحب ہمیں جبلِ رحمت والی پہاڑی کے ساتھ ساتھ بل کھاتی زمین سے خاصی بلندی پر بنی نہرِ زبیدہ دکھاتے رہے۔ یہ دیکھنے میں سنگِ مرمر کی دیوار لگتی تھی۔ کئی جگہ اس دیوار کے نیچے چھوٹی چھوٹی محرابیں (Arches) بنی ہوئی تھیں۔ تھوڑا آگے گئے، تو وہاں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر تین گول گول سوراخ تھے۔ حاجی صاحب نے بتایا کہ یہاں سے پانی دھار کی شکل میں نکلتا تھا اور لوگ بھر لیتے۔ ساتھ ہی آگے چوڑی پتھروں کی سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں جو زمین سے شروع ہو کر اس نہر کی دیوار کو عبور کر کے اوپر جبلِ رحمت پر جا رہی تھیں۔ لیکن آج کل لوگ مشرق والا راستہ استعمال کرتے تھا۔

پھر حاجی صاحب ذرا بلند جگہ پر کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے:

''یاضیوف الرحمٰن! آپ جو کچھ دیکھ رہے ہیں، بظاہر یہ پتھروں کی دیوار نظر آتی ہے، کیونکہ یہ اِنھی کو کاٹ کر بنائی گئی ہے۔ یہ انسانی ہاتھوں سے بنایا گیا ایک عجوبہ ہے۔ یہ ایک شاہکار ہے۔ یہ اُس وقت دنیا کی مہنگی ترین اور مشکل ترین نہر تھی۔ اِسے 'نہرِ زبیدہ' کہتے ہیں۔ ملکہ زبیدہ بنت جعفر مشہور مسلمان خلیفہ ہارون الرشید کی بیوی تھی۔ بہت رحم دل، نیک اور دَریا دل تھی۔

''ہارون الرشید کی وفات کے بعد وہ عراق سے حجِ بیت اللہ کے لیے مکۃ المکرمہ تشریف لائی۔ اُس وقت مکہ میں پانی کی شدید قلت تھی۔ ایک ڈول پانی بہت ہی مہنگا ملتا تھا۔ غریب لوگ پانی کو ترستے تھے۔ ملکہ زبیدہ حاجیوں کی حالت دیکھ کر بہت دکھی ہوئی۔ اُس نے یہاں تک پانی لانے کا ارادہ کیا اور اللہ سے مدد چاہی۔

''اُس نے اپنے انجینئروں کو اکٹھا کیا۔ اُنھیں اِس کام کی تکمیل کا حکم دیا۔ اُس وقت کے مہندسین (انجینئروں) نے پورے علاقے کا سروے کیا کہ پانی کہاں سے اور کیسے لایا جائے۔ مکۃ المکرمہ سے ۳۵ یا ۳۶ کلومیٹر دور وَادیٔ حنین اور وَادیٔ نعمان میں پانی میسّر تھا۔ وہاں سے یہاں تک کے راستے میں بے شمار پہاڑ اور ندی نالے تھے۔ چیف انجینئر نے ملکہ کو حالات بتائے کہ یہ ایک مشکل ترین اور مہنگا ترین کام ہے۔ ملکہ نے ایک تاریخی جملہ کہا:

'حاجیوں کی سہولت کے لیے پانی یہاں تک لانا ہے، اِس کے لیے چاہے مجھے کدال کی ایک ضَرب کے بدلے ایک دینار دَینا پڑے۔'

''چیف انجینئر نے جب ملکہ کے یہ لفظ سنے، تو وہ ایک نئے جوش اور جذبے سے کام کرنے لگا۔ پھر انجینئر حضرات نے اِس کام کا سروے مکمل کیا۔ روٹ طے کیے۔ پھر اُنھوں نے وادیٔ حنین اور وَادیٔ نعمان میں کنوئیں کھدوائے،

کاریزیں بنوائیں۔ وادیٔ نعمان میں ایک ڈیم بنایا گیا۔ وادیٔ حنین اور وادیٔ نعمان کے پانی کو چھوٹی نہر کی شکل دی گئی جو وہاں سے شروع ہو کر عرفات اور وادیٔ عرنہ سے گزرتی ہوئی منیٰ کے نشیبی علاقوں سے ہو کر مکۃ المکرمہ تک جاتی تھی۔

"کہتے ہیں کہ ایک نہر مکہ کی طرف لے جائی گئی۔ دوسری عرفات سے مسجدِ نمرہ اور جبلِ رحمت کی طرف۔ آپ لوگ ابھی جبلِ رحمت والی نہر کے پاس کھڑے ہیں۔ وہ آپ کے سامنے ہی اِس کا آخری سرا ہے۔ یہ دنیا کا ایک نادر نمونہ اور انجینئرنگ کا ایک شاہکار ہے۔

"اُس وقت کے انجینئرز حضرات کو آج کے انجینئر اب بھی سلام کرتے ہیں۔ اُس وقت نہ ہی سروے کے جدید آلات تھے، نہ جی پی ایس ہوتے تھے۔ نہ ٹوٹل اسٹیشن اور لیونگ مشینیں۔ نہ ہی ڈرائنگیں بنانے والے کمپیوٹر تھے، نہ پہاڑ کاٹنے کی مشینیں تھیں۔ یہ ڈوزر شاول تو اب کی پیداوار ہیں۔ منزل دور اور کٹھن تھی۔ پہاڑ اور ندی نالے درمیان میں تھے۔ راستے تھے ہی نہیں۔ اُنھیں سب کچھ قوتِ بازو سے کرنا پڑا۔ اللہ تعالیٰ نے ملکہ زبیدہ کی مدد کی۔ پانی مسجدِ نمرہ، جبلِ رحمت، عرفات، مزدلفہ، منیٰ اور مکۃ المکرمہ تک پہنچ گیا۔ یہ نہر کہیں کہیں زیرِ زمین بھی ہے۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کنوئیں بنے ہوئے ہیں۔ کئی جگہ ہوا، روشنی اور صفائی کے لیے راستے بنے ہوئے ہیں۔

"مزدلفہ میں مسجد مشعر الحرام کے قریب ایک حوض ہوتا تھا۔ منیٰ میں کئی حوض بنے ہوئے تھے۔ ۱۲۰۰ سال تک اہلِ مکہ اور حاجی صاحبان اس نہر کے پانی سے مستفید ہوتے رہے۔ سب مسلمان حکمران اِس نہر کی مرمت کراتے رہے۔ ۱۹۵۰ء تک لوگ اِس سے فیض یاب ہوئے۔ اب بھی اِس نہر کا بیشتر حصہ باقی ہے۔ مزدلفہ کی پہاڑیوں پر آپ کو نظر آئے گا۔

دربِ زبیدہ

"اُس نہر کی تفصیل پر کئی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ کہتے ہیں کہ جب نہر مکمل ہوگئی، لوگ پانی سے سیراب ہونے لگے تو چیف انجینئر اخراجات کے کاغذات لے کر ملکہ زبیدہ کے پاس حاضر ہوا۔ ملکہ اُس وقت دریا کے کنارے بیٹھی تھی۔ ملکہ نے بغیر دیکھے، بغیر کھولے وہ کاغذات دریا بُرد کر دیے اور کہا: 'یا اللہ! میں نے تیری رضا کی خاطر یہ کام کیا ہے۔ تُو نے اِس دنیا میں اِن سے کوئی حساب نہیں لیا، تُو بھی مجھ سے آخرت میں کوئی حساب نہ لینا۔'

"ملکہ نے عوام الناس کی بھلائی کے لیے بے شمار کام کیے۔ ملکہ زبیدہ نے حج کے سفر کے دوران کی تکلیفیں دور کی تھیں۔ عراق کے شہر کوفہ سے لے کر مکہ اور مدینہ تک سڑک بنوائی تھی۔ وہ ۹۰۰ کلومیٹر لمبی سڑک حاجیوں کی آسانی کے لیے تھی۔ تاریخِ اسلام میں اُس کا نام 'دربِ زبیدہ' (Durb-e-Zubaida) ہے۔ اب آئیں اوپر جبلِ رحمت پہ چلتے ہیں۔"

پھر حاجی صاحب ہمیں جبلِ رحمت والے پہاڑ کے دائیں طرف ذرا اُونچائی پر لے گئے۔ یہاں ایک پتھروں کی بنی چھوٹی سی چار دیواری تھی۔ یا آپ یہ سمجھیں پتھروں سے گھرا ایک احاطہ سا تھا۔

مسجدِ صخرا

"یاضیوف الرحمٰن! اِس جگہ کو مسجدِ صخرا کہتے ہیں۔ یہاں چٹانوں کے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وقوف کیا تھا۔ آپؐ اپنی اونٹنی 'قصویٰ' پر سوار تھے۔ آپؐ کا رخِ اقدس بیت اللہ شریف کی طرف تھا۔ آپؐ یہاں غروبِ آفتاب تک دعائیں مانگتے رہے۔

"قرآن پاک کی سورہ مائدہ کی ایک آیتِ کریمہ یہاں نازل ہوئی تھی جس کا ترجمہ ہے (آج کے دن میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا ہے۔ میں نے اپنی نعمت تم پر پوری کردی ہے۔ میں نے تمہارے لیے دینِ اسلام کو پسند کیا ہے۔)"

پھر حاجی صاحب ہمیں اوپر پہاڑ پر لے گئے۔ تفصیل حاجی صاحب ہمیں بتا چکے تھے۔ اب ہم اُس سفید ستون کے قریب تھے۔ اُس مربع ستون کی ہر سمت تقریباً پونے دو میٹر چوڑی تو ہوگی۔ نزدیک سے تو بہت ہی اونچا لگتا تھا۔ حاجی صاحب نے اُس کی اونچائی تقریباً آٹھ یا ساڑھے آٹھ میٹر بتائی تھی۔ اُس ستون کے چاروں طرف لوگوں کے نام لکھے ہوئے تھے۔ کوئی ایک انچ جگہ بھی خالی نہ تھی۔ چند منٹ بعد ہمارے سب لوگ اکٹھے ہو چکے تھے۔ حاجی صاحب نے یہاں سے میدانِ عرفات کی طرف رخ کر کے کہا:

میدانِ عرفات

"یاضیوف الرحمٰن! یہاں سے حدِ نظر تک میدانِ عرفات ہے۔ اب یہ میدان تو نہیں۔ اِس میں بے شمار نیم کے درخت ہیں۔ بے شمار بیت الخلا ہیں اور کافی ساری سڑکیں ہیں۔ اَن گنت پانی کے کولر ہیں۔ لیکن کسی زمانے میں یہ چٹیل میدان ہی تھا۔

"عرفات کے بارے میں کتابوں میں لکھا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام اور سیّدہ حوا علیہا السلام جنت سے نکالے جانے کے بعد دنیا میں اِسی جگہ ملے تھے۔ یہاں ایک دوسرے کو پہچانا تھا۔ عرف کے معنی پہچان کے ہیں۔ عرفیت اِس لفظ سے نکلا ہے۔ اِسی لیے اِس جگہ کا نام عرفات ہے۔ یہاں ہی حضرت آدمؑ اور سیّدہ حواؑ ملاقات کے بعد توبہ و اِستغفار کرتے رہے تھے۔ اِسی لیے سب حاجی یہاں توبہ کرتے ہیں، دعائیں مانگتے ہیں۔

"حج کا سب سے بڑا رُکن اِس جگہ قیام کرنا ہے۔ یہ عظمت والی جگہ ہے لیکن حدودِ حرم سے باہر۔ یہ جگہ مسجد الحرام سے جنوب مشرق میں ۲۲ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ اِس کی حدود کے آگے بورڈ لگے آپ سب نے دیکھ ہی لیے ہیں۔ دنیا جہاں سے آئے ہوئے حاجی صاحبان ۹ ذی الحجہ کو یہاں جمع ہوتے ہیں۔ خطبۂ حج سنتے ہیں۔ ظہر و عصر کی نمازیں امام کی اقتدا میں ظہر کے وقت ایک اذان اور دو اقامتوں کے ساتھ قصر کر کے پڑھتے ہیں۔ اِس لیے اُنھیں جمع و قصر کہتے ہیں۔ پورے حج کا نچوڑ یہاں وقوف کرنا اور دُعائیں مانگنا ہی ہے۔

"اللہ تعالیٰ ۹ ذی الحجہ کو پہلے عرش پر آ جاتے ہیں۔ فرشتوں سے فرماتے ہیں، یہ لوگ میری رضا کے لیے پراگندہ حال یہاں آئے ہیں۔ جاؤ عرفات والو! میں نے تمہاری مغفرت کردی۔ پورا عرفات ہی وقوف کے لیے ہے۔ عرفات
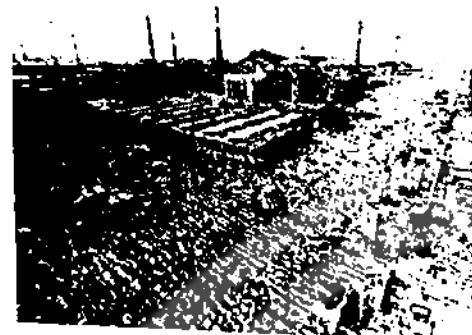
میں جہاں کسی نے وقوف کیا، اُس کا رکنِ اعظم ادا ہوگیا۔ یہاں یومِ عرفات کو پاؤں رکھنے کی جگہ نہیں ملتی۔ تا حدِ نظر کالے سر اور سفید لباس ہی نظر آتے ہیں۔

"سب حاجی تو مسجدِ نمرہ میں نماز ادا نہیں کر سکتے، اِس لیے بہت زیادہ حاجی اپنے بڑے بڑے خیموں میں نماز ادا کرتے ہیں۔ خطبے اور نماز کی آواز ہر جگہ گونج رہی ہوتی ہے۔ ۹ ذی الحجہ کو یہاں عرفات میں بہت بڑے بڑے خیمے نصب ہوتے ہیں جو مکتبِ حج یعنی معلم حضرات کی طرف سے لگتے ہیں۔ دوپہر کا کھانا معلم حضرات کی طرف سے دیا جاتا ہے۔ پوری دنیا سے آئے ہوئے اللہ کے مہمان اُس دن یہاں ہوتے ہیں۔ لوگوں کو اللہ کی رحمت ڈھانپ لیتی ہے۔

"یہاں پورا دن قیام کر کے بسیں شام سے پہلے ہی چلنا

شروع ہو جاتی ہیں تاکہ حدودِ عرفات کے آخر تک بروقت پہنچ جائیں۔ لیکن یہ سب کچھ بہت مشکل ہوتا ہے۔ سورج غروب ہوتا ہے، تو ایک بہت بڑی توپ چلائی جاتی ہے تاکہ سب کو پتا چل جائے کہ اب روانگی کا وقت ہو گیا ہے۔ پیدل چلنے والے فائدے میں رہتے ہیں۔ بسوں والے تو رات کو کہیں ایک دو بجے مزدلفہ پہنچتے ہیں۔ پھر بسوں کو کھڑی بھی نہیں کرنے دیتے۔ چلیں اب بسوں میں آجائیں۔"

ہمیں تفصیل بتا دی گئی تھی، اِس لیے سب ہی بس میں آ گئے۔

"یاضیوف الرحمٰن! آپ اب پورے عرفات کو عبور کریں گے۔ اپنے اردگرد دیکھتے رہنا کہ یہاں قسمت سے ہی آیا جاتا ہے۔ ہوسکتا ہے اگلے سال یا چند برسوں بعد آپ میں سے کچھ خوش قسمت ترین انسان اِن ہی راہوں کے راہی بنیں۔"

مزدلفہ کا آغاز

حاجی صاحب تفصیل بتا رہے تھے، جب بس ایک بڑے سے نالے پر پہنچی۔ عربی میں ایسے بڑے بڑے نالوں کو 'وادی' کہتے ہیں۔

"یاضیوف الرحمٰن! یہاں حدودِ عرفات ختم ہو جاتی ہے۔ بورڈ آپ نے بھی دیکھ ہی لیے ہیں۔ پل عبور کر کے ہم مزدلفہ کی حدود میں داخل ہو جاتے ہیں۔ لیجیے اب ہم مزدلفہ کی حدود میں داخل ہو چکے۔ مزدلفہ کی حدود کے بڑے بڑے بورڈ آپ نے دیکھ ہی لیے ہیں۔ مزدلفہ، عرفات اور منیٰ کے درمیان ہے۔ مزدلفہ مشعر ہے، حدودِ حرم میں داخل ہے۔ اب ہمارا اگلا پڑاؤ مسجد مشعر الحرام ہے۔"

ہمارے چاروں طرف گھنے درخت تھے۔ عمارات کوئی نہیں تھیں۔ بیت الخلا بلاک تھوڑے تھوڑے فاصلے پر تھے۔ عرفات کی طرح اِن کے ... بلکہ نصب ... تھے۔

"یاضیوف الرحمٰن! دائیں طرف پہاڑوں کی طرف دیکھیں۔ یہاں آپ کو نہر زبیدہ نظر آرہی ہے۔"

تھوڑی دیر بعد مجھے مسجد مشعر الحرام کے اونچے اونچے مینار نظر آنے لگے۔ جیسے ہی بس رکی، حاجی صاحب کی آواز آئی:

مشعر الحرام

"یاضیوف الرحمٰن! اب ہم مسجد مشعر الحرام کے سامنے ہیں۔ یہ مسجد عین اُس جگہ پر ہے جہاں حضور پاک ﷺ نے قیام فرمایا تھا۔ یہاں پہلی مسجد کس خلیفہ یا حکمران نے بنائی، مجھے یاد نہیں۔ سعودی حکومت نے یہ مسجد کوئی پندرہ سال پہلے بنائی ہے۔ اِس مسجد میں بارہ ہزار سے زیادہ افراد نماز پڑھ سکتے ہیں۔ عورتوں اور مردوں کے لیے اَن گنت بیت الخلا ہیں اور بے شمار وضو کی ٹونٹیاں ہیں۔ مسجدِ نمرہ سے اِس مسجد کا فاصلہ تقریباً سات کلومیٹر ہے اور مسجد خیف سے یہ پانچ کلومیٹر دور ہے۔ مزدلفہ کا ذکر قرآن پاک کی سورہ بقرہ میں ہے جس کا ترجمہ ہے (جب تم عرفات سے پلٹو، تو مشعر الحرام میں اللہ کا ذکر کرو۔) سارا مزدلفہ مشعر الحرام ہے۔

"ہمارے نبی کریم آقائے دو جہاں ﷺ نے اِس مسجد والی جگہ قیام فرمایا تھا اور یہاں ہی ایک اذان اور دو تکبیروں کے ساتھ مغرب و عشاء کی قصر نماز ادا فرمائی تھی اور ارشاد فرمایا تھا کہ میں نے یہاں قیام فرمایا ہے۔ سارا مزدلفہ قیام گاہ ہے۔

"حاجی صاحبان اِسی مزدلفہ سے رمی جمرات کے لیے کنکریاں چنتے ہیں یعنی شیطانوں کو مارنے کے لیے کنکریاں اکٹھی کی جاتی ہیں۔ جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں یہاں عمارتیں نہیں ہیں، نہ ہی یہاں خیمے نصب کیے جاتے ہیں۔ نہ ہی کسی معلم یا مکتب کی کوئی مخصوص جگہ ہوتی ہے۔ جہاں کسی کو جگہ ملتی ہے، کھلے آسمان تلے رات گزارتے ہیں۔ سب حاجی صاحبان دعائیں مانگتے مانگتے ہی رات گزار دیتے ہیں۔ پہلے

... اتنا ہموار نہیں ہوتا تھا۔ پہاڑیاں اور اونچی نیچی جگہیں تھیں۔ اب کافی حد تک ہموار کر دیا گیا ہے۔ اِس مزدلفہ میں ... بیت الخلا اور پانی کے کولر موجود ہیں۔ اب آپ بس ... مسجد تک جا سکتے ہیں۔ مسجد بند ہے، اِس لیے جلد ... آنا ہوگا۔"

ہم بس سے اتر آئے۔ مسجد کے اردگرد بے شمار بسیں کھڑی تھیں۔ ان گنت زائرین کرام اپنے اپنے گروہوں کے ساتھ موجود تھے۔ اُن کے گائیڈ یا معلم چھوٹے چھوٹے ... اُن سے لگائے اُنھیں تاریخ سے روشناس کرا رہے تھے۔ اب تک ہم جہاں جہاں بھی گئے تھے، میرے اب تک کے مشاہدے میں جو آیا تھا، وہ یہی تھا کہ سب سے زیادہ ... گروپ ایران کے تھے۔ پھر ترکیہ، ملائیشیا اور انڈونیشیا ... تھے۔ بھارتی ملباریوں کے گروہ بھی نظر آئے تھے۔ مجھے اپنے پاکستانیوں کا اِس طرح کوئی گروپ نظر نہیں آیا۔ ہم اِس بس میں پچاس افراد تھے۔ حاجی صاحب ہمیں ... تفصیل بتا دیتے تھے۔ وہ صرف جبلِ رحمت پر ... ساتھ گئے تھے۔ یہاں سے چلے، تو حاجی صاحب ...

اگلا پڑاؤ

"اگلی منزل منیٰ ہے۔ منیٰ کو اہلِ عرب 'مونا' (Muna) کہتے ہیں۔ مونا یا منیٰ حدودِ حرم کے اندر ہے۔ یہ مکہ اور مزدلفہ کے درمیان ہے۔ مسجد الحرام سے مشرق کی طرف تقریباً ... یا ساڑھے سات کلومیٹر دور ہے لیکن سرنگیں بننے سے پہلے ... کا فاصلہ صرف چار کلومیٹر ہے۔ ابھی ہم مزدلفہ سے منیٰ یا مونا کی طرف جا رہے ہیں، تو سب سے پہلے وادیٔ محسر آتی ہے۔ یہ بڑے بڑے بورڈ آپ دیکھ رہے ہیں۔ یہ وادیٔ ... ہے۔ یہ جگہ حدودِ حرم میں ہے لیکن جائے عبرت۔ اِس کا ذکر قرآن پاک کی سورۃ الفیل میں ہے۔ یہاں سے سب حاجی تیزی سے گزرتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ جب وادیٔ محسر سے گزرے تھے، تو آپؐ نے اپنی رفتار تیز کر لی تھی۔ آپؐ کی یہ عادتِ مبارکہ تھی کہ دورانِ سفر جب بھی کسی ایسی جگہ سے گزرتے جہاں عذابِ الٰہی نازل ہوا ہوتا، تو تیزی سے گزرتے تھے۔ اِس وادی میں ہاتھی والوں پر عذابِ الٰہی نازل ہوا تھا۔

"ہاتھی والوں کا ذکر آپ سب نے پڑھا، سنا ہوا ہے۔ یمن کے گورنر ابرہہ نے کعبۃ اللہ کو مسمار کرنے کی ناپاک جسارت کی تھی۔ وہ بہت بڑا لشکر لے کر کعبہ ڈھانے آیا تھا۔ اُس کے لشکر میں بہت سے ہاتھی بھی تھے۔ وہ خود بھی ایک بڑے ہاتھی پہ سوار تھا۔ یہاں کہیں اِس وادی میں اُس کا ہاتھی بیٹھ گیا تھا۔ وہ مکۃ المکرمہ کی طرف نہیں جاتا تھا۔ باقی کسی بھی سمت میں ہانکا جاتا، تو تیزی سے دوڑنے لگتا لیکن بیت اللہ کی طرف نہ جاتا۔ اُس وقت اللہ تعالیٰ نے چھوٹی چھوٹی ابابیلوں کے لشکر بھیجے۔ اُن پرندوں کی چونچوں اور پاؤں میں کنکریاں تھیں۔ یہ پرندے کنکریاں لشکریوں پر گراتے۔ جسے بھی وہ کنکری لگتی، اُس کے ٹکڑے ہونا شروع ہو جاتے اور وُہ مر جاتا۔ لشکر افراتفری میں واپس بھاگا۔ اُن کے امیر لشکر کا یہ حال تھا کہ اُس کا گوشت گل سڑ کر گر رہا تھا۔ وہ عبرت ناک موت مرا تھا۔ یہ وہی وادی ہے۔

"اب آپ منیٰ یا مونا کے خیمے دیکھ رہے ہیں۔ پہلے زمانے میں اتنا اچھا انتظام نہیں تھا۔ جگہ بھی بہت اونچی نیچی تھی۔ اب تو بڑی منصوبہ بندی سے سڑکوں کا جال بچھا دیا گیا ہے۔ بے شمار پُل بنا دیے گئے ہیں۔ اَن گنت بیت الخلا اور پانی کے کولر ہیں۔ ڈسپنسریاں موجود ہیں، پولیس اسٹیشن اور فائر بریگیڈ ہیں۔ نہایت منظم طریقے سے اِن میں خیمے لگائے گئے ہیں۔ یہ جو سفید مخروطی خیمے آپ دیکھ رہے ہیں، اِن پر آگ اثر نہیں کرتی۔ اِن میں ایئر کولر لگے ہوئے ہیں۔ سعودی حکومت حاجی صاحبان کی خدمت کے لیے بے شمار اقدامات

کرتی رہتی ہے۔ حاجی صاحبان کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے اور ناواقف ہونے کی وجہ سے وہ زیادہ مستفید نہیں ہو سکتے۔

قربان گاہ

''یاضیوف الرحمٰن! اب ہماری بس قربان گاہ کے پاس سے گزر رہی ہے۔ یہ حدِ نظر تک پھیلی قربان گاہ ہے۔ یہ دنیا کا جدید ترین اور سب سے بڑا مذبح خانہ ہے۔ یہاں منٹوں کے حساب سے جانور ذبح کیے جاتے ہیں۔ اُنھیں صاف کیا جاتا ہے اور سیدھا ڈیپ فریزر ٹائپ کنٹینروں میں لوڈ کر دیا جاتا ہے۔ یہ گوشت غریب ممالک کے مسلمانوں کے لیے بھیج دیا جاتا ہے۔ یہاں جس نے خود قربانی کرنی ہو، وہ کر سکتا ہے لیکن بہت زیادہ دیر ہو جاتی ہے، کیونکہ بہت زیادہ لوگ اپنے ہاتھوں سے قربانی کرنا چاہتے ہیں۔

''یاضیوف الرحمٰن! مَیں نے پہلا حج ۱۹۷۸ء میں ادا کیا تھا۔ اُس وقت یہاں کوئی سہولت نہ تھی۔ خیمے تھے نہ ہی قربان گاہ۔ مختلف جگہوں پر جانوروں کی منڈیاں لگی ہوتی تھیں۔ ہر منڈی کے ساتھ ایک بہت بڑا اور بہت گہرا گڑھا ہوتا تھا۔ ہم جانور پسند کرتے، قیمت ادا کرتے اور قصاب چھری پھیر کر جانور کو گڑھے میں دھکا دے دیتا۔ جب گڑھا بھر جاتا، تو اوپر مٹی ڈال کر اُسے بند کر دیا جاتا۔ اَن گنت یا لاکھوں جانوروں کا گوشت مٹی میں مل جاتا۔ سعودی حکومت نے یہ جدید ترین مذبح خانہ بنا کر بہت عظیم کام کیا۔ بذریعہ بینک آپ کی قربانی ہو جاتی ہے۔

''یاضیوف الرحمٰن! ابھی آپ کو بائیں ہاتھ پر ایک بہت بڑا اور لمبا شیڈ نظر آ رہا ہے۔ یہ پیدل چلنے والوں کے لیے ہے۔ مسجد الحرام کے پاس سے بہت اونچے پہاڑوں کے اندر سے سرنگیں بنائی گئی ہیں۔ جہاں سرنگ ختم ہوتی ہے، وہاں سے یہ شیڈ شروع ہو جاتا ہے۔ اِس شیڈ کے ساتھ ساتھ بیت الخلا بنائے گئے ہیں اور اَن گنت پانی کے کولر نصب ہیں۔

ویسے پورے منیٰ یا مونا میں حج کے دنوں میں لوگ مفت پانی، لسی اور جوس کی بوتلیں تقسیم کر رہے ہوتے ہیں۔ خادم الحرمین شریفین کی طرف سے کھانے کے ڈبے تقسیم کیے جاتے ہیں۔

شیطان کے ستون

''ابھی آپ کو سامنے وہ بہت اونچی اونچی عمارتیں نظر آ رہی ہیں۔ اُن کے اندر وہ بڑے بڑے ستون ہیں جنھیں عرفِ عام میں شیطان کہتے ہیں۔ عربی میں شیطان کو کنکر مارنے کو رمی جمرات کہتے ہیں۔ رمی کرنا یعنی کنکریاں مارنا حج کے واجبات میں سے ہے۔ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ مجھ سے احکامِ حج سیکھ لو۔ آپؐ نے یہاں کنکریاں ماری تھیں۔ کنکریاں مارنا اِس جذبے کا اظہار ہے کہ شیطان ہمارا دُشمن ہے۔ یہ پتھر کے ستون شیطان نہیں لیکن جگہ وہی ہے جہاں حضرت ابراہیمؑ نے شیطان کو کنکریاں ماری تھیں۔

''حضرت ابراہیمؑ اللہ کے حکم سے اپنے پیارے بیٹے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو قربان کرنے کے لیے جا رہے تھے۔ شیطان اُنھیں روکتا تھا۔ جہاں وہ اُنھیں روکتا، وہاں آپؑ اُسے پتھر مار کر بھگا دیتے۔ تین جگہ اُس نے روکا تو اُن تینوں مقامات پر بطورِ نشانی بڑے بڑے ستون بنا دیے گئے۔ حاجی صاحبان اُنھیں کنکریاں مار کر حج کے واجبات ادا کرتے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ کی سنت زندہ کرتے ہیں۔ ہمارے بھائیوں کی تسلی چھوٹی چھوٹی کنکریاں مارنے سے نہیں ہوتی، وہ پتھر اور جوتیاں تک مارتے ہیں۔ اِن ستونوں کے گرد دیواریں بنی ہوئی ہیں تاکہ حاجی اُن سے دور اور دوسرے حاجیوں کی کنکریوں کے وار سے بھی محفوظ رہیں۔ کنکریاں بھی ادھر اُدھر بکھر کر حاجیوں کی تکلیف کا باعث نہ بنیں بلکہ ایک جگہ اکٹھی ہوتی جائیں۔

قسط کا بقیہ حصہ شمارہ مئی میں

مرزا عقل والے...

اپنے منہ میاں مٹھو بنے ایک شخص کا قصّہ، قدرت نے بھی عجب ڈھنگ میں سبق سکھایا

مزاح — فیصل القدوسی

مرزا صاحب ہمارے بہت اچھے دوست ہیں۔ بہت ذہین اور ہونہار شخص۔ ایسی کوئی چیز نہیں جس پر اُنھیں مہارت نہ ہو (اُن کی دانست میں)۔ ایک بار کسی محفل میں ضرب الامثال پر بات چل نکلی۔ ہمارا خیال تھا کہ زیادہ تر ضرب الامثال میں سو فیصد سچائی لازمی ہوتی ہے۔ یہ سن کر مرزا صاحب بھڑک گئے، کہنے لگے:

''سب جھوٹی اور بے سری باتیں ہیں۔ ارے بھئی اِن کا تو نام ہی عجیب ہے۔ بھلا ضرب المثل بھی کوئی نام ہوا؟ ضرب کی مثال دیں یا مثالوں کو ضرب ماریں۔ یار بیگ صاحب! آپ ہی بتاؤ کہ اِن بے تکے نام والی چیزوں میں کیسے سچائی ہو سکتی ہے؟''

بیگ صاحب یہ سن کر دائیں بائیں دیکھنے لگے۔ لیکن وہ کیا بولتے.....اپنی مخالفت کرنے پر مرزا صاحب اُنھیں ہی ضرب المثل بنا چھوڑتے، لہٰذا ہمیں ٹھوکے مارنے لگے۔ ہم نے کھنکار کر بات شروع کی:

''دیکھو بھئی مرزا! جیسے اب تمہارے سوال کرنے پر بیگ صاحب دائیں بائیں تکنے لگے، تو اِسے محاوروں کی زبان میں آئیں بائیں شائیں کرنا کہتے ہیں۔ لہٰذا یہاں پر یہ تو ثابت ہو گیا کہ محاورے سچ ہوتے ہیں۔ رہی بات ضرب الامثال کی تو.....'' ہم کوئی ضرب المثل سوچنے لگے کہ جس کی مثال سے ضرب الامثال کی سچائی ثابت کی جا سکے۔ مگر مرزا صاحب نے بسم اللہ کر دی۔ کہنے لگے:

''او بھئی تمہارے محاورے بھی سارے بے ڈھنگے ہی ہیں۔ بھلا بتاؤ دائیں بائیں دیکھنے کو آئیں بائیں شائیں کہنے کی کیا تک بنتی ہے؟ بولو نا اب.....!'' مرزا ہمارے اوپر چڑھ دوڑ رہے تھے..... اور اِسی چڑھنے سے ہمیں ایک ضرب المثل یاد آ گئی۔

''اچھا چھوڑو آئیں بائیں شائیں کو..... ایک ضرب

المثل سنو۔ ایک مکڑی جالے کے ذریعے چھت پر چڑھ رہی تھی۔ لیکن وہ تھوڑا سا فاصلہ طے کرتی، تو اُس کا جالا ٹوٹ جاتا اور مکڑی دھڑام سے..... نہیں دھڑام سے نہیں، مطلب آرام سے نیچے گرتی۔ وہ بار بار اُوپر چڑھنے کی کوشش کرتی لیکن نیچے گر جاتی۔ اُس مکڑی نے ہار نہیں مانی اور یوں کوشش کرتے کرتے وہ چھت پر چڑھ ہی گئی۔ اب اِس ضرب المثل سے ہمیں یہ......"

"اِس سے بڑا جھوٹ بھی کوئی ہوگا بھلا؟ ارے زمین نہ پھٹ گئی یہ سفید جھوٹ بولتے ہوئے۔ بتاؤ کہ اُس مکڑی کو چھت پر جا کر کیا کرنا تھا؟ کسی پنکھے کی مرمت کرنی تھی؟ چھت پر چونا پھیرنا تھا؟ کسی سولر پلیٹ کی مٹی صاف کرنی تھی؟ کیا وجہ تھی جو وہ مکڑی اتنی اتاولی ہوئی جا رہی تھی؟ بلکہ پہلے تو یہ بتاؤ کہ یہ کہانی تمھیں کس نے سنائی؟ کیوں کہ بھیا ہمیں تو اِس شیطان کی آنت جتنی لمبی زندگی میں آج تک کوئی مکڑی چھت پر چڑھتی نظر نہیں آئی۔ ارے بولو میاں! یہ بے سر پیر کا جھوٹ کس نے گھڑا، کیوں گھڑا؟"

مرزا صاحب خاموش ہوئے، پیچھے ہو کر بیٹھے اور بازو کے کف سے منہ میں آیا کف صاف کرنے لگے۔ ہم سب مجسم محاورے، ضرب الامثال، حکایتیں اور کہاوتیں بنے بیٹھے رہے۔

ہمارے مرزا ہر چیز کا بھرپور فائدہ اُٹھاتے ہیں اور اِس حد تک مطلوبہ چیز کو اِستعمال کرتے ہیں کہ اُس کے آگے پیسٹ کی ٹیوب بیلن یا گاڑی تلے رکھ کر خالی کرنے کی مثال بھی شرمندہ نظر آتی ہے۔

ابھی چند دن پہلے کا قصہ ہے۔ ہمیں اپنے جی ایچ کیو سے آرڈر ملا کہ آج لوکی کا رائتہ بنے گا مگر وہ ندارد ہے۔ اِس لیے لوکی خرید کر جلد سے جلد واپس ہیڈ کوارٹر رپورٹ کریں۔

ہم جذبہ حب الوطنی سے سرشار فوراً باہر کو ہو لیے۔ سوچا کہ پیدل ہی چلے چلتے ہیں، شاید پٹرول کی قیمت میں ہی لوکی مل جائے۔ مگر اُسی وقت مرزا پر نظر پڑی جو ایم اسے راحت کے صدیوں پرانے بیٹے کے دور کا اسکوٹر اسٹارٹ کرنے کی کوشش میں تھے۔ ہم اُن کی جانب چل پڑے تاکہ اسکوٹر کی لفٹ لے سکیں حالانکہ اُس کی حالت ایسی تھی کہ مرزا کو ہی اُسے لفٹ دینی پڑتی ہوگی۔ خیر اسکوٹر اسٹارٹ ہوا، مرزا نے بھی حاتم کی قبر پر لات ماری اور ہم اپنی لاتیں اسکوٹر کے دونوں جانب پھیلا کر بیٹھ گئے۔

اب اصل قصہ سنیے جس کے لیے اتنی بڑی تمہید باندھنی پڑی۔ جب بھی کوئی اسپیڈ بریکر (اِس کا اردو ترجمہ ہم رفتار شکن کر لیتے ہیں) آتا، تو مرزا اسکوٹر کی رفتار بالکل آہستہ کر لیتے اور یوں ایکسی لیٹر نہ دینے کے باعث اسکوٹر وہیں بند ہو جاتا۔ اور یہ تو آپ بھی جانتے ہوں گے کہ جتنی پاکستان میں بچوں کی آبادی ہے، اتنے ہی ہمارے دیس میں رفتار شکن ہیں۔ الحمدللہ ہم پاکستانی اِن دونوں چیزوں میں خودکفیل ہیں۔ تو سمجھ لیجیے کہ آپریشن لوکی خرید کے محاذ تک پہنچنے میں مرزا کو کتنی بار اسکوٹر اسٹارٹ کرنا پڑا ہوگا۔ ہم نے مرزا کو سمجھایا:

"دیکھو مرزا! اِن اچھلوؤں کے بالکل کنارے پر نیم ہموار سڑک ہے، تو تم یہیں سے اسکوٹر کیوں نہیں گزارتے؟ اِس سے تمھیں رفتار بھی کم نہیں کرنی پڑے گی اور اسکوٹر بند بھی نہیں ہوگا۔"

مرزا صاحب چونکہ حد سے زیادہ سمجھ دار ہیں، اِس لیے بغیر پرکھے کوئی چیز استعمال میں نہیں لاتے

یہ سن کر مرزا فوراً بھڑک گئے اور دایاں ہاتھ ایکسی لیٹر سے ہٹا کر نچانے لگے۔ شاید کچھ کہنا چاہتے ہوں مگر اسکوٹر ایک جھٹکے سے بند ہو گیا تھا۔ لیکن مرزا نے کچھ کہنے کی چاہت پھر بھی پوری کی:

"ارے میاں تمہارے کو کیا خبر؟ یہ اچھلو یا اسپیڈ بریکر

...س لیے بنائے جاتے ہیں؟ ہمارے لیے ہی نا۔ جب ہمارے لیے ہیں، تو ہم ہی استعمال کریں گے اور فائدہ اُٹھائیں گے۔ کوئی ایلین تو آ کر یہاں اچھلنے سے رہے۔"

ہم تو ہکا بکا، ہک دک، چغد اور ہونق جیسی ساری کیفیات میں گھرے اُنھیں تکتے رہے۔ ہوش آنے پر سوچا کہ مرزا سے پوچھیں کہ اِن اچھلوؤں پر اچھلنے کا کیا اور کیسا فائدہ..... مگر یہ سوچ سوچ ہی رکھنی پڑی۔ آپ بھی صرف سوچیے گا، مرزا کی طرح ہر چیز کا فائدہ اُٹھانے مت لگیے گا۔

مرزا صاحب چونکہ حد سے زیادہ سمجھ دار ہیں، اِس لیے بغیر پرکھے کوئی چیز استعمال میں نہیں لاتے۔ اور یہ جانچ پرکھ کا عمل کئی بار اُنھیں اپنی سمجھ کی جانچ پرکھ کا اشارہ کر چکا۔ مگر مرزا کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی، کیسے رینگے..... جوں ہو گی تو رینگے گی۔ خیر! مرزا کے گھر میں چند دن قبل چوہوں نے یورش کر دی۔

جب گھر والے خوب تنگ آ چکے، تو مرزا کے ہاتھوں بازار سے ایک کھٹکا (جس کے ذریعے چوہوں کو مارا جاتا ہے) منگوایا گیا۔ مرزا نے کھٹکا خریدا، دکان دار سے استعمال کرنے کا طریقہ سمجھا اور گھر آ گئے۔ اب گھر میں کھٹکا لگانے کی ذمے داری بھی اُنہی کی تھی، تو اُنھوں نے روٹی کا ایک چھوٹا ٹکڑا کھٹکے میں چارے کے طور پر لگایا اور اُسے تیار کر دیا۔

اُسی وقت اُنھیں خیال آیا کہ چوہا اِس میں پھنسے گا بھی یا نہیں اور پھنسے گا تو کس طرح۔ اِسی بات کا تجربہ کرنے کے لیے اپنے ہاتھ کی دو اُنگلیوں کو کسی انسان کی ٹانگوں کی طرح دوڑاتے ہوئے قریب لائے۔ اور اَنگوٹھے کو چوہے کا منہ تصور کرتے ہوئے روٹی کے ٹکڑے پر مارا۔ چشم زدن میں تین چیزیں ایک ساتھ ہوئیں۔ ایک زوردار کھٹاکا ہوا، مرزا نے سمع خراش چیخ ماری اور اُچھلنے کودنے لگے۔

گھر والوں کو لگا کہ یہ شاید جنوبی افریقن زولو قبیلے میں شامل ہو گئے ہیں اور اُن کا روایتی رقص کر رہے ہیں۔ یہ تھوڑی کسی کو پتا تھا کہ مرزا کی پرکھ کا عمل پورا ہو گیا تھا۔ جب مرزا کے حواس حواسوں میں لوٹے، تو اُنھوں نے تجربے کی روش ترک کر کے ہر سنی سنائی پر ایمان لانے کا فیصلہ کر لیا۔ جب مرزا نے ہمیں یہ واقعہ سناتے ہوئے اپنا ایمان بدلنے کی بات کی، تو ہمارا ایمان مزید پکا ہو گیا۔ کیوں کہ ہم تو پہلے بھی سوال اٹھانے اور جانچ پڑتال کے قائل نہ تھے۔

ضمیر برائے فروخت

ایک صاحب اپنے حلقے سے انتخابات میں بطور اُمیدوار کھڑے ہوئے اور خوب دھوم دھام سے جلسہ کیا۔ دیر تک تقریر کرنے کے بعد آخر میں نہایت درد بھری آواز میں بولے: "حضرات! جو کچھ مَیں نے عرض کیا، اُس کے علاوہ عہد کرتا ہوں کہ خواہ کچھ ہو جائے، مَیں اپنا ضمیر فروخت نہ کروں گا۔"

مخالف امیدوار کی جماعت کا ایک آدمی یہ سن کر اٹھا اور مجمع سے خطاب کرتے ہوئے کہنے لگا "دوستو! یہ بات بھی یاد رکھو کہ چیز وہی فروخت کی جاتی ہے جو موجود ہو۔"

سزا

بیمہ کمپنی کے ایجنٹ سے ایک صاحب نے پوچھا "اگر آج مَیں اپنی بیوی کی زندگی کا بیمہ کراؤں اور وہ کل مر جائے، تو مجھے کیا ملے گا؟" "پھانسی!" بیمہ ایجنٹ نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

کرسٹل ہاؤس

نیلوفر اقبال

حیاتِ انساں چاہے جتنے بھی اسبابِ عیش و آرام رکھے، رفتہ رفتہ گزر ہی جاتی ہے

اُس جوڑے میں کوئی خاص بات تھی جو اُنھیں پہلی نظر دیکھنے میں دوسروں سے کچھ ہٹ کر اور منفرد بناتی تھی..... وہ اِنسانوں سے زیادہ پرندوں کا جوڑا نظر آتے۔ دونوں کی جسامت ایک جیسی تھی۔ گورے رنگ، اکہرے بدن، کچھ کچھ آگے کو جھکے ہوئے، چہرے نوکیلے اور ناکیں پرندوں کی چونچوں کی طرح سامنے سے جھکی ہوئیں جیسے وہ فرسٹ کزن ہوں۔ ہو بھی سکتے تھے اور نہیں بھی۔ ممکن ہے کہ ہر وقت ساتھ رہنے اور وقت کے ساتھ ساتھ وہ ایک دوسرے سے مشابہت اختیار کر گئے ہوں۔

یہ جوڑا اِس لیے بھی سب کی نظروں میں آتا تھا کہ روزانہ ٹھیک شام پانچ بجے وہ اِکٹھے بلاناغہ سیر کے لیے نکلتے۔ عورت عموماً سفید پاجامے اور پھولدار قمیص میں ملبوس ہوتی۔ آدمی سیاہ ٹریک سوٹ اور سفید جوگرز میں ہوتا۔ دونوں کے ہاتھ میں چھڑی ہوتی۔ وہ چھڑی کو ٹیکتے نہیں تھے بس چلتے وقت آگے پیچھے جھلاتے۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ وہ دونوں اپنے ساتھ چھڑی کیوں رکھتے؟ ممکن ہے ماضی میں کبھی اُن پر کسی کتے نے حملہ کر دیا ہو یا جنگلی خنزیروں کا جتھا کبھی اُن کا راستہ کاٹ گیا ہو اور وہ حفظِ ماتقدم کے طور پر چھڑی ساتھ رکھتے ہوں۔ بہرحال یہ اُن کا سٹائل تھا۔ سلور گرے بال اور چھڑی اُن پر خوب جچتے تھے۔

اِس پورے علاقے میں اُن کا مکان بھی دوسرے تمام گھروں کی نسبت ممتاز نظر آتا تھا۔ یہ مکان اطالوی طرزِ تعمیر پر بنایا گیا تھا۔ باہر سے سینڈ سٹون (Sand Stone) سے مزین تھا اور کھڑکیاں کچھ ایسے بنی تھیں کہ اندر سِل پر رکھی خوبصورت سجاوٹی اشیاء باہر دکھائی دیتی تھیں۔ مکان کی چھت سبز کھپر یل تھی۔ ایک جانب مکان کی پوری سائیڈ آئیوی (Ivy) سے ڈھکی تھی جسے نفاست سے کھڑکیوں کے چاروں اطراف سے تراش دیا گیا تھا۔ لان کے گرد دیوار بھی آئیوی سے ڈھکی تھی اور اِتنی نیچی کہ لان باہر سے پوری طرح دکھائی دیتا۔ وہ اِس علاقے کا دلکش ترین لان تھا اور مکینوں کے اعلیٰ ذوق کی غمازی کرتا۔ اسلام آباد کا پرانا سیکٹر ہونے کی وجہ سے مکان پرانے اور گھنے پھولدار درختوں سے گھرا ہوا تھا۔ سبز مخمل کی سی نفیس گھاس قالین کی صورت لان میں بچھی تھی۔ رنگ برنگی پھولوں کے علاوہ یہ لان نادر قسم کے پودوں اور پیڑوں سے بھی مزین تھا۔

پھر ایک خاص چیز وہ چھوٹی سی ندی تھی جو لان کے ایک طرف بنی ہوئی راکری (Rockery) تک جاتی۔ اُس ندی کے اوپر پرانی لکڑی سے بنا خم کھایا ہوا چھوٹا سا پُل تھا۔ اُس کے پہلو میں ہی سرخ اور سفید دھاریوں والی خوبصورت چھتری کے نیچے چار کرسیوں کا سفید گارڈن سیٹ رکھا تھا۔ اُس پر عام طور پر تو کوئی چائے پیتا نظر نہ آتا تھا لیکن کبھی کبھار جب اُن کے بچوں میں سے کوئی آیا ہوتا، تو لان میں خوب چہل پہل ہو جاتی اور اکثر شام کو یہ لوگ اُسی میز پر چائے پیتے نظر آتے۔

اکثر جب اُن کی دبئی والی بیٹی آئی ہوتی، لان میں رنگوں کے جھماکے سے ہوتے رہتے۔ اُس کی سہیلیاں ملنے آتیں، تو وہ لان میں ٹہلتی رہتیں یا چائے پیتیں۔ وہ دُور سے بالکل انگریز نظر آنے والی خوبصورت لڑکی تھی جو زیادہ تر جینز اور ٹاپ میں نظر آتی۔ اُس کے سنہرے رنگے ہوئے بال لہراتے رہتے۔ فلپائنی آیا اُس کے گورے گورے گول مٹول بچوں کے ساتھ لان میں بال کھیلتی یا اُنھیں ایک طرف نصب جھولوں اور سی سا (Sea Saw) پر لے جاتی۔ اکثر وہ بچے لکڑی کے پُل پر چڑھتے، اترتے رہتے یا چھوٹے سے سفید کتے سے کھیلتے رہتے۔

کبھی کبھی اُس لان میں بہت بڑی گارڈن پارٹی ہوتی۔ پودوں اور پیڑوں کے اندر سے ننھی ننھی بتیوں کی روشنی جھلملاتی۔ راکری میں نصب آبشار چالو کر دی جاتی جس کے نیچے سنگِ مرمر کا کائی زدہ مجسمہ خوب مزے لے لے کر نہاتا۔ کیٹرنگ باہر سے کروائی جاتی۔ اکثر باربی کیو ہوتا۔ پاس پڑوس کے گھروں سے کسی کو مدعو نہ کیا جاتا۔ البتہ باربی کیو سے اٹھنے والا خوشبودار دُھواں اُن گھروں میں در آتا اور کراکری

> **بات کئی متفرق موضوعات سے ہوتے ہوئے لامحالہ اُس کوٹھی کے مکینوں تک جا پہنچی**

اور کانچ کی کھنک اور مہمانوں کے مہذب قہقہے کھڑکیوں کے راستے اُن گھروں کے مکینوں تک پہنچ جاتے۔ وہ اپنی کھڑکیوں سے جدید ترین تراش خراش کے ملبوسات اور خوبصورت رنگوں کے جھماکے دیکھ پاتے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ اِن پارٹیوں میں مدعو ہونے والے لوگ کون ہیں اور کہاں سے آتے تھے۔ سڑک باہر تک گاڑیوں سے بھر جاتی۔ مہمان آدھی رات کے قریب رخصت ہوتے۔

گو اِس گھر میں اُن ہمسائیوں میں سے کوئی بھی مدعو نہ ہوا لیکن اُن کے بارے میں ایک ایک بات مع ضروری د

غیر ضروری جزئیات ہر ایک کو معلوم تھی اور اِس جان کاری کا ذریعہ گھریلو ملازمین تھے۔ ماسیاں تھیں جو پولن زدہ مکھیوں کی طرح گھر گھر بیج پھینکتی تھیں۔ پھر ڈرائیور اور سکیورٹی گارڈز تھے جو رات گئے مل بیٹھتے اور ہر قابلِ ذکر یا ناقابلِ ذکر خبر کا تبادلہ کرلیتے۔

پھر اُن کوٹھیوں کی اِس لین میں چاک و چوبند لڑکوں کے طرز پر بال رکھنے والی مسز شمسی رہتیں جو کسی این جی او سے منسلک تھیں۔ صرف وہی تھیں جو اِس کوٹھی کی مالکن خاتون سے تعارف رکھتیں۔ چونکہ وہ خاتون خود بھی اپنے وقت میں باوجود زیادہ وقت دوسرے ممالک میں رہنے کے خواتین کی تنظیموں کی فعال رکن رہ چکی تھیں، لہٰذا مسز شمسی کسی نہ کسی طرح اُن سے منسلک ہوگئیں اور اُن کی ڈنر پارٹیوں کے مدعوین کی فہرست میں اُن کا نام بھی تھا۔

اِنھی مسز شمسی نے اسی لین کے رہنے والے دوسرے گھروں سے بھی اچھے معاشرتی مراسم رکھے ہوئے تھے۔ اِس لیے اُن کا آنا جانا اِن کوٹھیوں کی تقریبات میں بھی تھا۔ جیسے

شوق صرف چیزیں جمع کرنے اور سجا دینے کی حد تک نہ تھا بلکہ اُن کی صفائی اور حفاظت بھی بہت لگن اور توجہ سے کی جاتی

کوئی ون ڈش پارٹی، میلاد یا ختمِ قرآن۔ جب میلاد یا ختمِ قرآن کا اختتام ہوجاتا اور عورتوں کے کھانے پینے کا دور شروع ہوجاتا، تو اکثر عورتیں آہستہ آہستہ کھسکتیں مسز شمسی کے قریب پہنچ جاتیں جو خاصی خوش گفتار تھیں۔ بات کئی متفرق موضوعات سے ہوتے ہوئے لامحالہ اُس کوٹھی کے مکینوں تک جا پہنچتی اور یوں پاس پڑوس والیاں کچھ نہ کچھ کرید لینے میں کامیاب ہوجاتیں۔

مسز شمسی سے جو معلومات حاصل ہوئیں وہ کچھ یوں

تھیں۔ صاحبِ خانہ فارن سروس سے ریٹائرڈ تھے۔ سروس کے دوران دنیا کے بیشتر ممالک میں تعینات رہ چکے تھے لیکن ریٹائرمنٹ سے قبل مستقل رہائش کے لیے اُنھوں نے اسلام آباد میں یہ مکان تعمیر کروایا تھا۔ دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ اُن سب کو امریکا اور اِنگلستان کی یونیورسٹیوں میں تعلیم دلوائی تھی۔ اب دو بیٹے امریکا میں مقیم تھے۔ بیٹی شادی کرکے دبئی جا چکی تھی۔ بیٹے سال میں ایک بار اکثر کرسمس کے مہینے میں آتے۔ بیٹی البتہ اکثر آتی جاتی رہتی تھی۔

گرمیوں میں یہ لوگ اپنے بچوں کے پاس امریکا چلے جاتے، لہٰذا تنہائی اُن کے لیے کوئی خاص بڑا مسئلہ نہیں تھی۔ اپنی دنیا اور زندگی میں مگن تھے۔ جب یہ لوگ اپنے بچوں کے پاس رہنے جاتے تھے، آس پاس والوں کو خبر ہوجاتی۔ پورچ میں کھڑی گاڑیوں پر ترپال ڈال دی جاتی، لان میں خزاں رسیدہ پتے ڈھیریوں کی صورت جمع ہونے لگتے۔ اور کبھی زور کی ہوا چلتی، تو لمبی ڈرائیو وے پر زرد زرد پتے آپس میں ریس لگاتے۔ دبیز پردوں سے ڈھکی کھڑکیوں کے پیچھے اندھیرا ہوتا۔ صرف سکیورٹی گارڈ کے گیٹ کے ساتھ کونے میں بنے چھوٹے سے کمرے میں بتی روشن رہتی۔

موسمِ سرما سے پہلے چہل پہل پھر واپس آجاتی۔ پورچ میں چم چم کرتی دھلی دھلائی گاڑیاں نظر آنے لگتیں۔ خاکروب چابک دستی سے ڈرائیو وے صاف کرتے۔ لمبی سفید پائپ کی مدد سے گھر کے چاروں اطراف کو دھویا جاتا۔ مالی ہمہ تن لان کی آرائش میں مصروف دکھائی دینے لگتا۔ اِس طرح سب کو پتا چل جاتا کہ صاحبِ خانہ آنے والے ہیں۔ پھر دو چار دِن کے بعد کھڑکیوں کے پردوں کے پیچھے سے جھلکتی روشنی بتا دیتی کہ وہ واپس آچکے۔

جس چیز نے اِس لین کے دیگر مکینوں کا تجسس کوٹھی کے بارے میں بڑھا رکھا تھا، وہ وہاں کی اندرونی آرائش کے بارے میں داستانیں تھیں۔ اُن داستانوں کی راوی مسز شمسی

کے سوا کون ہو سکتی تھی۔ اُن کے کہنے کے مطابق یہ مکان کیا تھا عجائب خانہ تھا۔ دنیا بھر کے نوادرات خاص کر کرسٹل اُس گھر میں جمع تھا۔ کرسٹل کی ایسی ایسی خوبصورت مصنوعات اُس گھر میں جمع تھیں جو بس دیکھنے سے تعلق رکھتی تھیں۔

فارن سروس میں ہونے کی وجہ سے اُن لوگوں کو دنیا کے مختلف ممالک میں رہنے اور گھومنے پھرنے کا موقع ملا تھا۔ دونوں میاں بیوی میں خوبصورت اشیاء خاص کر کرسٹل جمع کرنے کا ذوق خبط کی حد تک موجود تھا۔ فرانس، اٹلی، جرمنی، جاپان غرض جہاں جہاں پوسٹنگ رہی یا یونہی سیر کے لیے گئے، وہاں سے خوبصورت ترین اور بیش قیمت سجاوٹی اشیاء لائے اور اپنے گھر میں سجائیں۔ کئی شوکیس، میزیں، پیڈسٹل، گھر کے کونے حتیٰ کہ سیڑھیاں بھی اُن چیزوں سے مزین تھیں۔ دنیا بھر سے جمع کی گئی پینٹنگز اِس کے علاوہ تھیں۔

شوق صرف چیزیں جمع کرنے اور سجا دینے کی حد تک نہ تھا بلکہ اُن کی صفائی اور حفاظت بھی بہت لگن اور توجہ سے کی جاتی۔ ایک نوکر دن رات صرف اِسی کام کے لیے مامور تھا۔ وہ ہمہ وقت ڈسٹر اور سپرے وغیرہ سے لیس صفائی ستھرائی یا پالش میں لگا رہتا۔ نتیجہ یہ تھا کہ تمام اشیاء ہر وقت جگمگ جگمگ کرتی رہتیں۔

مسز شمسی نے یہ بھی بتایا تھا کہ جس دن گھر میں ڈنر پارٹی ہوتی ہے، اکثر مہمان گھر کا ایک طرح سے گائیڈڈ ٹور بھی لے لیتے۔ بلکہ جو پہلے بھی دیکھ چکے ہوتے، وہ بھی شوقیہ ساتھ ہو لیتے کہ اُن اشیاء میں ہمہ وقت اضافہ ہوتا رہتا تھا۔ کچھ چیزیں ایسی تھیں کہ دیکھنے والے کا سانس اوپر نیچے رہ جاتا۔ خاص کر کونوں میں کھڑے قدِ آدم جاپانی گلدان جن پر بنے خوش رنگ نقش و نگار، چرند پرند اور مناظر کی دلکش تصاویر انسان کو حیرت میں مبتلا کردیتیں۔ پھر لکڑی کی مصنوعات، آبنوسی مجسمے، ہاتھ کی بنی اشیاء، ہر سائز کی جاپانی گڑیاں، مختلف طرز کے

فوارے، غرضیکہ مکان کیا تھا حیرت کدہ تھا۔ ملنے جلنے والے اُسے ”کرسٹل ہاؤس“ کے نام سے پکارتے تھے۔

مسز شمسی کی باتیں سن کر اکثر سننے والوں کا دل چاہتا کہ وہ بھی اُس ”حیرت کدہ“ کو اندر سے دیکھ پاتے۔ لیکن چونکہ اُن لوگوں کو تو اُس گھر میں ہونے والی پارٹیوں میں کبھی ایک بار بھی مدعو نہیں کیا گیا تھا۔ لہٰذا اُن کی عزتِ نفس اجازت نہ دیتی تھی کہ بن بلائے اور بلا تعارف محض گھر دیکھنے پہنچ جاتے۔ اِس لیے مسز شمسی سے سنی ہوئی باتوں سے ہی تجسس کی تشفی کر لیتے..... لیکن ایک دن ایسا ہوتا ہے جب بلا مدعو کیے کسی کے گھر بھی جایا جا سکتا ہے اور کرسٹل ہاؤس میں بھی وہ دن آگیا۔

موسمِ بہار کا آغاز تھا۔ کچھ دن سے اُس کوٹھی کا مالی بڑی مستعدی سے اندر باہر موسمِ بہار کے پھولوں کی ننھی ننھی پنیریاں تازہ تیار کی ہوئی کیاریوں میں بوتا نظر آرہا تھا۔ اچانک صبح صبح اُس لین کی تمام کوٹھیوں میں یہ خبر پھیل گئی کہ کرسٹل ہاؤس کے صاحبِ خانہ کا اچانک رات کو دِل کا دورہ پڑنے سے انتقال ہوگیا ہے..... اُن کے بیٹوں کی امریکا سے

تقریباً ایک ہفتے کے بعد اِس لین کی کوٹھیوں میں سب کو معلوم ہو چکا تھا کہ کرسٹل ہاؤس بکنے والا ہے

آمد کا انتظار کیا جائے گا۔ تدفین دو روز بعد اتوار کو ہوگی۔

اُس دن کرسٹل ہاؤس کے باہر لین سے لے کر ڈبل روڈ تک اَن گنت گاڑیاں تھیں۔ چند رشتے داروں نے فوری طور پر انتظام سنبھال لیا۔ اِس لیے شامیانے، کرسیاں، چادریں و دیگر انتظام کرلیا گیا۔ سہ پہر تک اُن کی بیٹی بھی دبئی سے آگئی۔ آج اُس گھر میں وہاں کی پارٹیوں میں مدعو ہونے والے لوگوں کے علاوہ آس پاس کی کوٹھیوں میں رہنے والے ہمسائے بھی آنے والوں میں شامل تھے۔

گھر کی مالکن سادہ سے سلیٹی لباس میں سیاہ چادر سر کے

اوپر اوڑھے لاؤنج میں ایک کرسی پر سر یہوڑائے خاموش بیٹھی تھیں، کچھ ایسے جیسے بیمار پرندہ گردن گرا دیتا ہے۔ ملنے والیاں اور رشتے دار خواتین آتیں اور قریب آ کر گلے لگتیں۔ آہ و زاری اور رونے کی کچھ آوازیں بلند ہوتیں۔ پھر آنے والی کوئی نہ کوئی جگہ دیکھ کر بیٹھ جاتی اور خاموشی چھا جاتی۔ یہ سوال ہر آنے والے کے ذہن میں تھا کہ یہ خاتون اتنے بڑے مکان میں اپنے شوہر کے ہمراہ رہتی تھی۔ کوئی تیسرا نہ تھا ..... اب یہ کیا کرے گی؟

کچھ پہلی بار آنے والوں کی نظریں گھر میں اِدھر اُدھر گھوم رہی تھیں..... لیکن گھر اپنی آرائش کی پہلی والی صورت میں تھا ہی نہیں۔ مجسموں اور بڑی بڑی سجاوٹی اشیاء کو ایک جگہ اکٹھا کر کے اُن پر سفید چادریں ڈال دی گئی تھیں۔ فرنیچر گھسیٹ کر

عورتیں کرید کرید کر گھر کی مالکن کے دل کے اندر کا حال پوچھتی تھیں یا دوسرے الفاظ میں یہ جاننا چاہتی تھیں

دیواروں کے ساتھ لگا دیا گیا تھا تاکہ آنے والوں کے لیے جگہ بنائی جا سکے۔ لاؤنج کے وسط میں نصب فوارا بھی بند تھا۔ اُس میں کہنی کے بل نیم دراز مجسمے پر کسی نے سفید چادر ڈال رکھی تھی۔ البتہ شوکیسوں میں سجی کرسٹل کی اشیاء بدستور جگمگا رہی تھیں۔ لیکن یہ موقع نہ تھا کہ نظروں سے بھی تحیر اور ستائش کا اظہار کیا جا سکتا۔ اس لیے جنھیں تجسس تھا، وہ خاموشی سے اور چپکے چپکے چور نظروں سے جائزہ لے رہی تھیں۔ پورے ماحول میں اُس گردن گرائے پرندہ نما عورت کی دل گرفتگی کا سایہ پڑا ہوا تھا جیسے ہر شے اُس کے لیے معنویت کھو بیٹھی ہو۔ کبھی کبھی وہ سر اٹھا کر اچانک سامنے خلا میں دیکھتی جیسے کسی نظر نہ آنے والی شے سے معصوم حیرت کے ساتھ پوچھ رہی ہو.....

''میرے ساتھ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

تقریباً ایک ہفتے کے بعد اس لین کی کوٹھیوں میں سب کو معلوم ہو چکا تھا کہ کرسٹل ہاؤس بکنے والا ہے۔ اُن کے بچے پاکستان میں دو ہفتے سے زیادہ نہ رک سکتے تھے۔ انھیں فوری طور پر اپنے اپنے کام پر واپس پہنچنا تھا۔ لہٰذا تمام فیصلے بڑی سی تیزی سے کرنے پڑے۔ کرسٹل ہاؤس کی مالکن کو اُن کے بیٹوں کے ہمراہ اُمریکا جانا تھا جہاں اُنھیں اپنے بڑے بیٹے کے ساتھ رہائش اختیار کرنی تھی جو شادی شدہ تھا۔ چھوٹا بیٹا ہنوز کسی یونیورسٹی میں پڑھ رہا تھا اور کیمپس میں رہائش پذیر تھا۔

ہر سننے والے کے ذہن میں ایک ہی سوال اُبھر رہا تھا کہ یا اللہ! اتنے ساز و سامان کا کیا ہو گا۔ مسز شمسی روزانہ اُس گھر میں آنا جانا کر رہی تھیں۔ اُنھوں نے بتایا کہ وہ خاتون تو بہت کچھ اپنے ساتھ لے جانا چاہتی تھیں۔ ڈبے بنا کر بحری جہاز کے ذریعے بھیجنا چاہتی تھیں۔ لیکن بیٹے نے سختی سے منع کر دیا کہ وہاں رہائشی مکان چھوٹے ہیں۔ اُس کی امریکن بیوی اتنا سامان پسند نہیں کرے گی۔ یہی کیا کم تھا کہ وہ اچھی فطرت کی مالک تھی اور اپنے شوہر کی ماں کو تنہا چھوڑنے پر اُس کا دل نہیں مانا تھا اور وہ ساتھ رکھنے پر بخوشی تیار ہو گئی تھی..... پھر بھی کچھ یادگار چھوٹی چھوٹی چیزیں اُنھوں نے صندوقوں میں گھسائی تھیں اور ایک آدھا چھوٹا سا ڈبا بھی بنا لیا تھا اور بس.....

عورتیں کرید کرید کر گھر کی مالکن کے دل کے اندر کا حال پوچھتی تھیں یا دوسرے الفاظ میں یہ جاننا چاہتی تھیں کہ آخر اتنے بے پناہ چاؤ اور لگن سے دنیا بھر سے اکٹھی کی ہوئی اشیاء سے جدائی کو آخر وہ خاتون کس طرح لے رہی ہیں۔ وہ اپنے تجسس کی تشفی چاہتی تھیں..... بے رحمانہ تشفی جو کہ مسز شمسی نے نہایت تسلی بخش انداز میں کر دی..... ہاں وہ اپنی کسی چیز سے جدا نہیں ہونا چاہتی تھیں۔ حتیٰ کہ اُس کا کوئی ایش ٹرے بھی ایسا نہ تھا کہ جس سے اُسے لگاؤ نہ تھا اور جسے وہ بخوشی چھوڑ دیتی۔ وہ تو ہر چیز ساتھ لے جانا چاہتی تھی۔ اِس پر خاصی بحث ہوئی

تھی۔ بچوں کو اُسے بہت سمجھانا بجھانا پڑا تھا..... لوگ تو ایک موت مرتے ہیں لیکن وہ عورت تو کئی کئی موتیں مر رہی تھی..... ہر شے سے تو اُسے پیار تھا..... ہائے ہائے!

کرسٹل ہاؤس کی تمام نادر اور بیش قیمت اشیاء کو نیچے لاؤنج اور ڈرائنگ روم میں رکھ دیا گیا۔ اُن پر قیمتوں کی پرچیاں لگا دی گئیں۔ خود مسز شمسی نے کچھ پینٹنگز، کینڈل اسٹینڈ اور کرسٹل کے گلدان خریدے جو تقریباً ایک تہائی قیمت پر بکے تھے۔ پھر انھوں نے فون کر کر کے دوسری کوٹھیوں کی خواتین کو بھی اکسایا کہ وہ اگر کچھ لینا چاہتی ہیں، تو آدھی یا ایک تہائی قیمت پر بہت کچھ مل رہا ہے۔ البتہ چند نادر اور قیمتی اشیاء اُن کی بیٹی نے چھانٹ کر اپنے ساتھ دبئی لے جانے کے لیے الگ کر لی تھیں۔ اُنھیں بڑے بڑے ڈبوں میں پیک کیا جا رہا تھا۔

مسز شمسی کے کہنے پر دوسری خواتین نے بھی ہمت کی۔ کوٹھی کے لاؤنج میں ایک سرخ چہرے والا صحت مند ٹھیکے دار نما شخص اُن اشیاء کو دکھانے اور بیچنے کا کام کر رہا تھا۔ چیزوں میں زیادہ قیمتی اور غیر معمولی اشیاء تو اُن کی پارٹیوں میں مدعو ہونے والے متمول دوستوں نے ہی خرید لی تھیں۔ آس پاس کی خواتین بھی اب گلدان، ایش ٹرے اور لیمپ وغیرہ جیسی چیزیں اٹھائے کوٹھی کے گیٹ سے نکلتی نظر آتی تھیں۔

پھر بے شمار برینڈڈ امپورٹڈ کراکری تھی جس کا کسی بڑی کراکری کی دکان والے نے اکٹھا سودا کر لیا تھا۔ تمام فرنیچر ایک استعمال شدہ فرنیچر بیچنے والے شوروم کے مالک نے اٹھوا لیا تھا۔ گھر والے چونکہ رات کی کسی پرواز سے گئے تھے، لہٰذا کسی نے اُنھیں جاتے ہوئے نہیں دیکھا۔ چند روز بعد کوٹھی پر رنگ پالش کرنے والے کام کرتے دکھائی دے رہے تھے جن کی نگرانی سرخ چہرے والے ٹھیکے دار قسم کا آدمی کر رہا تھا۔ اور کوئی دن گزرے تھے کہ کرسٹل ہاؤس کے سامنے برائے فروخت کی تختی لٹک رہی تھی..... یہ تھی کرسٹل ہاؤس کی کہانی۔

غم

بیوی کے انتقال کے بعد بشارت بہت دن کھوئے کھوئے سے، گم صم رہے۔ جیسے انہوں نے کچھ گم نہ کیا ہو، خود گم ہو گئے ہوں۔ جوان بیٹوں نے میت لحد میں اتاری، اس وقت بھی وہ صبر و ضبط کی تصویر بنے، تازہ کھدی ہوئی مٹی کے ڈھیر پر خاموش کھڑے دیکھا کیے۔ ابھی ان کے بٹوے میں مرحومہ کے ہاتھ کی رکھی ہوئے الائچیاں باقی تھیں۔ اور ڈیپ فریزر میں اس کے ہاتھ کے پکائے ہوئے کھانوں کی تہیں لگی تھیں۔ کروشیے کی جو ٹوپی وہ اس وقت پہنے ہوئے تھے وہ اس جنتی بی بی نے چاند رات کو دو بجے مکمل کی تھی تاکہ وہ صبح اسے پہن کر عید کی نماز پڑھ سکیں۔ سب مٹھی بھر بھر کے مٹی ڈال چکے اور قبر گلاب کے پھولوں سے ڈھک گئی تو انہوں نے مرحومہ کے ہاتھ کے لگائے ہوئے موتیا کی چند کلیاں جن کے کھلنے میں ابھی ایک پہر باقی تھا، کرتے کی جیب سے نکال کر انگارہ پھولوں پر بکھیر دیں۔ پھر خالی خالی نظروں سے اپنا مٹی میں سنا ہوا ہاتھ دیکھنے لگے۔ اچانک ایک ایسا سانحہ ہو جائے تو کچھ عرصے تک تو یقین ہی نہیں آتا کہ زندگی بھر کا ساتھی یوں آناً فاناً بچھڑ سکتا ہے۔ نہیں۔ اگر وہ سب کچھ خواب تھا تو پھر یہ بھی خواب ہی ہو گا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ ابھی یہیں کسی دروازے سے مسکراتی ہوئی آ نکلے گی۔ رات کے سناٹے میں کبھی کبھی تو قدموں کی مانوس آہٹ اور چوڑیوں کی کھنک تک صاف سنائی دیتی۔ اور وہ چونک پڑتے کہ کہیں آنکھ تو نہیں جھپک گئی تھی۔ کسی نے ان کی آنکھیں نم نہیں دیکھیں۔ اپنوں بیگانوں سبھی نے ان کے صبر و استقامت کی داد دی۔ پھر اچانک ایک واشگاف لمحہ آیا کہ یکلخت یقین آ گیا۔ پھر سارے پندار ٹوٹے اور سارے آنسو بند اور تمام صبر فصیلیں ایک ساتھ ڈھے گئیں۔ وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روئے۔

(مشتاق یوسفی کی کتاب آبِ گم سے اقتباس)

امجد اسلام امجد

علم کا سفر

ایک منفرد کتاب کا خیال افروز اور خوبصورت تعارف

"علم کا سفر" نامی کتاب کہنے کو تو ایک انجینئر اور ٹاؤن پلانر کی داستانِ حیات ہے جسے صنفی اعتبار سے خودنوشت سوانح عمری کہا جاتا ہے لیکن اِس میں جو روانی، دلچسپی، اثرانگیزی اور تجزیاتی صلاحیت صفحہ صفحہ اور سطر در سطر اپنا اظہار کرتی نظر آتی ہے، اُس نے اِس کتاب کو علم سے زیادہ عالم کے سفر کی رُوداد بنا دیا ہے۔

ڈاکٹر انیس الرحمٰن نے اپنی زندگی کے پہلے سترہ برس برٹش انڈیا کے مختلف علاقوں میں گزارے کہ اُس وقت تک نہ تو آزادی کا بگل بجا تھا اور نہ ہی تقسیم کا آوازہ بلند ہوا تھا، سو کتاب کے پہلے حصے میں اُن سے زیادہ، اُن کے بزرگوں کا تذکرہ ہے جس سے اُن کی خاکہ نگاری کی صلاحیت بہت کھل کر سامنے آتی ہے اور آگے چل کر جب وہ تعلیم، معاش اور حصولِ علم کے سلسلے میں پوری دنیا میں گھومتے پھرتے نظر آتے ہیں، تو وہاں بھی اُن کا یہ جوہر اپنی جھلک دکھاتا رہتا ہے کہ وہ باتوں باتوں میں چند جملوں کے اندر اُن کرداروں کو نمایاں کر کے آگے بڑھتے جاتے ہیں جو کسی بھی حوالے سے اُن کی اِس داستانِ حیات کا حصہ بنتے ہیں۔

اُن کی نثر بہت رواں دواں ہونے کے ساتھ ساتھ واقعہ نگاری کا فریضہ بھی بہت خوبصورتی سے انجام دیتی نظر آتی ہے اور چھوٹی چھوٹی بظاہر عام سی باتوں میں ہم نوجوان انیس الرحمٰن کے اُس کردار کے پہلوؤں کو بنتا اور مضبوط ہوتا دیکھتے ہیں جس کا عملی اظہار اُن کی ۹۲ برس کی زندگی کو اَپنے حصار میں لیے ہوئے ہے۔

خاندان کی پاکستان منتقلی کے بعد وہ وسائل کی کمی کے باعث اپنے علم کے سفر کو جاری رکھنے کے لیے مختلف طرح کے امتحانات سے گزرے۔ ایک طرف ملک کی افسرشاہی اور مقتدر اَفراد تھے جن میں سے چند ایک کے علاوہ سب نے اُن کے راستے میں روڑے اٹکائے اور دیواریں اٹھانے کا کام بڑی دل جمعی سے کیا، لیکن اپنی ذات پر اعتماد اَور اللہ کی رحمت پر اُن کے بھروسے کے سامنے یہ سب رکاوٹیں ایک ایک کر کے ہٹتی چلی گئیں۔

وہ انجینئر سے ٹاؤن پلانر کیسے بنے اور پھر اِسی شعبے میں ...ڑے رہنے کی وجہ سے اُنھیں کن کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، اِس کتاب میں اُن سب کا حال بہت اختصار آمیز سلیقے سے کیا گیا ہے، لیکن اِس بیان کی سب سے عمدہ اَور خوبصورت بات یہی ہے کہ اُنھوں نے اپنی عزتِ نفس کی حفاظت کے لیے تو کبھی ظلم کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالے مگر نیلسن منڈیلا کی طرح ہر آزاد بندے کو خوش دلی سے معاف کر دیا۔

دوسری اہم بات جو اِس کتاب سے ہمارے آپ کے علم میں اضافہ کرنے والی ہے، وہ یہ ہے کہ معاشی اور مجلسی طور پر ہر طرح کی سہولت اور فراوانی کے حصول کے بعد بھی اُنھوں نے اپنے اندر موجود دَرویش کو اُس کی رو میں بہنے نہیں دیا۔ حصولِ تعلیم کے زمانے میں اُنھیں کس کس طرح کی تنگ دستی، مفلسی اور اِمتحان کا سامنا کرنا پڑا، اِس کا احوال بھی اُنھوں نے بہت کھل کر اور بڑے مزے لے لے کر بیان کیا ہے۔ اپنی پی ایچ ڈی کی تکمیل کے لیے اُنھیں امریکا کی انتہائی ...برفیلی راتوں میں لڑکیوں کے ہاسٹل کی چوکیداری بھی کرنا پڑی۔ امریکا جانے کے لیے پانچ ہزار میں اپنی کار بیچنے ...مسلم ٹاؤن، لاہور میں اپنا ذاتی مکان بنانے کے سلسلے میں ...مقروض ہونے کے مسائل سے گزرنا پڑا۔ یہ اور اِس طرح کے اور بہت سے واقعات انسانی عزم، حوصلے، دریادلی اور کردار کی مضبوطی نے کتاب کے درمیان اور آخر میں کئی ایسے کرداروں کا ذکر کیا ہے جو کسی نہ کسی وجہ سے معروف اور مشہور ...مگر ایک داستانوی نما کردار سلطانہ ڈاکو کے بارے میں اُن کی تحریر بلاشبہ معلومات اور دلچسپی کا ایک چونکا دینے والا مجموعہ ہے۔

ہمارے بچپن میں بہرام ڈاکو اور سلطانہ ڈاکو کا ذکر اکثر سننے میں آتا تھا جس کا ماحصل یہ تھا کہ یہ ڈاکو امیروں کو لُوٹتے اور غریبوں کی مدد کرتے تھے اور یہ کہ اِن کی شخصیات پر ایک نامعلوم سا پردہ بھی لٹکتا رہتا تھا جس کی وجہ سے اُن کی اصلیت کا ٹھیک طرح سے پتا نہیں چلتا مگر ڈاکٹر انیس الرحمٰن کی اِس کتاب سے ہمیں پتا چلتا ہے کہ سلطانہ ڈاکو نہ صرف اُن کے ایک بزرگ سے ملا بلکہ اُس کی گرفتاری کے لیے انگلستان سے فریڈرک ینگ نامی افسر کو بلایا گیا تھا، اُس نے اُسے پکڑنے اور موت کی سزا سنوانے کے بعد اُسی کے سات برس کے بیٹے کو پالا پوسا، اُسے اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان بھجوایا اور وُہ وَاپس آکر برٹش انڈیا میں آئی جی پولیس کے عہدے پر فائز ہوا۔

جہاں تک اُن کی تحریر کی روانی ونگاہ کی تیزی اور بصیرت کا تعلق ہے، اُسے سمجھنے کے لیے اِن چند سطروں کا مطالعہ ایک مثال اور سند کا کام کرے گا۔

"انسانی زندگی اور دَریا کے دورانیے میں ایک اور مماثلت یہ ہے کہ دونوں صرف آگے کی طرف بڑھتے ہیں، پیچھے کبھی نہیں لَوٹتے۔ اِن کی رفتار تیز یا دھیمی تو ہو جاتی ہے لیکن ساکت کبھی نہیں ہوتی۔ جب تک وہ کسی جھیل یا سمندر کی نذر ہو جائیں یا اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملیں۔ جس طرح دریا زمین پر بہتے ہیں، لیکن کبھی کبھی نظروں سے اوجھل ہو کر زیرِ زمین بلوچستان کی کاریز کی صورت بھی بہتے ہیں۔ اِسی طرح انسان بھی شہادت کے بعد نظروں سے اوجھل ہو کر جیتے ہیں۔ جس طرح دریا کا وجود پیاسی زمین سیراب کرنے آیا ہے، اُسی طرح اللہ نے دردِ دِل کے واسطے پیدا کیا انسان کو، ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کروبیاں۔ اور بقول ابراہیم ادھمؒ مَیں اُس کا بندہ بنوں گا جسے اللہ کے بندوں سے پیار ہو گا۔"

یہ کتاب "اردو ڈائجسٹ" میں قسط وار چھپ کر مقبولیت کی بہت سی منزلیں طے کر چکی ہے اور یہ بات بڑے اعتماد سے کہی جا سکتی ہے کہ اِس کی موجودہ صورت بھی پسندیدہ اَور مقبول ہوگی۔ (بشکریہ: روزنامہ ایکسپریس)

ذرا چشمِ تصور کیجیے!

چلتے ہیں صدیوں قبل کے ایک بلوچ قصبے خضدار کی طرف، جہاں ایک محل نما حویلی کے پھاٹک کا دروازہ ہمیشہ کی طرح آج بھی بند تھا۔ اندر وسیع وعریض صحن کے بیچ میں رکھی ہوئی ایک چارپائی جس پر سفید چادر سے ڈھکا ہوا ایک بے جان جسم لیٹا ہوا ہے۔ چاروں طرف سے لوگ گھیرے ہوئے ہیں۔ ایسے سانحے تو خاندانوں میں اکثر رونما ہوتے رہتے ہیں مگر آج یہ محض ایک حادثہ نہ تھا۔ ہاتھ کی کلائیوں سے رِستا ہوا خون ایک نئی تاریخ رقم کر چکا تھا۔

اِس فانی دنیا میں فارسی شاعری کی خاتونِ اوّل رابعہ خضداری کے یہ آخری لمحات تھے، تاہم فارسی شاعری کو اپنی پہچان کا یہ پہلا لمحہ مل چکا تھا۔ شجر سے ایک پھل کیا ٹوٹا باقی سارے شجر بارآور ہوئے اور ایسے ہوئے کہ آج صدیاں گزرنے کے باوجود بھی رابعہ کی شاعرانہ صدا، بازگشت بن کر ہماری سماعتوں سے مسلسل ٹکرا رہی ہے۔ اور یہ وہ صدا ہے جو اپنے مضامین، اپنے اسلوب اور اندازِ شعر گوئی کے لحاظ سے صاف صاف بتاتی ہے کہ جب اپنی ذات کے راستے کو ختم کیا جاتا ہے، تو پھر ایک ہی راستہ سجھائی دیتا ہے اور وہ ہے عشق کا راستہ۔

باز عشقت اندر آوردم بہ بند
کوشش بسیار نامد سود مند
عشق دریائی کرانہ ناپدید
کی توان کردن شنا ای ہوش مند
عشق را خواہی کہ تا پایان بری
بس کہ بپسندید باید ناپسند
زشت باید دید وانگارید خوب

زہر باید خورد و پندارید قند
توسنی کہ دم ندانستہ ہمی

ترجمہ: "اُس کے عشق نے دوبارہ مجھے قید میں ڈال دیا، (آزاد ہونے کی) بہت زیادہ کوشش کا بھی کوئی فائدہ نہ ہوا۔ عشق ایسا سمندر ہے جس کا کوئی ساحل نہیں۔ اے شخص! تو جو دنیاداری سے آشنا ہے، کیونکر اِس میں تیر سکے گا۔ اگر تم چاہتے ہو کہ عشق تمہیں اپنی انتہا تک لے جائے، تو ہر پسندیدہ شے کو ناپسند کرنے لگو۔ تم بدصورتی کو دیکھو اور سمجھو کہ یہ حُسن ہے۔ تم زہر کھاؤ اور سمجھو کہ تم نے شکر کھائی ہے۔ مَیں (عشق کی) اُس سرکش گھوڑے کی طرح کھینچتی رہی۔ مَیں نہیں جانتی تھی کہ کھینچنے سے پھندا اور بھی تنگ ہو جاتا ہے۔"

یہ اُس شہزادی کی آواز ہے جو بے چین تھی، بے خبر اور ہجوم میں تنہا تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ اُس کی اور ہم سب کی آواز ہے۔ ہمارے اور اُس کے درمیان اتنا ہی فاصلہ ہے جتنا صبح و شام کے بیچ ہوتا ہے۔ ہمارا اور اُس کا وہی رشتہ ہے، جو سوچ کا آواز سے ہوتا ہے۔ سوچ کی سرحدیں نہیں ہوتیں۔ آواز دور میں گرفتار رہتی ہے۔ آواز سوچ کے ساتھ چلے، کبھی ایسا ہوتا ہے، کبھی نہیں ہوتا۔ کبھی یہ آواز ہمارے پاس ہوتی ہے اور کبھی لگتا ہے کہ یہ آواز صدیوں کے فاصلے پر آگے بڑھ چکی۔ لیکن پھر بھی اُس آواز نے ہمارا ساتھ نہیں چھوڑا، کیونکہ یہ آواز عاشقانہ شاعری ہے، جو روح سے پھوٹ کر نکلتی اور پھر ہر جگہ موجود حساس لوگوں کے دلوں کے صحن میں اتر جاتی ہے۔

فشاند از سوسن و گل سیم و زر باد
زہی بادی کہ رحمت باد بر باد
بداداش نقشِ آزر صد نشانِ آب
نمود از سحر مانی صد اثر باد
مثالِ چشم آدم شد مگر ابر
دلیلِ لطفِ عیسیٰ شد مگر باد
کہ در بارید ہر دم قرِ چمن ابر
کہ جان افزود خوش خوش در شجر باد
اگر دیوانہ ابر آمد چرا پس
کند عرضہ صبوحی جام زر باد
گل خوشبوی ترسم آورد رنگ
از این غماز صبح پردہ در باد
برای چشم ہر نا اہلِ گوئی
عروسِ باغ را شد جلوہ گر باد
عجب چون صبح خوشتری برد خواب
چرا افگند دل را در سحر باد

ترجمہ "سوسن و گل سے لے کر ہوا ہر طرف سونا اور چاندی نچھاور کر رہی ہے۔ یہ ہوا قابلِ صد تعریف ہے کہ اِس ہوا پر رحمت پُرافشاں ہے۔ پانی نے آزر کے بنائے ہوئے بت سے سینکڑوں نقوش حاصل کیے ہیں اور مصور مانی کے جادو سے ہوا نے سینکڑوں اثرات حاصل کیے ہیں۔ (پانی آزر اور ہوا مانی جیسا کام کرنے لگی ہے۔) بادل انسان کی آنکھ کی مانند بن گیا ہے اور ہوا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مہر و محبت کا ثبوت بن گئی ہے کہ باغ میں بادل ہر لمحے موتی برساتا رہتا ہے اور ہوا بڑی مسرت سے درختوں میں جان ڈالتی رہتی ہے۔

"اگر بادل دیوانہ بن کر آیا، تو پھر کس کے لیے ہوا سونے کے پیالے میں شراب پیش کر رہی ہے۔ میرے خوف کے پھول کی خوشبو رنگ لائی ہے۔ اِس راز کو پا کر ہی ہوا نے صبح کا پردہ چاک کر دیا ہے۔ گویا ہوا نے باغ کی دلہن کا گھونگھٹ ہٹا دیا ہے اور اُس کا جلوہ دِکھا دیا ہے۔ اِس میں تعجب کی کیا بات ہے کہ صبح کے وقت زیادہ اچھے خواب نظر آتے ہیں۔ ہوا بھی وقتِ سحر درختوں سے پھول توڑ کر زمین پر برساتی ہے۔"

حقیقت میں یہ اشعار سونے اور چاندی کی وہ سطریں ہیں جو صرف رابعہ ہی لکھ سکتی ہیں۔ یہ اُن ہی کا حصہ ہے۔ اُس

نے ہماری اونچی اور گہری فکری فارسی شاعری کو پہلی مرتبہ وہ لہجہ دیا جس میں ایک ذہین اور حساس عورت کا دل دھڑکتا سنائی دیتا ہے۔ اِس لہجے نے عورت کا نازک و نفیس لباس پہن رکھا ہے جس کے تن بدن سے عورت کے جسم و رُوح کی خوشبو آتی ہے۔ شاعر صرف حُسن دیکھتا ہی نہیں، حُسن تخلیق بھی کرتا ہے۔ جہاں تک مَیں سمجھ سکا ہوں، رابعہ خضداری کا آدرش حُسن کی تلاش ہے اور اُنھیں یہ نکتہ خوب معلوم ہے کہ حُسن کا دوسرا نام اللہ ہے۔

دسویں صدی عیسوی میں فارسی زبان کا ایک معیاری لہجہ متعین ہو چکا تھا۔ زندگی کے بے شمار رُوپ اور تجربے فارسی شاعری کا موضوع بن رہے تھے مگر جس وقت رابعہ نے لکھنا شروع کیا، تو یہ اسلوب سورج کی طرح افق پر تنہا طلوع ہوا۔ یہ دھیما دھیما سا، سرگوشیاں کرتا، گیلی لکڑی کی طرح سلگتا ہوا ایک عجیب چاکِ گریباں سا لہجہ ہے جس میں سمائے ہوئے سارے الفاظ ہمیں کسی اور ہی دنیا میں لے جاتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ رابعہ کی شاعری اپنے اصل قد سے زیادہ قدآور معلوم ہوتی ہے۔

میرے نزدیک اِس لہجے کی سب سے دل آویز خصوصیت اِس کی وہ رُوحانی سطح ہے جس کے لمس سے خیال اور جذبے کے ساتھ ہمارے دل و ذہن کے در و دیوار بھی چمک اٹھتے ہیں۔ ساتھ ہی رابعہ کے اس لہجے میں ایسا تیقن اور اُن کی آواز میں ایسی تمکنت ہے جو شاعر کو جُہدِ اظہار میں اپنا مقام حاصل ہونے کے بعد ہی نصیب ہوتی ہے۔ چنانچہ رابعہ نے درد کا جو شہر تخلیق کیا ہے، اُس شہر کی دیواریں اُن کی ذات تک محدود نہیں، بلکہ عالمگیر ہیں اور اُس درد میں حزن و یاس کا عنصر بے حد نمایاں ہے۔ یہی درد دراصل رابعہ کی شاعری کا سب سے طاقتور محرک ہے اور یہی درد ہے جس سے عاشقانہ شاعری کا سورج طلوع ہوتا ہے۔

عاشقانہ شاعری کو آپ درد و اَلم کے خیالات سے الگ نہیں رکھ سکتے۔ عشق کا خاصہ جذبِ غم ہے۔ جس سے محبت کی جاتی ہے، اُس کے لیے غم سہے جاتے ہیں کہ بغیر اس کے اخلاص مشتبہ رہے گا۔ عشق بغیر غم کے عنصر کے تکمیل پذیر نہیں ہو سکتا۔ بغیر ادراکِ غم خود اِنسانی شخصیت کے جوہر نکھرتے ہیں، لہٰذا ہر زبان کی شاعری میں درد کا مرتبہ آپ بلند پائیں گے، کیونکہ غم زندگی میں ایک اساسی شے ہے۔ اور یہ اساسی شے رابعہ کے اشعار میں بھرپور اَنداز میں موجود ہے اور اس کی اثر پذیری کی کوئی حد نہیں۔

رابعہ خضداری کے ہم عصر یا اُس کے پیش رو فارسی شعرا نے اپنے کلام میں درد و اَلم اور ناکامی و مایوسی کی جھلکیاں دکھائیں اور اِس سلیقے سے کہ اُن کی نظیر آج تک پیدا نہ ہوئی۔ لیکن رابعہ کے سوز و گداز میں ایک انفرادی رنگ ہے جس کی تاثیر بے پناہ ہے۔ اُس نے درد کے مضمون کو ایسا اپنایا کہ گویا وہ اُس کا ہو گیا۔ رابعہ کا درد محض ایک انفرادی تجربے کا بیان ہی نہیں، بلکہ اُس کے ہاں درد ایک جمالیاتی قدر کا مرتبہ رکھتا ہے۔ اُس کا سارا نظامِ تصورات درد کے محور پر قائم ہے اور اس درد میں ایک فلسفیانہ رنگ موجود ہے۔

خبر دہند بارید بر سر ایوبؑ
ز آسمان ملخاں و سر ہمہ زریں
اگر ببارد زریں ملخ برادز صبر
سزد کہ بارد بر من یکی مگس روئیں

ترجمہ: ''کہتے ہیں کہ حضرت ایوبؑ کے سر پر آسمان سے ٹڈیوں کی ایسی بارش ہوئی کہ اُن کا تمام سر سنہرا ہو گیا۔ اگر صبر کے باعث اُن پر آسمان سے سنہری ٹڈیوں کی برسات ہوئی تھی، تو پھر یہ مناسب ہو گا کہ مجھ پر ایک سیسے کی ٹڈی برس جائے (یعنی میرے عشق کی شدت صبر سے ناآشنا ہے)''

سچ تو یہ ہے کہ اس شعر کی بلاغت اور گہرائی بیان نہیں کی جا سکتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعرہ نے اپنے قلم کی ایک خفیف سی جنبش سے جہانِ معنی پیدا کر دیا ہے۔ جو مطلب اِس شعر میں بیان کیا گیا ہے، اُس کا اثر رابعہ کی فکر کے اعلیٰ ترین معراج کو ظاہر کرتا ہے۔

رابعہ خضداری کی عشقیہ شاعری کا رجحان مجاز ہے، لیکن انسانی ذہن و وجدان کی ساخت کچھ ایسی ہے کہ مجاز و حقیقت کو ایک دوسرے سے بالکل جدا کرنا دشوار ہے۔ اہلِ نظر کو مجاز میں حقیقت کا پرتو نظر آتا ہے۔ معرفتِ الٰہی بغیر معرفتِ نفس اور معرفتِ کائنات کے ممکن نہیں۔ ہنگامۂ ہستی کی کرشمہ سازیوں میں اور پری چہروں کے غمز و عشوہ و ادا اور اُن کی شکنِ زلفِ عنبرین اور نگہ سرما سا میں اربابِ عرفان کے لیے تجلیاتِ الٰہی کی جلوہ فرمائیاں موجود ہیں، لہٰذا رابعہ خضداری کی شاعری میں مجاز اور حقیقت دونوں کو کمال خوبی سے سمویا گیا ہے۔ رابعہ کی شخصیت کی طرح اُس کے کلام میں بڑی وسعت ہے۔ اُس کی چشم نے حیات اور کائنات کو ہر ممکن نقطۂ نظر سے دیکھا اور اُن کی اس طرح ترجمانی کی کہ اُس میں سب کچھ آ گیا۔ مجاز اور حقیقت بھی، شرحِ درد و اشتیاق بھی اور حُسن کرشمہ ساز کی معجزہ نمائیاں بھی۔

رابعہ خضداری فرماتی ہیں:

''ترجمہ: تیرے ہونٹ شہد ہیں اور رُخسار چاند، تیرا چہرہ لالہ ہے اور زلف سیاہ ہیں۔ آہ! اِن رخساروں سے مجھے خوف آتا ہے۔ یہ بتیس دانے بندھے ہوئے موتی ہیں اور لالہ کے دو پھولوں تلے ایک چتہ ہے۔ آہ! تیرے لالے جیسے رخساروں نے میرا یاقوت جیسا رنگ سوکھی گھاس جیسا بنا دیا ہے۔ میرے اشک اولوں کی طرح ہر صد بدخواہوں کے طعنوں کے باعث برسے ہیں، کیونکہ میرا جرم کوشش سے سوا ہو چکا تھا۔ میری راہ اللہ کی راہ کے سوا کوئی دوسری نہ تھی تاکہ وہ عشق سے میرا پورا وجود ہو بنا دے۔''

مطلب یہ کہ رابعہ کے کلام کا بیشتر حصہ عشقِ حقیقی کی کیفیات پر مشتمل ہے اور کہیں کہیں بڑی دقیقہ رسی سے زندگی کی گتھیوں کو حکیمانہ انداز میں رمز و ایما کی زبان سے بیان کیا ہے۔ اُن کی شاعری کی ایک اہم خصوصیت جو اُسے دوسروں سے ممتاز کرتی ہے، اُس کا طرزِ ادا ہے جسے فارسی شاعری کے لیے سرمایۂ نازش سمجھنا چاہیے۔

رابعہ کے پیش رو اکثر فارسی شعرا ایک ہی ڈگر پر چلتے رہے۔ جو لذت پرستی کی طرف مائل ہوا، تو وہ کائنات میں سوائے اِس کے اور کچھ دیکھتا ہی نہیں۔ جو اندوہ و اَلم سے متاثر ہوا، تو اُسے حسرت و غم کے سوا کچھ نظر نہیں آیا۔ لیکن زندگی تو بڑی وسیع شے ہے۔ وہ مسرت اور غم اور لذت پرستی، سب پر حاوی ہے اور پھر اُن سے بالاتر بھی ہے۔ رابعہ نے اِس نکتے کو پالیا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ اُس کے یہاں تنوع نظر آتا ہے جو اُس کی ہمہ گیر شخصیت کا عکس معلوم ہوتا ہے۔ اُس کے یہاں غم بھی ہے اور جوشِ جذبات بھی اور حکیمانہ نکتہ رسی بھی۔ تخیل کے نقش و نگار بھی ہیں اور حقائق و محسوسات کی ترجمانی بھی۔ پورا کلام ایسی دل آویز موسیقی میں رچا ہوا ہے کہ فردوسِ گوش کہنا مبالغہ نہ ہو گا۔

ممتاز فلسفی والٹیئر کے آخری دو الفاظ کتابوں میں محفوظ ہیں۔ یہ اُس نے اپنے قریبی دوست بنجمن فرینکلن کے بیٹے سے کہے تھے۔ میرے نزدیک یہ دو لفظ رابعہ خضداری کی شاعری کا محور ہیں اور یہ دو لفظ ہیں:

''خدا اور محبت۔''

جیسے کو تیسا

استاد (شاگرد سے): ''ایسے مضمون لکھا جاتا ہے، میرا تو دل چاہتا ہے کہ یہ مضمون مَیں تمہارے باپ کو بھیج دوں۔''
شاگرد: ''نہیں جناب! اُنھیں بھیجنے کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ مضمون اُنھوں نے ہی لکھا ہے۔''

معاشرتی کہانی

سالمہ محبوب

جہالت کا عذاب

ایک شخص کی دردناک کتھا،
وہ کئی عشرے آگاہی کی کمی
سے آگ میں جلتا رہا

گوگی کا اصل نام تو فاطمہ کریم تھا۔ ماں باپ نے یقیناً اپنی پہلی اولاد کا نام تو بڑے شوق، محبت اور اُلفت سے رکھا ہو گا مگر سب لوگ اُسے گوگی ہی بلاتے۔ وہ شاید بچپن میں صحت مند رہی ہوگی جو اُسے یہ نام دیا گیا۔ گوگی نے اپنے پیار کرنے والے والدین کی محبت کا سایہ زندگی کے دس برس ہی دیکھا۔ وہ عید کا دن تھا۔ اُس کی ضد پر ابا اُسے اور اماں کو اپنی موٹر سائیکل پر بٹھا کر شہر کی رونق دکھانے نکلا اور ایک حادثے کا شکار ہو گیا۔

راہ گیروں نے اُنھیں اسپتال پہنچایا مگر ابا اور اَماں دونوں ہی اللہ کے پاس جا چکے تھے۔ گوگی کو بھی چوٹیں آئی تھیں مگر وہ بچ گئی۔ وہ اِس حادثے میں زندہ بچنے والی ایک ہی جان تھی مگر ہر فرد اُسے بدقسمت ہی کہہ رہا تھا کہ دونوں والدین اُسے اِس بچپن میں تنہا چھوڑ گئے۔ اُس کے والدین ہنرمند اور محنتی لوگ تھے۔

باپ ایک بہترین درزی تھا اور ماں بھی زبردست سلائی کرتی تھی۔ دونوں نے مسلسل محنت کر کے اپنا پانچ مرلے کا مکان بنا لیا تھا۔ اب دس سالہ گوگی اُس مکان کی تنہا وارث تھی۔ اُسے اپنے پاس رکھنے کی نانا نانی نے بھی خواہش ظاہر کی مگر دادا جان نے مرحوم بیٹے کی نشانی دور بھیجنے سے انکار کر دیا اور وہ اَپنے دادا دَادی کے ساتھ اپنے ہی گھر میں رہتی رہی۔

گوگی سادہ اور معصوم بچی تھی۔ پڑھائی میں اُس کا دل کچھ خاص نہ لگتا تھا مگر اپنے سکول کی سہیلیوں کے ساتھ وہ بہت خوش رہتی۔ اُس کی حسِ مزاح بہت اچھی تھی۔ سو ہم جماعت لڑکیاں اُس کے ساتھ خوب مزے کرتیں۔ میٹرک میں اُس کی سیکنڈ ڈویژن آئی، تو استانیوں کے مشورے پر اُس نے آرٹس کے مضامین رکھ کر ایف اے کرنے کا ارادہ کر لیا۔ باقی سب مضمون تو اُسے پھر بھی سمجھ آ جاتے مگر انگریزی سے

اپنے خاندانی ہنر کا شوق تو اُس کے خون
اُس کی جان جاتی۔ میں تھا۔ ہر طرح کے کپڑے وہ بہترین سلائی کرتی۔
پڑھائی اُس کا مشغلہ بھی تھا اور سہیلیوں سے ملنے کا بہانہ بھی۔ دادی بھی اپنی پوتی سے بہت پیار کرتی تھیں۔ اُس کی تربیت اُنہی کے تجربے کار ہاتھوں میں ہوئی۔ اُسے قرآن کی تعلیم بھی توجہ سے دلوائی گئی اور زندگی کے اسباق بھی دادی ہی نے سکھائے۔ اُنھوں نے گوگی کو قرآن کی کئی سورتیں اور دُعائیں یاد کرائیں اور نماز کا بھی عادی بنایا۔ والدین اور کسی بہن بھائی کی کمی کو وہ اَللہ سے تعلق کو محسوس کر کے پورا کرتی۔ دادی روزانہ اُس کے ساتھ دعا مانگتیں۔ عربی اور پھر اُن کے اردو ترجمے کے ذریعے اُسے بہت سی دعائیں یاد کروائیں۔

گوگی کے لیے وہ اَپنے بڑے بیٹے اور بہو کی پسندیدگی کو سمجھتی تھیں۔ عثمان اُن کا پوتا ہی تو تھا مگر اُس کی سخت مزاجی اور جھگڑالو طبیعت کی وجہ سے وہ اِس رشتے پر راضی نہیں ہو رہی تھیں۔ دادا جی اور سارا خاندان ہی اِس رشتے کا حامی تھا مگر انھیں گوگی کے لیے عثمان پسند نہ تھا۔

عثمان گوگی کے تایا جی کا بیٹا تھا۔ وہ گوگی سے عمر میں خاصا بڑا تھا۔ مزاج کے چڑچڑے پن اور فسادی طبیعت کی وجہ سے خاندان بھر میں کوئی اُسے بیٹی دینے کو رَاضی نہ تھا۔ تایا جی مسلسل دادا اور دَادی سے اِس رشتے کے لیے اصرار کر رہے تھے۔ عثمان اپنے مرحوم چچا کی دکان میں بھی بیٹھتا تھا۔ گو دکان کا انتظام تایا جی کے ہاتھ میں تھا مگر وہ بہت اچھا کاریگر تھا۔

مردانہ شلوار قمیص سینے میں تو اُسے مہارت تھی ہی مگر اُس کا اصل ہنر ویسٹ کوٹ، پینٹ کوٹ اور شیروانی سینے میں تھا۔ وہ بہت مہارت اور صفائی سے سلائی کرتا اور پھر دام بھی منہ مانگے لیتا۔ شادیوں پر جب سے دولہا نے شیروانی پہننا شروع کی تھی، عثمان کی چاندی ہو گئی تھی۔ وہ بالکل ناپ کے مطابق سوٹ اور شیروانی سیتا جس سے لوگ اُس کے مستقل گاہک بن جاتے۔

گوگی نے ایف اے پاس کیا مگر انگریزی کا کوہِ گراں اُس سے عبور نہ ہو سکا۔ ایک سال اُس نے اپنی سی بہت کوشش کی مگر ناکام ہی رہی۔ اِنہی کوششوں اور ناکامیوں میں دادی اچانک بیمار ہوئیں اور ایک ماہ کے اندر اَندر خالقِ حقیقی سے جا ملیں۔ دادا جی کو اب گوگی کے بیاہ کا فیصلہ کرنا ہی پڑ گیا اور اُنھوں نے تایا جی کو ہاں کر دی۔

تائی جی نے تو جیسے اِسی پل کا انتظار کر رکھا تھا۔ جھٹ پٹ ساری تیاریاں مکمل کر لیں اور مہینے کے بعد ہی شادی رکھ لی گئی۔ یہ شادی بھی عجیب طرح سے ہوئی تھی۔ گوگی بیاہ کر تایا جی کے گھر نہیں گئی بلکہ دولہا صاحب اُس کے گھر آ گئے۔ دادا جی نے شادی سے پہلے مکان میں نیا رنگ روغن کروایا تھا۔ ضروری مرمتیں کرائیں۔ گھر بھر میں نیا فرنیچر بھی ڈلوایا۔ گوگی کے ننھیال والوں نے اُس کے لیے نئی الیکٹرک چیزیں بھی بھیجیں۔ نیا فریج، ٹی وی، پنکھے اور طرح طرح کی چیزیں۔

تائی جی نے بھی بری کے نام پر چند اچھے جوڑے بنائے اور تھوڑا سا زیور بھی ڈالا۔ شادی اور وَلیمے کی ایک ہی تقریب رکھی گئی۔ گوگی کا نکاح عثمان احمد سے کر دیا گیا۔ دادا جی نے نکاح کے وقت پوتی سے رضامندی لی، دستخط کروائے اور گوگی بیاہ کر ایک کمرے سے دوسرے میں بھی نہ گئی بس اپنے ہی کمرے میں مختلف حیثیت سے رہنے لگی۔ دادا جی بھی پہلے کی طرح باہر والی بیٹھک میں مقیم تھے۔

گوگی نے تایا جی کے اِس بیٹے کے قصے تو بہت سنے تھے۔ مگر دادی نے کبھی اُسے اپنے جوان کزنز سے زیادہ گھلنے ملنے نہ دیا تھا۔ سو شوہر کی عادات اور فطرت کا اُسے اب اندازہ ہوا۔ وہ ایک بے حد سنجیدہ مزاج اور جھگڑالو طبیعت کا مالک تھا۔ اُس کی اپنے والدین، بہن بھائیوں اور دُکان کے کسی ملازم سے نہ بنتی تھی۔ وہ منہ زور تھا اور دُرشت مزاج بھی۔ کام

کرنے میں سنجیدہ ہوتا، تو روز کے تین سے چار مردانہ شلوار قمیص سی لیتا۔ کوٹ پینٹ بھی دو سے تین روز میں تیار کرلیتا اور منہ مانگے دام بھی لے لیتا مگر جب مزاج بگڑتا، تو ہفتوں ہفتوں کام کو ہاتھ بھی نہ لگاتا۔ تایا جی اپنے بیٹے سے اچھی طرح واقف تھے۔ جب وہ کام کرتا، تو معقول معاوضہ دیتے اور جب نہ بھی کرتا، تو اُس کے گھر آکر گوگی کو معقول رقم دے جاتے۔

شادی کے شروع کے دنوں میں عثمان کی طبیعت اور مزاج خاصا بہتر رہا۔ اُس کا رویہ دلہن کے ساتھ بھی عمدہ رہا۔ وہ اپنے مزاج کے برخلاف گوگی سے باتیں کرتا، ہنستا مسکراتا بھی۔ گھر میں اُس کا مزاج خوشگوار رہتا۔ دادا جی اور ہر آنے والے کے ساتھ بھی معقول رویہ رہا۔ تایا جی نے اُسے گوگی کو گھمانے پھرانے کے لیے الگ سے پیسے بھی دیے، تو وہ اُسے لے کر مری اور اسلام آباد بھی گیا۔ دونوں مال روڈ پر گھومے پھرے اور چیئرلفٹ میں بھی بیٹھے۔

وہ دَس روز گوگی کی زندگی کے حسین ترین دن تھے۔

دن میں وہ بیس بیس گھنٹے اپنی مشین پر بیٹھ کر کپڑے سیتا۔ نہ دن میں آرام کرتا نہ رات کو

اُس نے خوبصورت کپڑے جوتے پہنے۔ خوب مزے مزے کے کھانے کھائے۔ سیر کی، جھولے لیے، زندگی میں پہلی بار پہاڑ دیکھے اور جھیلیں بھی۔ کیبل کار میں بیٹھی اور کشتی میں بھی۔ گھوڑے کی سواری کی اور برف کے سنومین (Snowman) بھی بنانے کی کوشش کی۔ رات میں سردی سے کانپتے ہاتھوں سے آئس کریم کھائی اور یخ ٹھنڈا سلش بھی پیا۔ خریداری بھی کی اور خوب مزے کیے۔

عثمان نے شادی کے بعد تقریباً پورا سال گوگی کو توجہ دی اور اپنے کام کو بھی۔ اپنی مسلسل محنت سے اُس نے نئی موٹرسائیکل لی اور گھریلو ضرورت کی بہت سے دوسری چیزیں بھی بنائیں۔ تایا جی سب سے زیادہ خوش تھے کہ شادی نے عثمان کا مزاج بدل دیا۔

سردیوں کے بعد گرمیوں کی آمد آمد تھی۔ موسم تبدیل ہو رہا تھا۔ دن میں گرمی ہوتی، تو گوگی کا دل چاہتا پنکھا چلا لیا جائے اور رات کو ٹھنڈ ہو جاتی، تو کمبل بھی نکالنے پڑ جاتے۔ عثمان پر اُس کے عجیب ہی اثرات آنے لگے۔ اُس نے آہستہ آہستہ زیادہ کام کرنا شروع کر دیا۔ دن میں وہ بیس بیس گھنٹے اپنی مشین پر بیٹھ کر کپڑے سیتا۔ نہ دن میں آرام کرتا نہ رات کو۔ اُسے نہ گرمی کا احساس ہوتا نہ رات کی ٹھنڈ کا۔

آٹھ دس دن ایسے ہی معمول کے بعد ایک روز اُس پر نیم دیوانگی کا سا دورہ پڑ گیا۔ اپنے کمرے کی ہر چیز اُس نے تہس نہس کر کے رکھ دی اور پھر گھر میں دیوانہ وار گھومنے لگا۔ اُس کی لال سرخ انگارہ آنکھیں اور دیوانگی دیکھ کر گوگی ڈر گئی اور دادا جی کے کہنے پر تائی جی کے گھر بھاگ گئی۔ دادا جی اور تایا جی بھی اُسے قابو کرنے میں ناکام ہو گئے۔ آخر تایا جی اپنے دونوں چھوٹے بیٹوں کے ساتھ عثمان کو پکڑ کر ڈاکٹر کے پاس لے گئے۔

اُن کے محلے میں ہی وہ ڈاکٹر بیٹھتا تھا جس نے ایک کمپونڈر سے ڈاکٹری سیکھی تھی۔ محلے بھر کو ٹیکے اور ڈرپیں وہی لگاتا اور اُس کی دوا سے سب کو آرام بھی آ جاتا۔ سو عثمان کو بھی اُسی ”قابل ڈاکٹر“ کے پاس لے جایا گیا۔ ڈاکٹر نے تشخیص کی کہ بخار سر پر چڑھ گیا ہے۔ ٹھنڈی پٹیاں کریں اور بخار کی دوا دیں۔ اُس نے ایک ٹیکہ لگا کر اُسے گھر بھیج دیا۔

مگر تایا جی جانتے تھے کہ یہ بخار نہیں تھا جس کا علاج وہ کئی بار عاملوں، بزرگوں اور صاحب کشف و کرامات بابوں سے کروا چکے تھے۔ وہ تو بیٹے کو برسوں سے لیے پھر رہے تھے۔ ہر برس ایک سے دو بار ایسا ہی ہوتا تھا۔ وہ نیم دیوانہ ہو جاتا۔ تائی جی کے خیال میں کسی چڑیل کا سایہ تھا یا جنات کا اثر۔ کتنے ہی تعویذ اُسے پہنائے جا چکے تھے۔ گھول کر پلائے گئے تھے۔ دم دُرود اور کتنے ہی عمل۔ اس برس اِس دورے کا وقفہ بڑھا تھا مگر ساتھ ہی شدت بھی۔

گوگی ایک صدمے کے اثر میں تھی۔ عثمان کی لال انگارہ آنکھیں اور چہرے کی دہشت۔ وہ دَس دن تائی جی کے پاس رہی اور عثمان کو اُن سب دنوں میں باپ بھائیوں نے گھر میں بند رکھا۔ آہستہ آہستہ اُس کا جنون کم ہوا، تو تایا جی گوگی کو گھر چھوڑ آئے۔ اُس کے لیے اِس زندگی کو قبول کرنا بے حد مشکل تھا۔ دادا جی اُسے حوصلہ دیتے اور سہارا بھی۔

تائی جی نے اُسے عثمان کے ماضی کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ بس یہی درس دیا تھا کہ وہی اُسے ٹھیک کرسکتی ہے۔ بن ماں باپ کی بچی کہاں جاتی، کس سے فریاد کرتی؟ اُسے کس عذاب میں دھکیل دیا گیا تھا۔ عثمان کو نارمل ہونے میں مزید دس روز لگے اور گوگی کو اپنا گھر سمیٹنے اور ٹوٹی چیزیں مرمت کروانے میں تقریباً ایک مہینہ۔

عثمان ٹھیک ہو کر اب بالکل نارمل ہوگیا۔ پہلے کی طرح گوگی سے بات چیت کرنے لگا۔ ہنسی مذاق بھی مگر گوگی بہت بری طرح ڈر چکی تھی۔ تایا جی روز اُسے سمجھانے پہنچ جاتے کہ وہی شوہر کو ٹھیک کرسکتی ہے۔ وہ ٹھیک ہوجائے گا۔

”تایا جی! یہ کوئی مسئلہ ہے۔ کوئی بیماری ہے؟“ گوگی ہر بار یہی کہتی۔

”پتر! کوئی بیماری نہیں۔ نہ بخار ہوتا ہے، نہ گلا خراب، نہ پیٹ خراب، نہ درد۔ نہ دل گردے جگر میں کوئی خرابی۔ اب صرف غصہ آنا، اول فول بکنا اور گالیاں دینا کوئی بیماری تو نہ ہوئی۔“

”تایا جی! یہ کسی سے زیادہ بات نہیں کرتے۔ زیادہ گھلتے ملتے نہیں۔ کوئی دوست یار بیلی نہیں۔ کوئی نہ کوئی مسئلہ تو ہوا نا۔“ گوگی دوسرا نکتہ لے آئی۔

”جھلی ہوگئی ہے پتری۔ اب اگر اُس کی عادت ہی نہیں ملنے ملانے کی، تو یہ کوئی بیماری ہوئی۔“ تایا جی نے پھر اُس کی بات کاٹ دی۔

”تایا جی! مجھے تو اب بہت ڈر لگتا ہے۔“ گوگی اپنے خدشات اور کیسے بتاتی۔

”بیٹی! نماز پڑھ کر دعا کر۔ اِس پر آیۃ الکرسی پڑھ کر پھونکا کر۔ آخری سورتیں پڑھ کر دم کیا کر۔ صبح شام کی دعائیں پڑھ کر پھونک دیا کر۔“ تایا جی اُسے تسلی دیتے اور گوگی اُنھیں کیا بتاتی کہ وہ سب کچھ پڑھ کر خود پر پھونکتی ہے اور اپنی خیریت اور سلامتی کے لیے بھی دعائیں کرتی ہے۔

تائی جی تو ہر بار اُسے یہی سناتیں کہ اُس کی قسمت سے عثمان کو ٹھیک ہو جانا چاہیے تھا۔ بیوی کی محبت تو تاج محل بنوا دیتی ہے۔ اُس سے ذرا سا شوہر قابو میں نہیں آتا۔ بن سنور کر رہو۔ اُس سے پیار محبت سے رہو، تو وہ اُکھڑا کیوں ہو۔ اب گوگی اُن کی باتیں سنتی اور اندر ہی اندر سہم جاتی کہ پہلے بھی وہی ماں باپ کی موت کی وجہ سے بدقسمت مشہور ہوئی تھی اور اب اِس شوہر کے مزاج سے جانے اُس پر کیا لیبل لگنے والا تھا۔

عثمان پھر اِس موسم گرما میں خاصا بہتر رہا۔ دل لگا کر کام کیا۔ گوگی کے ساتھ بھی ٹھیک رہا۔ گوگی اب نمازوں میں مزید پابند ہوتی جا رہی تھی۔ صبح شام کے اذکار کے غلاف اوڑھ لیتی۔ حفاظت کی دعائیں تسلسل سے دہراتی۔ نارمل زندگی پر وہ اپنے رب کی بہت شکر گزار بھی تھی۔

بچے کی مصروفیت میں گوگی کو عثمان کے بگڑتے مزاج کا اندازہ ہی نہ ہوا

اُنھی دنوں اُس کی گود میں ننھا بیٹا آ گیا۔ تایا جی نے

پوتے کا نام علی احمد رکھا۔ دادا جی اب بچے کے پردادا بن کر خوب شاداں و فرحاں تھے۔ گو بڑھاپا اُنھیں کمزور کر رہا تھا۔ مگر علی کو دیکھ کر وہ بہت خوش ہو جاتے۔ علی ابھی سال کا بھی نہ ہوا تھا کہ دادا جی چل بسے۔ بہت خاموشی سے اگلے جہاں روانہ ہو گئے۔

گوگی کے لیے تو وہ اُس کا مکمل میکہ تھے۔ باپ بھی، ماں بھی، سہیلی بھی اور سہارا بھی۔ وہ بہت دن اُنھیں یاد کر کے روتی رہی۔ دادا جی کو یاد کرنے کے بعد فرصت ملتی، تو علی اپنی پیاری پیاری شرارتوں سے اُسے بہلا لیتا۔ اب اُسے مکمل توجہ چاہیے ہوتی۔ عثمان بھی بچے کو بہت پیار کرتا۔ بچے کی مصروفیت میں گوگی کو عثمان کے بگڑتے مزاج کا اندازہ ہی نہ ہوا۔

پہلے اُس نے مسلسل جاگنا شروع کیا۔ پھر بغیر کسی وقفے کے سلائی کا کام اور پھر اُسے عجیب غصہ آنے لگا۔ اُسے بلا وجہ ہر بات پر جھنجلاہٹ ہونے لگی۔ گوگی سارا دِن بچے اور گھر کے ساتھ مصروف رہنے کے بعد رات کو گہری نیند سو جاتی۔ اُسے عثمان کے مسلسل جاگنے کی خبر ہی نہ ہوئی۔ اندازہ اُس وقت ہوا جب معاملہ بالکل ہی ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ عثمان پہلے کی طرح بے قابو ہو گیا۔ وہ سارا دِن بے چین رہا۔ مسلسل اپنے سینے والے کپڑوں کو اُلٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔

دادا جی کی وفات کے بعد سے باہر کی بیٹھک ہی اُس کی سلائی کا کمرا تھی۔ تایا جی نے اُس کی لڑائی جھگڑے کی عادت کی وجہ سے اُسے کام گھر پر ہی بھیجنا شروع کر دیا تھا۔ دکان میں اُس کی وجہ سے باقی کاریگر بھاگ جاتے۔ گوگی نے تایا جی کو بلایا۔ تایا جی اُسے ڈاکٹر کے پاس لے جا کر ٹیکہ بھی لگوا لائے۔ حسب سابق ڈاکٹر نے بخار کے سر چڑھ جانے والی وجہ ہی بتائی تھی۔ اُس رات عثمان سوتا رہا۔ صبح میں وہ کچھ بہتر تھا۔ گوگی مطمئن ہو کر بچے میں مصروف ہو گئی۔

لیکن گوگی اب بھی اُس کی بے چینی محسوس کر رہی تھی۔ وہ مسلسل مشین پر بیٹھا کام کر رہا تھا۔ اُس کی رات کو آنکھ کھلی، تو بھی مشین چل رہی تھی۔ جانے اُس میں اتنی طاقت کیسے آ جاتی تھی۔ سال بھر کا علی مشین کی آواز سے بار بار نیند میں چونک جاتا۔ گوگی خود بھی سہمی ہوئی تھی۔ وہ رات اُسی بے سکونی میں گزری۔ صبح تڑکے کچھ سکون ہوا، تو وہ کمرے سے باہر نکلی۔ بیٹھک میں سلائی مشین کے قریب ہی عثمان سو رہا تھا۔

گوگی باورچی خانے میں آ گئی۔ اُسے خود بھی بھوک لگی تھی اور بچے کے لیے بھی فیڈر بنانا تھا۔ ابھی وہ خود روٹی اور رات کا سالن ختم کر کے فارغ ہوئی ہی تھی کہ علی کے رونے کی آواز آنے لگی۔ اُس نے پھرتی سے بچے کا فیڈر تیار کیا۔ بوتل لے کر وہ کمرے کی طرف بھاگی۔ اندر کا منظر اُسے دہلا دینے کے لیے کافی تھا۔ بچے کی رونے کی آواز سن کر عثمان کمرے میں آ گیا تھا۔ وہ پلنگ کے پاس کھڑا بچے کو چپ ہونے کا کہ رہا تھا۔ معصوم سال بھر کا بچہ حکم کو کیا سمجھتا۔

پل بھر میں دیکھتے ہی دیکھتے اُس نے علی کو اُٹھایا اور دِیوار میں دے مارا۔ بچہ وہیں ساکت و صامت ہو گیا۔ گوگی کے ہاتھ سے فیڈر گر گیا۔ اُس نے عثمان کو دھکا دیا اور بچہ اٹھا کر باہر بھاگی۔ اُس کی چیخ و پکار گلی بھر میں سنائی دے رہی تھی۔ بچے کو اَسپتال لے جایا گیا۔ دس دن وہ موت و حیات کی کش مکش میں رہا۔ ماں کی دعاؤں اور بروقت علاج سے بچہ زندگی کی طرف لَوٹ تو آیا مگر وہ قوتِ سماعت اور گویائی سے محروم ہو چکا تھا۔

گوگی نے اُن دس دنوں میں اسپتال میں رہتے ہوئے ہی یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اِس گلے پڑے ڈھول کو مزید نہیں پیٹے گی۔ اُس نے تایا جی کو صاف صاف کہہ دیا کہ عثمان کو لے جائیں، اُس کا علاج کرائیں۔ اب اُس کے گھر میں عثمان کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ اب اُس کے دروازے عثمان کے لیے بند ہیں۔ اُس کا ہنر اُس کی طاقت تھا۔ اُس کے سر پر اپنی

چپ تھی۔ گلے میں اُس نیم پاگل شخص کے نام کا تمغہ اب اُسے کسی صورت منظور نہ تھا۔ تایا جی عثمان کو اپنے گھر لے گئے۔ اِس حالت میں اُسے سنبھالنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔

جانے کن کن پیروں، فقیروں سے دم درود کرائے، سنیاسیوں سے دوائیں لیں۔ مہینے بعد اُس کی حالت بہتر ہونے لگی۔ عثمان ٹھیک ہونے کے بعد پھر سے سلائی کا کام کرنے لگا۔ مگر ہر وقت اُس کی لڑائی جھگڑے کی عادت اُسے والدین کے گھر ٹکنے نہیں دے رہی تھی۔ بہن بھائیوں نے بھی اُسے برداشت کرنے سے انکار کر دیا۔ تایا جی نے بیٹے کو گوگی سے معافی مانگنے کا کہا۔ بہت منت سماجت کے بعد وہ بیوی سے معافی مانگنے پر راضی ہوا۔ خاندان بھر کا دباؤ بھی گوگی پر ڈلوایا گیا۔ گوگی کا تو اِس تمام ددھیال کے سوا کوئی سہارا بھی نہ تھا۔ آخر مجبور ہو کر اُس نے اُسے گھر آنے کی اجازت دی۔

اب گوگی بہت محتاط ہو چکی تھی۔ دوسری طرف عثمان بھی مزاج میں بہتر رہا۔ اُس کی جھڑکیاں، طعنے، تشنے اور گالیاں تو اُس کی ذات کا حصہ تھیں۔ گوگی اُنھیں تو پھر بھی برداشت کر لیتی۔ جب وہ ہر آئے گئے کے سامنے اُسے ذلیل کرتا اور طرح طرح کے الزامات لگاتا، تو بھی سن لیتی مگر اُس پر غصے اور جنون کا دورہ نہ پڑا تھا۔

تائی جی اکثر اُسے تسلی دیتیں۔ اُسے نئے نئے بزرگوں کے تعویذ اور دَم والا پانی لا کر دیتیں کہ عثمان کو بہانے بہانے سے پلائے جائیں۔ تایا جی بیٹے کو سائیں کہتے کہ کبھی کبھی اللہ لوک ہو جاتا ہے۔ مگر کتنا محنتی اور ہنر مند ہے۔ لیکن گوگی کے لیے وہ چلتا پھرتا خطرہ تھا۔ علی جو نہ سن سکتا تھا اور نہ بول سکتا تھا، اب بڑا ہو رہا تھا۔ مگر باپ کو دیکھ کر بے حد خوف زدہ رہتا۔

دو سال بعد گوگی کی گود پھر ہری ہو گئی۔ علی کا بھائی عمر اَب اُس کی گود میں تھا۔ اب وہ خود سیانی ہو گئی تھی۔ اُس کی کوشش ہوتی کہ عثمان بیٹھک سے باہر ہی نہ نکلے۔ اندر ہی اُسے کھانا پانی دے دیتی۔ اور جب کبھی وہ گھر میں اندر آتا، تو بچوں کی نگرانی پر ایسے بیٹھ جاتی جیسے مرغی اپنے چوزوں کی کرتی ہے۔ باپ کا غصہ بھی ناک پر دھرا رہتا۔ وہ اُسے سزا گھر میں خرچ نہ دے کر دیتا۔ گوگی کو خود سلائی کا کافی کام مل جاتا۔ سو اُس نے عثمان کی طرف سے آنے والی خرچ کی تنگی کو بھی سہہ لیا۔

عمر کے بعد حیدر بھی گوگی کی گود میں آ گیا۔ تینوں بیٹوں سے اُس کے گھر میں خوب رونق ہو گئی تھی۔ عثمان کو بچوں کے قریب آنے کا بہت ہی کم موقع ملتا مگر وہ اُن پر اپنی دھمکیوں اور گالیوں سے رعب خوب جماتا۔ علی تو خیر باپ کی باتیں سن ہی نہ سکتا تھا مگر دونوں چھوٹے باپ کو دیکھتے ہی ماں کی گود میں آ کر چھپ جاتے۔

گوگی زندگی میں مسلسل دو محاذوں پر برسرِ پیکار تھی۔ ایک طرف شوہر کی بدمزاجی کی وجہ سے گھر کے ماحول میں تلخی، خاندان بھر اُسے ہی ہر مسئلے کا قصوروار گردانتا۔ اُن سب کے سامنے وہ ایک ظالم، بدتمیز اور بدزبان عورت تھی جو خاوند کو جوتے کی نوک پر رکھتی۔ ہر محفل میں اُسے شوہر کی اطاعت پر لیکچرز سننے کو ملتے۔ تائی جی اُسے ہی بیٹے کے جنون کا ذمے دار ٹھہراتیں۔

دوسرا محاذ بیٹوں کی اچھی تعلیم و تربیت تھا۔ سلائی مشین اُس کی ہمیشہ کی ساتھی تھی۔ علی کو خصوصی بچوں کے سکول میں داخل کرایا گیا۔ دونوں چھوٹے بچے نارمل تھے مگر بے حد ڈرے، سہمے اور خود اعتمادی سے محروم۔ عمر سارا دِن انگوٹھا چوستا، تو حیدر ناخن چباتا۔ دوسروں سے بات کرنا تو بچوں کو آتا ہی نہ تھا۔ رفتہ رفتہ عمر کے ہکلانے کے مسائل شروع ہو گئے۔

جب بھی باپ پر جنون طاری ہوتا، بچے بھی ڈر جاتے۔ گوگی کے لیے اِس شوہر نامی شخصیت کو گھر میں رکھنا ناممکن ہوتا جا رہا تھا۔ مگر تایا جی سارے خاندان کی پنچایت لگا کر ہر بار اُسے ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیتے۔

گھریلو حالات کا اثر بچوں کی تعلیم پر بھی پڑنے لگا۔ علی نے میٹرک کیا اور پھر دادا کے ساتھ کام سیکھنے لگا۔ عمر اور حیدر بھی پڑھائی سے زیادہ شوق سے کام سیکھتے۔ دن میں ماں اُنھیں سکول بھیجتی جہاں اپنے مسائل کی وجہ سے وہ خود کو غیر محفوظ سمجھتے۔ بچے اُنھیں توتلا اور ہکلا کہتے۔ سو اُنھیں پناہ دادا کی دکان میں ہی ملتی۔ دادا کی جان تینوں پوتوں میں تھی۔ سو اُنھوں نے تینوں کو عثمان سے بھی زیادہ عمدہ ہنر سکھایا۔

عمر اور حیدر نے بھی بمشکل میٹرک کیا اور اَپنے خاندانی ہنر میں کمال حاصل کر لیا۔ تینوں ہی آپس میں بہترین دوست تھے یا پھر ماں اُن کے لیے چھت، سایہ اور پناہ تھی۔ گوگی اپنے گھر کے ماحول سے بچوں کو دور بھیجنا چاہتی تھی۔ تایا جی کے تعاون اور گوگی کی کوششوں سے تینوں کو سعودی عرب کا ویزا مل گیا۔ اُن کے پاس اِس صورتِ حال سے نکلنے کا یہی راستہ تھا۔ کیونکہ کوئی عثمان کو بیمار سمجھنے پر راضی نہ تھا۔ اُسے بظاہر کوئی تکلیف نہ تھی۔ اب صرف غصّے اور جنون کا ڈاکٹر گوگی کی فرمائش پر کہاں سے ڈھونڈا جاتا۔

اپنے ہر دورے سے نکلنے کے بعد عثمان کچھ نہ کچھ شرمندہ بھی ہوتا۔ معافیاں بھی مانگتا مگر اُسے خود بھی اپنی حرکتوں کی وجہ سمجھ نہ آتی اور گوگی کی روح اور جسم پر لگے زخم بھی اُن معافیوں سے نہیں بھر سکتے تھے۔

لوگوں کے الزامات، لعنتوں اور ملامتوں کے تیر سہتے سہتے گوگی اب تھکنے لگی تھی۔ مسئلے کا کیا حل تھا؟ کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔ تینوں بیٹے اب اپنے کام کی وجہ سے سعودی عرب میں آباد ہو گئے، تو اُنھوں نے ماں کے لیے بھی ویزا بھیج دیا۔ پہلی بار وہ تین ماہ کے لیے بیٹوں کے پاس گئی اور پھر سال میں چھ سے آٹھ ماہ بیٹوں کے پاس جا کر رہنے لگی۔ تایا جی اور تائی جی کے لیے بیٹے کو سنبھالنا ہمیشہ ہی سے مشکل تھا۔ گوگی نے کتنا بوجھ اٹھا رکھا تھا ... اب ماں باپ، بہن بھائی سب کے لیے مل کر اٹھانا بھی ممکن نہ تھا۔

غضب کی دھوپ تھی اپنائیت کے جنگل میں
شجر بہت تھے مگر سایہ دار کوئی نہ تھا

ویزے کے مسائل کی وجہ سے گوگی کو پاکستان واپس آنا پڑتا۔ عثمان کے ساتھ وہ چند ماہ بھی کسی عذاب سے کم نہ ہوتے۔ بچوں کے جانے کے بعد اب اِس گھر میں اُس کا تختۂ مشق صرف بیوی ہی بچ جاتی۔ اب بھی وہ مہینے کے پندرہ بیس روز بے تحاشا کام کرتا۔ نیند اُس سے ناراض ہی رہتی۔ ایک پل کو بھی اُس کی آنکھ نہ لگتی اور پھر وحشت اُسے دبوچ لیتی۔

وہ ایک حبس زدہ برسات کا دن تھا۔ خوب بارش کے بعد ہوا ساکن تھی۔ سانس لینا بھی محال تھا۔ وہ بہت دنوں سے مسلسل جاگ رہا تھا۔ اب اُس سے کام بھی نہیں ہو پا رہا تھا۔ تایا جی نے اپنے ایک شاگرد کو اُس سے کپڑے واپس لینے بھیجا۔ عثمان جانے کس خیال میں تھا۔ اُسے دبوچا اور مارنا شروع کر دیا۔ گوگی اور دُوسرے لوگوں کے پہنچنے سے پہلے ہی وہ اُسے اِس قدر مار چکا تھا کہ وہ گر کر بے ہوش ہو گیا۔ اپنے بیٹوں اور بیوی کے بے ہوش ہونے، ہڈیاں ٹوٹنے اور معذور ہونے پر بھی کسی نے اس معاملے کو کوئی خاص اہمیت نہ دی تھی۔ مگر اُس شاگرد کے والدین فوری طور پر پولیس کے پاس پہنچ گئے۔ ڈاکٹر کی رپورٹ کی روشنی میں پرچہ کٹوا دیا گیا۔ پولیس عثمان کو پکڑ کر لے گئی۔

بچے کی دو ہڈیاں ٹوٹی تھیں اور وہ شدید زخمی تھا۔ تایا جی کی معافیاں تلافیاں بھی یہاں کسی کام نہ آئیں۔ حوالات میں عثمان کی وحشت اور بڑھ گئی۔ وہ اَپنے حواسوں میں تو تھا ہی نہیں، مزید لوگوں پر حملہ کر دیا۔ اور زندگی میں پہلی بار بیوی، بیٹوں یا بھائیوں کے بجائے خود اَسپتال پہنچا۔ ڈاکٹروں نے تایا جی سے ساری تفصیل پوچھی اور اُنھوں نے حسبِ معمول یہی جواب دیا کہ مزاج کا ذرا سخت ہے اور غصّے میں آجاتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے تمام زخموں کو دیکھنے کے بعد تایا جی کو ڈانٹ کر سچ بتانے کو کہا۔ مگر اُنھیں تو یہی سچ پتا تھا کہ عثمان پندرہ بیس سال کا تھا تب سے غصّے کا تیز ہو گیا۔

"بابا جی! حیرت ہے آپ کا بیٹا پچاس پچپن سال کا ہو گیا، اپنے گھر والوں کو معذور اَور محتاج کر دیا۔ ساری دنیا سے لڑ لڑ کر سب کو تنگ کر رکھا ہے اور آپ اب بھی اُسے صرف سخت مزاج اور غصّے کا تیز کہہ رہے ہیں۔ کبھی کسی نفسیاتی ڈاکٹر کو دکھایا ہے؟ آپ کا بیٹا نفسیاتی مریض ہے۔" ڈاکٹر صاحب زور سے بولے بلکہ گرجے اور برسے۔

"کیا مطلب؟ آپ کا خیال ہے کہ میرا بیٹا پاگل ہے؟" تایا جی حیرت سے بولے۔

"نہیں! مکمل پاگل نہیں ہے۔ اگر آپ وقت پر اُس کا علاج کروا لیتے، تو یہ ایک نارمل زندگی گزار رہا ہوتا۔ آپ نے اُس کا علاج کبھی کروایا ہی نہیں۔ اُس کے دماغ کے خلیوں میں کمی بیشی ہوتی تھی جس کی وجہ سے مزاج بگڑ جاتا اور جسے آپ لوگ غصّہ اور سخت مزاجی سمجھتے رہے۔ اگر آپ شروع میں ہی اُسے نفسیات کے کسی ڈاکٹر کو دکھاتے، تو بس تھوڑی سی ادویہ سے یہ ٹھیک ہو جاتا۔ پھر تھوڑی سی دوا مسلسل کھانے سے صحت مند اور اَچھی زندگی گزارتا رہتا۔ آپ لوگوں نے اُس پر بھی ظلم کیا کہ اُسے خود بھی اپنی وحشت کی سمجھ نہیں آتی تھی۔ اور پھر اُس کی شادی ایک یتیم اور مسکین لڑکی سے کرا کر اُس پر اور اُس کی ساری اولاد پر۔ اُسے شادی نہیں بلکہ علاج کی ضرورت تھی۔" ڈاکٹر صاحب بہت غصّے میں تھے۔

"ہم نے تو اُسے کئی ڈاکٹروں کو دکھایا۔ سب نے یہی کہا کہ اسے بخار سر پر چڑھ گیا ہے۔" تایا جی منمنائے۔

"کون سے ڈاکٹروں کو دکھایا؟ آپ اتائیوں اور کمپاؤنڈروں کے پاس لے گئے ہوں گے۔ اُس کی وحشت دیکھ کر کوئی بھی سمجھ سکتا ہے کہ وہ ذہنی مریض ہے۔ اپنے حواسوں میں نہیں۔ اُس پر دورہ پڑا ہوا ہے۔ اُس میں وہ کسی کو بھی نقصان پہنچا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خود کو بھی ختم کر سکتا ہے۔ مسلسل علاج اور دَوا سے یہ مرض بالکل ٹھیک ہو سکتا تھا۔ مگر آپ نے تو ایک آدھ ڈاکٹر سے ٹیکہ لگوا کر اسے گھر میں ہی بند کر دیا۔ ساری مصیبت اُس کی بیوی کے سر پر ڈال دی اور خود تماشا دیکھتے رہے۔

"بزرگو! یہ خاصا سنجیدہ کیس بن گیا ہے۔ اور مقدمہ اُس پر نہیں بلکہ آپ پر ہونا چاہیے۔ بیماری چھپانے، علاج نہ کرانے اور اُس کے تمام خاندان، اُس بے چارے لڑکے اور حوالاتیوں کے زخمی بلکہ نیم مردہ ہو جانے کا۔" ڈاکٹر صاحب بولے۔

عثمان ادویہ کے اثر سے بالکل بے ہوش تھا۔ اُسے عدالت نے حوالات کے بجائے اسپتال بھیج دیا تھا جس کے نفسیاتی وارڈ میں اُسے انتہائی نگہداشت اور ڈاکٹروں کی مسلسل نگرانی میں رکھا گیا۔

جیل سے رہا ہونے اور مقدمے سے نکلنے کی تو اپنی ہی کہانی تھی۔ اُس کاریگر کے والدین سے تایا جی نے بڑے بڑوں کو بیچ میں ڈال کر معافی مانگی۔ اُس کے علاج کا تمام خرچہ اٹھایا اور بچے کی بحالی کے لیے کثیر رقم بھی دی۔ بچے کے لواحقین نے عدالت میں انگوٹھے لگا کر اور بیان دے کر صلح کر لی۔ دوسری مصیبت حوالاتیوں کی تھی۔ تایا جی کس کس کے آگے نہ روئے اور پیسے بھرے۔ آخر میں پولیس سے جان چھڑانے کے لیے بھی اُنھیں پیسے بھرنے پڑے۔

گوگی اور اُس کے بیٹوں کے پاس اُس مکان کے علاوہ کوئی جمع پونجی نہ تھی اور گوگی نے اپنا مکان بیچنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ تایا جی اِسی بات پر خوش تھے کہ گوگی نے اپنے زخموں کی رپورٹ کبھی درج نہ کرائی تھی اور اَپنی زندگی کی مصیبتوں کا حساب نہ لیا تھا۔ بیس پچیس برس تو اُسی نے اُس نفسیاتی مریض کے ساتھ ایک چھت کے نیچے گزارے تھے۔

عثمان کو چھ ماہ تو مسلسل اسپتال میں رکھا گیا اور پھر اُس کی حالت بہتر ہونے پر بحالی سنٹر میں بھیج دیا گیا۔ اُسے مکمل صحت یاب ہو کر نارمل زندگی کی طرف لَوٹ کر آنے میں سال سے زیادہ کا عرصہ لگ گیا۔ تایاجی ہر ماہ اسپتال کے اخراجات اور اَدویہ کی قیمت ادا کرتے۔

گوگی اُن حالات میں پھر سے بیٹوں کے پاس چلی گئی۔

اُس کے تینوں بیٹے اب ایک دکان میں ٹیلر ماسٹر تھے۔ عربوں کی توپیں سینے کے ساتھ ساتھ پینٹ کوٹ بھی سلائی کرتے۔ اُنھوں نے ایک مکان کرائے پر لے رکھا تھا جس میں ضرورت کی ہر شے وافر میسّر تھی۔

گوگی اِس سمندر پار دُور دراز گھر میں بھی بہت خوش تھی کیونکہ اُسے اب یقین آ گیا تھا کہ اُس کی زندگی کی تلخیوں کی ذمے دار اُس کی بدقسمتی نہیں بلکہ خاوند کی نفسیاتی اور ذہنی بیماری تھی۔ لاعلمی میں اُسے بھگتنے کی سزا عثمان نے بھی پائی۔ وہ تکلیف میں رہا اور اُسے خود بھی اُس کا کوئی حل سمجھ نہ آتا۔

پورے سال بعد گوگی اپنے تینوں بیٹوں کے ساتھ پاکستان واپس آئی۔ عثمان اپنا علاج مکمل کرا کے گھر آ چکا تھا۔ تایاجی نے اُن سب کا بہت شاندار استقبال کیا۔ بیٹوں نے اُس مکان کو نئے ڈیزائن کا بہترین طریقے سے تعمیر کرایا تھا۔ اُس میں نئے اور جدید فیشن کا سارا فرنیچر اور سامان ڈلوایا تھا۔

عثمان کی شخصیت بھی مکمل طور پر بدل چکی تھی۔ وہ کھانا کھاتا یا نہ کھاتا، اپنی ادویہ بہت باقاعدگی سے لیتا۔ اپنے سونے کی روٹین کا بہت خیال رکھتا۔ کام اور آرام میں توازن رکھتا۔ وہ اپنی بیوی اور بچوں سے بہت محبت سے ملا۔ اُس کے رویے میں نمایاں فرق تھا۔ باتوں میں ربط تھا اور لہجہ بھی بہتر تھا۔ ایک بیمار آدمی خود بھی ساری عمر تکلیف میں رہا اور دُوسروں کو بھی اذیت دیتا رہا۔

گوگی کو [illegible] تایاجی کی لاعلمی پر بے حد افسوس ہوا تھا کہ اِن برسوں میں اُنھوں نے ہر ٹونا ٹوٹکا کیا، ہر پیر فقیر کے پاس گئے مگر یہ احساس نہ کیا کہ یہ کوئی بیماری بھی ہو سکتی ہے۔ بدقسمتی اور بیماری میں فرق پہچاننے میں اُن سب کی تو زندگی ہی گزر گئی۔

خواب میں دیکھا

ایک شخص نے جس سے کچھ واقفیت نہ تھی، سرسیّد سے سفارش کی درخواست کی اور لکھا:

"مَیں نے خواب میں دیکھا ہے کہ ایک بزرگ ہیں جن کی لوگ بے انتہا تعریف کرتے ہیں کہ اُن کی تمام عمر قوم کی خیرخواہی میں گزری ہے۔ جب میری آنکھ کھلی، تو مجھے یقین ہو گیا کہ ہو نہ ہو، وہ بزرگ آپ ہی ہیں اور میری مشکل آپ ہی سے آسان ہو گی۔"

سرسیّد نے اُسے یہ جواب لکھ بھیجا "جس باب میں آپ سفارش چاہتے ہیں، اُس سے مجھے کچھ تعلق نہیں ہے اور جن بزرگ کو آپ نے خواب میں دیکھا ہے، وہ غالباً شیطان تھا۔"

دلّی کی پنواڑنیں

ایک بار حضرت داغ اپنے ساتھیوں سمیت 'پھول والی سیر' میں گئے۔ داغ پان کے رسیا تھے۔ ایک نوجوان اور شوخ پنواڑن کی دکان سجی دیکھ کر اُس کی طرف بڑھے اور پنواڑن سے بولے:

"بی پنواڑن! دس پان لگانا۔"

پنواڑن نے جوتی کی نوک پر ہاتھ لگا کر کہا "کیا فرمایا، کتنے لگاؤں؟"

میرزا داغ جھینپ گئے اور پنواڑن سے صحیح محاورہ سن کر چوکڑی بھول گئے اور سنبھل کے بولے "دس پان بنانا۔"

دلّی کی پنواڑنیں بھی بامحاورہ اُردو بولتی تھیں۔

لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ ٥

آیتِ کریمہ کی برکت

بے کس کی پکار کو جب کہ وہ پکارے، کون قبول کر کے سختی کو دور کر دیتا ہے اور تمہیں زمین کا خلیفہ بناتا ہے (القرآن)

قرآن پاک منبع رُشد و ہدایت ہے، شفا ہے، سکون و طمانیت کا سرچشمہ ہے۔ دعاؤں کا مرقع ہے، قربِ الٰہی کا ذریعہ ہے۔ لوحِ محفوظ سے قلبِ مصطفیٰ ﷺ تک لاریب نازل کیا گیا۔ قرآن صحیفہ ہے، وظیفہ ہے، نعمتِ غیر مترقبہ ہے۔ فضائل و برکات کا بے پایاں خزینہ ہے، حکمت اور معرفت کے اسرار و رموز کے تابدار موتیوں سے مرصع نسخہ کیمیا ہے۔ جنت کی نعمتوں کی بشارت دیتا اور جہنم کی ہولناکیوں سے نفسِ عمارہ کو خبردار کرتا ہے۔

مَیں ۱۹۹۴ء میں پی ایچ ڈی کرنے کے لیے ملائیشیا گیا۔ چار سال کے طویل عرصے کے دوران مختلف گرم و سرد واقعات پیش آتے رہے، مگر ایک واقعہ جو آج بھی تک میرے دل و دماغ کے نہاں خانوں میں تازہ ہے، قارئین کی نذر کرتا ہوں۔

میری پی ایچ ڈی کی تحقیق ایک جنگل میں ہو رہی تھی جو کہ ساگوان کے بلند قامت درختوں پر مشتمل تھا۔ وہ جنگل کوالالمپور سے جہاں میری یونیورسٹی واقع تھی، تقریباً چھ سو کلومیٹر دور تھا۔ ملائیشیا کی ریاست پرلس (Perlis) جو تھائی لینڈ کی سرحد کے ساتھ ہے، وہاں میرا تحقیقی علاقہ تھا۔ مجھے ہر ماہ ایک ہفتے اُس جنگل میں کام کرنا ہوتا تھا۔

کوالالمپور سے رات کو مَیں بس میں بیٹھتا، تو وہ صبح اذانِ فجر کے وقت مجھے جنگل سے ملحقہ شہر پہنچا دیتی۔ مَیں پھر انتظار کرتا اور سات بجے صبح لوکل بس کے ذریعے مطلوبہ منزل پہنچتا تھا۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ جب مَیں رات کو پرلس جانے کے لیے نکلا، تو میرا پاسپورٹ بیگ میں رکھنے سے رہ گیا۔ ابھی بس شہر سے نکلی ہی تھی، تو مجھے پاسپورٹ اپنی رہائش گاہ پر بھول جانے کا علم ہوا۔ مگر مَیں نے سوچا کہ متعدد بار یہ سفر کر چکا ہوں، کبھی کسی نے پاسپورٹ، ویزا وغیرہ چیک ہی نہیں کیا، تو اس بار بھی کوئی مسئلہ نہیں ہو گا۔

مگر اس مرتبہ جونہی مَیں بس ٹرمینل پر اترا اور بینچ پر بیٹھ کر صبح ہونے کا انتظار کرنے لگا، تو ایک آدمی جس نے ہلکی سی چادر لپیٹی ہوئی تھی، میرے ساتھ آ کر بیٹھ گیا اور ملائیشین زبان میں مجھ سے کہا کہ ویزا دکھاؤ۔ مَیں نے پوچھا، آپ کون ہو؟ تو چادر کندھوں سے ہٹا کر اُپنے کندھوں پر لگے بیج دکھائے کہ

پولیس والا ہوں۔ یہ سنتے ہی میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی اور سوچا کہ اَب بڑی مصیبت گلے پڑ گئی۔ پردیس، بیوی اور دو چھوٹی بیٹیاں کوالالمپور گھر میں موجود، اُن تک یہ خبر کیسے پہنچے کہ مَیں مشکل میں پھنس چکا ہوں۔ غرض اندیشہ ہائے کثیر ایک دم سے دماغ میں گھوم گئے۔

بہرکیف مَیں نے پولیس والے کو انگریزی میں بتایا کہ مَیں یونیورسٹی پُترا ملائیشیا میں پی ایچ ڈی کر رہا ہوں۔ پاکستان کی ایک یونیورسٹی میں پڑھاتا بھی ہوں اور پاسپورٹ ساتھ لانا بھول گیا ہوں۔ آپ مہربانی کریں اور مجھے چھوڑ دیں۔ اُسے میری کچھ باتوں کی سمجھ آئی اور کچھ کی نہیں، کیونکہ انگریزی اُنھیں واجبی سے آتی ہے۔ وہ کہنے لگا، مجھے قانونی تقاضے پورے کرنے ہیں، اِس لیے آپ کو میرے ساتھ تھانے چلنا ہوگا۔ چند منٹوں میں مجھے پولیس وین میں بٹھا کر پولیس سٹیشن پہنچا دیا گیا۔

اُسی بس سے ایک بنگلہ دیشی بھی اترا تھا جو محنت مزدوری کرنے ملائیشیا آیا تھا۔ اَب اُس کا ویزا ختم ہو چکا تھا۔ اُسے بھی میرے ساتھ پولیس سٹیشن لایا گیا (اس بات کا علم مجھے بعد میں ہوا کہ وہ بغیر ویزے کے ہے)۔ تھانے میں موجود لیڈی پولیس افسر کو بھی مَیں نے قائل کرنے کی کوشش کی کہ میرے پاس سٹوڈنٹ ویزا ہے جو مَیں آپ کو دکھا سکتا ہوں، مگر میری ایک نہ سنی گئی۔ اُس بنگالی مزدور کی وجہ سے بھی مجھے رعایت دینے پر آمادہ نہ ہوئی۔

اُسی شہر کے ایک ہوٹل میں میرا پروفیسر اپنی اہلیہ کے ساتھ ٹھہرا ہوا تھا، کیونکہ اُس نے صبح میری تحقیق چیک کرنی تھی۔ مَیں نے اُسی پولیس والے کو کہا کہ تم میرے ساتھ ایک نیکی کرو۔ ہوٹل جا کر پروفیسر صاحب کو یہ پوری رُوداد سنا دو تاکہ وہ میری مدد کریں۔ اللہ اُس کا بھلا کرے، اُس نے پروفیسر کو جگا کر ساری بات بتائی اور واپس آ کر مجھے بتایا کہ وہ صبح پولیس سٹیشن آئیں گے۔

اب مَیں تھا اور تھانے کی حوالات سے جھانکتے قیدی جو مجھے دیکھ رہے تھے کہ اتنا تعلیم یافتہ آدمی کس مصیبت میں پھنس گیا۔ مَیں سخت پریشان اور حواس باختہ تھا لیکن آیت کریمہ کا ورد زیرِلب شروع کر دیا۔ میرے ذہن میں آیا کہ اے ربِ کریم تیرے پیغمبر حضرت یونس علیہ السلام نے مچھلی کے پیٹ سے تیرے حضور اِن الفاظ سے دعا کی تھی اور آج مَیں تیرا عاجز اور پردیسی بندہ مصیبت میں ہوں۔

لَا إِلَٰهَ إِلَّا أَنْتَ سُبْحَانَكَ إِنِّي كُنْتُ مِنَ الظَّالِمِينَ

میری زبان پر جاری ہو گیا اور پھر ایک لمحہ بھی میری زبان نہیں رکی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ اللہ میری ضرور مدد کرے گا۔ دل میں سکون کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ آیت کریمہ میرا سہارا بن گئی۔

صبح ہوتے ہی پروفیسر صاحب تھانے آ گئے۔ اُنھوں نے پولیس افسران کو کہا کہ یہ میرا طالبِ علم اور پاکستان میں ایک یونیورسٹی میں پروفیسر ہے۔ آپ لوگوں کو اِسے میری ضمانت پر چھوڑنا ہوگا۔ اُنھوں نے اپنے فون سے میری بیوی سے بات کروائی۔ مَیں نے اُسے کہا کہ فلاں پاکستانی آدمی کو بلا کر پاسپورٹ کی فوٹو کاپی اِس نمبر پر فیکس کراؤ اور یہ کام جلد ہونا چاہیے۔ چنانچہ ویزے کے فوٹو کاپی بذریعہ فیکس موصول ہوئی، تو پروفیسر صاحب مجھے تھانے سے باہر لے آئے۔ وہاں پروفیسر کا اتنا احترام ہے کہ کسی مجسٹریٹ کی عدالت کے بغیر اُس کی شخصی ضمانت پر اتنا بڑا کام ہو گیا۔

ظہر کا وقت تھا اور مَیں اللہ کے حضور سربسجود تھا۔ آیت کریمہ کے کلمات اور آنسوؤں کی برسات میں میرا ایمان پختہ تر ہو رہا تھا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے ”بے کس کی پکار کو جب کہ وہ پکارے، کون قبول کر کے سختی کو دور کر دیتا ہے اور تمھیں زمین کا خلیفہ بناتا ہے۔ کیا اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی اور معبود ہے؟ تم بہت کم نصیحت و عبرت حاصل کرتے ہو۔ (سورۃ النمل: ۶۲)

آہ جاتی ہے فلک پر رحم لانے کے لیے
بادلو! ہٹ جاؤ، دے دو راہ جانے کے لیے

امتحان

ایک شکی عورت کا اچھوتا ماجرا، اُسے اپنے شوہر پر کامل اعتماد نہ تھا

اولڈ ٹام کی عمر صرف چالیس سال ہے۔ یقیناً اِس عمر کے کسی شخص کو آپ بڈھا نہیں کہہ سکتے لیکن وہ اِسی نام سے مشہور ہے۔ وہ شکل و صورت سے بھی بوڑھا نظر نہیں آتا۔ ہاں اُس کی زندگی بوڑھوں جیسی ضرور ہیں۔ مَیں اُسے ڈارک ہارس کہتا ہوں۔ میری دیکھا دیکھی فیکٹری میں کام کرنے والے میرے مزدور بھی اُسے ڈارک ہارس کہنے لگے ہیں۔

پانچ برس سے وہ میرے ساتھ فیکٹری میں کام کر رہا ہے۔ کسی سے ملتا جلتا نہیں۔ خاموش رہتا ہے اور الگ تھلگ۔ جب کوئی اُس سے بات کرنے کی کوشش کرے، تو وہ مُرا کرا ہی لیتا ہے۔ اُس کے چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ چھا جاتی ہے لیکن آنکھیں کبھی نہیں مسکراتیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آنکھوں سمیت اُس کے تمام چہرے میں نہ کوئی کیف ہے نہ کشش، وہ اَپنے چہرے کے بناؤ سنگھار میں بھی کوئی دلچسپی نہیں لیتا، نہ کبھی کوئی کریم استعمال کرتا ہے اور نہ خوشبو۔

اُس کی شیو کئی کئی دن بڑھی رہتی ہے اور لمبے لمبے بال تیل سے محروم اُلجھے اُلجھے سے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُس کا حلیہ دیکھ کر لڑکیاں کراہت سے منہ دوسری طرف پھیر لیتی ہیں۔

گھر میں صرف اُس کی بیماریاں رہتی ہیں اور بس اور یہ مکان بھی اُس کا اپنا نہیں بلکہ کرائے کا ہے۔ ایسی صورت میں بھلا کسی لڑکی کو کیا سوجھی ہے کہ اُس سے شادی کرے۔

لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب ایک دن اُس نے مجھے مسکراتے ہوئے بتایا کہ اُس کی شادی ہونے والی ہے اور مزا یہ کہ لڑکی جوان ہے اور خوبصورت بھی۔ پہلے پہل تو مجھے

یقین ہی نہیں آیا۔ مَیں نے اُس سے بہت پوچھنے کی کوشش کی کہ لڑکی کون ہے اور کہاں رہتی ہے۔ لیکن اُس نے بتا کر ہی نہ دیا۔ ڈارک ہارس کا کوئی راز جان لینا آسان نہیں۔ وہ وَیسے ہی گم سم رہتا ہے اور جیسے جیسے شادی کی تاریخ قریب آتی گئی، وہ اَور بھی اپنے خول میں بند ہوتا چلا گیا۔ بالآخر شادی کی تاریخ بے حد قریب آ گئی۔

ایک دن مَیں نے تہیہ کر لیا کہ ڈارک ہارس کو زندہ دِلی سکھانی چاہیے۔ اگر وہ شادی کے بعد بھی اِسی طرح منہ بسورتی شکل بنائے رہا، تو اُس کی بیوی کا گزارہ کس طرح ہو گا۔ وہ بے چاری تو جیتے جی مر جائے گی۔ چنانچہ مَیں نے اُس کے ساتھ خوب ہنسی مذاق اور چھیڑ چھاڑ شروع کر دیا۔ رفتہ رفتہ اُس کا چہرہ کچھ شگفتہ سا نظر آنے لگا۔

پھر مَیں نے بیوی کے ساتھ معاشرتی تعلقات پر لیکچر دینا شروع کر دیا۔ آئندہ زندگی کی ذمے داریاں جتلائیں لیکن اُن باتوں کو اُس نے سمجھنے کی کوئی کوشش نہ کی۔ مَیں نے بےزار ہو کر اُسے سمجھانا ہی چھوڑ دیا۔

شدہ شدہ ایک دن مجھے آخر پتا چل ہی گیا کہ ڈارک ہارس کی ہونے والی بیوی کون ہے۔ یہ تھی نائلئی پارکس جو اپنے والدین کے ساتھ ڈارک ہارس کے محلے میں رہتی تھی بلکہ اُس کی قریب ترین ہمسائی تھی۔ دونوں کے مکان کے درمیان صرف ایک دیوار تھی۔ اُس کی عمر بیس برس تھی۔ اِس عمر میں گدھی بھی حسین ہوتی ہے۔ چنانچہ آپ کا جی چاہے، تو اُسے حسینہ کہہ لیجیے لیکن مَیں اُسے کوئی اہمیت دینے کو تیار نہیں۔

ایک دن مَیں نے نائلئی پارکس سے ملاقات کا موقع نکال ہی لیا۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد مَیں نے اچانک ایک خطرناک سوال پوچھ ڈالا ’’کیا تم ڈارک ہارس سے شادی کر رہی ہو؟‘‘

’’نہیں! وہ مجھ سے شادی کر رہا ہے۔‘‘

’’یعنی اُس نے پیش کش کی اور تم نے منظور کر لی۔‘‘ مَیں نے پوچھا۔

’’ہاں! مَیں اپنے گھر کے برآمدے میں بیٹھی ایک کتاب پڑھ رہی تھی کہ وہ آ گیا اور کہنے لگا کہ مَیں تم سے محبت کرتا ہوں۔ کیا تم بھی مجھ سے محبت کرتی ہو۔ مَیں نے کہا نہیں اور پھر وہ منہ لٹکا کر چلا گیا۔‘‘

’’پھر کیا ہوا؟‘‘

’’پھر مَیں نے اکثر دیکھا کہ وہ بہت افسردہ اَور ملول رہنے لگا ہے۔ سر لٹکائے کام پر جاتا اور گردن جھکائے واپس آ جاتا ہے۔ کسی سے کوئی بات نہیں کرتا۔ اُس کا کھانا پینا بھی بہت کم ہو گیا۔ آخرکار مجھے اُس کی حالتِ زار پر رحم آ گیا۔ مَیں نے اُسے اپنے پاس بلایا اور کہا، تم احمق ہو۔ کہنے لگا ٹھیک کہتی ہو۔ اگر مَیں احمق نہ ہوتا، تو تم سے محبت کیوں کرتا۔ مَیں نے کہا، اگر تم احمق نہ ہوتے، تو مجھے تم پر رحم کیوں آتا۔ وہ میری بات کا مطلب سمجھ گیا اور پھر ہم دونوں نے شادی کی تاریخ مقرر کر ڈالی۔‘‘

مَیں نائلئی سے باتیں کر کے واپس چلا آیا۔ چند دنوں بعد شادی انجام پا گئی۔ مگر پھر چند ہی روز گزرے تھے کہ اِس دوطرفہ محبت کا الم ناک انجام دکھائی دینے لگا۔

ایک روز نائلئی نے اپنے شوہر سے کہا، تمہاری مختصر سے تنخواہ سے گزارا بڑی مشکل سے چل رہا ہے۔ کیوں نہ مَیں بھی کوئی ملازمت تلاش کروں تاکہ حالات بہتر ہو جائیں۔

ڈارک ہارس نے فوراً جواب دینا مناسب نہ سمجھا اور چند دن غور و فکر کرنے کے بعد اُس نے نائلئی کو اجازت دے دی۔

دو چار روز کی بھاگ دوڑ کے بعد نائلئی ایک جگہ ملازمت تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ اُس نے اپنے شوہر کو اطلاع دی کہ مجھے ملازمت مل گئی ہے۔

’’کس جگہ ملازمت ملی ہے؟‘‘ ڈارک ہارس نے پوچھا۔

’’بلیک کیٹ بار میں!‘‘ نائلئی نے جگہ بتائی۔

’’لیکن وہ بہت بری جگہ ہے۔ شہر کے تمام غنڈے، چور اُچکے وہاں آتے ہیں۔ مَیں تمہیں وہاں کام کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔‘‘

’’لیکن مَیں نے تو یہ ملازمت منظور کر لی ہے۔ اب کل سے کام پر جاؤں گی۔ ہر رات پچاس ڈالر ملیں گے۔‘‘

’’کیا کہا؟ ہر رات.....‘‘ ڈارک ہارس کو زمین اپنے قدموں تلے سے کھسکتی محسوس ہوئی۔ ’’خبردار جو اَب ملازمت کا نام میرے سامنے لیا۔ مَیں تمہاری ٹانگیں توڑ دوں گا۔‘‘

’’میرے پیارے ڈارک ہارس! تم غلط سمجھ رہے ہو۔ وہاں میرا کام صرف اتنا ہے کہ شام چھ بجے سے رات بارہ بجے تک گاہکوں کو اُن کے پسندیدہ مشروب پیش کرتی رہوں۔ ذرا سوچو، پچاس ڈالر اچھی خاصی رقم ہوتی ہے۔‘‘

’’پچاس ڈالر ہوں یا پچاس ہزار ڈالر، مَیں تمہیں وہاں نہیں جانے دوں گا۔‘‘ ڈارک ہارس کا منہ پھولا ہوا تھا اور وُہ سخت برافروختہ نظر آ رہا تھا۔

’’مگر مَیں ضرور جاؤں گی۔‘‘ نائلئی اپنی ضد پر اَڑی ہوئی تھی۔

اب روزانہ اِسی بات پر میاں بیوی میں لڑائی ہونے لگی۔ ڈارک ہارس زبانی طور پر لڑائی کا فن نہیں جانتا تھا۔ چنانچہ اُس نے دوسرا طریقہ اختیار کیا۔ اُس نے کھانا، پینا، بولنا وغیرہ سب کچھ چھوڑ دیا۔ نائلئی دیکھتی رہی لیکن خاموش تھی۔ یہ جنگ روز بہ روز شدت اختیار کرتی جا رہی تھی لیکن برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔

تیسرے دن ڈارک ہارس دیوانہ ہو گیا۔ اُس نے ایک خالی بوتل نائلئی کے سر پر کھینچ ماری۔ لیکن نشانہ چُوک گیا۔ نائلئی کے چہرے پر معمولی سا زخم آیا اور خون کی ایک دھار بہہ نکلی۔

دوسرے دن جب مجھے اُس جنگ کے بارے میں معلوم ہوا، تو مَیں دوڑا دوڑا بدحواس وہاں پہنچا لیکن اندر داخل ہوتے ہی جو مَیں نے دیکھا وہ مجھے حیران کر دینے کے لیے کافی تھا۔ مَیں نے دیکھا کہ نائلئی خوب خوش و خرم ہے۔ بات بات پر قہقہے لگا رہی ہے اور اَپنے شوہر کو بڑی پیار بھری نظروں سے دیکھ رہی ہے۔

جب مُیں نے ڈارک ہارس سے جھگڑے کے بارے میں پوچھا، تو اُس کے بجائے نائلئی نے کہا ’’جھگڑا وگڑا کچھ نہیں تھا۔ بس مَیں دیکھنا چاہتی تھی کہ میرا شوہر مجھ سے کتنی محبت کرتا ہے۔‘‘

’’کیا مطلب؟ محبت آزمانے کا یہ کون سا انداز تھا۔‘‘ مَیں نے پوچھا۔

’’تم نہیں سمجھو گے۔ ارے بھئی! وہ ملازمت والی بات محض ایک افسانہ تھی۔ مَیں گھر میں اپنے شوہر کی خدمت کروں گی یا بازاروں میں کمائی کرتی پھروں گی؟ اب ثابت ہو گیا کہ میرا شوہر مجھے کس قدر چاہتا ہے۔‘‘

مَیں نے دیکھا کہ دونوں کی آنکھوں میں محبت کا خمار چھایا ہوا تھا اور دونوں ایک دوسرے کو پیار و محبت اور فخر و غرور سے دیکھ رہے تھے۔

چیک کر لو

ایک سردار جی نے گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے کسی سے پوچھا ’’بتاؤ ہم کس پر بیٹھے ہیں؟‘‘

متعلقہ شخص نے پریشان ہو کر کہا ’’گھوڑے پر سردار جی! آپ کو نہیں پتا۔‘‘

’’پتا تو ہے۔‘‘ سردار جی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ’’پھر بھی چیک کر لینے میں کیا حرج ہے۔‘‘

محمد مشتاق [illegible]

مارگلہ کی پہاڑیوں پر ہائیکنگ

اسلام آباد میں مقیم سیر و تفریح کا شوق رکھنے والے اہلِ وطن کے لیے تحفۂ خاص

اردو ڈائجسٹ اپریل ۲۰۲۲ء میں مارگلہ پہاڑیوں پر ہائیکنگ کے بارے میں میرا مضمون شائع ہو چکا۔ اُس میں ہم نے مارگلہ کی پہاڑیوں کا تعارف، ہائیکنگ کے فوائد اور مارگلہ پہاڑیوں کی پرانی مشہور اہم پگڈنڈیوں (ٹریلوں) کا جائزہ لیا تھا۔ اس میں ہم ہائیکنگ کے لیے ضروری سامان اور ہائیکنگ کے خطرات و حفاظتی اقدامات کا جائزہ لیں گے۔

ہائیکنگ میں بقا کے لیے دس ضروری چیزیں

ہائیکنگ میں بقا کے لیے دس ضروری چیزیں ہیں جو ہائیکنگ اور اسکاؤٹنگ تنظیمیں پہاڑوں اور جنگلوں میں محفوظ سفر کے لیے تجویز کرتی ہیں۔ اگرچہ حالات میں فرق، تجربے اور سفر کی طوالت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اُن میں سے کئی چیزیں کم یا زیادہ کی جا سکتی ہیں۔ ماؤنٹینیئرنگ (کوہ پیمائی) کا نواں ایڈیشن: دی فریڈم آف دی ہلز (پہاڑوں کی آزادی) جو ۲۰۱۷ء میں شائع ہوا، دس ضروری چیزوں کی وضاحت اس طرح کرتا ہے:

۱۔ نیوی گیشن: نقشہ، بلندی پیما (آلٹی میٹر)، کمپاس، جی پی ایس ڈیوائس، ذاتی لوکیٹر بیکن۔

۲۔ ہیڈ لیمپ: ایل ای ڈی بلب اور اِضافی بیٹریوں کے ساتھ۔

۳۔ سورج کی دھوپ سے حفاظت: دھوپ کے چشمے، سورج سے حفاظتی لباس، سن اسکرین۔

۴۔ ابتدائی طبی امداد: ایک ابتدائی طبی امداد کا بکس، واٹر پروف پیکیجنگ میں لپٹا ہوا۔

۵۔ چاقو: مختصر سفر پر پیدل سفر کرنے والے ایک ملٹی ٹول، مضبوط چپکنے والی ٹیپ اور رَسی بھی لے سکتے ہیں۔ ایک طویل سفر پر مزید چھوٹے اوزار کارآمد ہو سکتے ہیں۔

۶۔ آگ: آگ کو شروع کرنے اور برقرار رکھنے کا ذریعہ: یا تو بیوٹین لائٹر یا ماچس یا آگ بنانے والا دوسرا آلہ۔ یہاں تک کہ گیلی لکڑی کو بھڑکانے کے لیے فائر سٹارٹرز اور اُن علاقوں میں جہاں لکڑیاں دستیاب نہیں ہوں گی، پورٹیبل چولہا ضروری ہے۔

۷۔ پناہ گاہ: پلاسٹک ٹیوب ٹینٹ، جمبو پلاسٹک کوڑے دان، بیویک شیلٹر (سلیپنگ بیگ)۔

۸۔ اضافی کھانا: کم از کم ایک دن کا کھانا مختصر ہائیک کے لیے جس کے لیے کھانا پکانے کی ضرورت نہیں ہونی چاہیے۔

۹۔ اضافی پانی: پینے کا پانی اور پانی کو صاف کرنے کی مہارت اور اَوزار۔

۱۰۔ اضافی کپڑے: ہنگامی پناہ گاہ میں رات گزارنے پر اضافی اشیا کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔

پہلی پانچ اشیا کا مقصد ہنگامی حالات کو روکنا اور اُن کا جواب دینا ہے۔ دوسری پانچ کا مقصد ایک یا زیادہ راتیں باہر بحفاظت گزارنا ہے۔ مارگلہ کی پہاڑیوں پر ایک روزہ ہائیکنگ کے لیے اِن میں سے آپ کو ۲ نمبر ہیڈ لیمپ، ۶ نمبر آگ، ۷ نمبر پناہ گاہ اور ۱۰ نمبر اضافی کپڑوں کی ضرورت نہیں ہوگی۔ ویسے بھی مارگلہ کی پہاڑیوں پر آگ جلانا منع ہے اور کیمپنگ یا رات گزارنے کے لیے ٹریل کے شروع میں لگے ہوئے معلوماتی بورڈ پر تحریر فون نمبر پر کال کر کے پہلے اجازت طلب کرنا ضروری ہے۔

مارگلہ ہلز میں ہائیکنگ کے لیے ضروری سامان

مارگلہ کی پہاڑیوں میں ایک دن کی ہائیکنگ کے لیے نسبتاً کم سامان کی ضرورت پڑتی ہے۔ ہائیکنگ کے سامان کے لیے بیک پیک (کمر پر لٹکانے والا بیگ) ضروری ہے۔ کم سامان کی صورت میں کندھوں پر لٹکانے والا ہلکا ڈوری بیگ مناسب ہے۔ اُسے آپ ہاتھوں میں بھی اُٹھا سکتے ہیں اور بوقتِ ضرورت کندھوں پر لٹکا کر اَپنے ہاتھوں کو ٹریکنگ پولز پکڑنے کے لیے فارغ کر سکتے ہیں۔

سامان اگر زیادہ ہو، تو ہائیکنگ ڈے پیک بیگ یا الٹرا لائٹ ملٹی ڈے بیک پیک لیا جا سکتا ہے۔ مزید سامان میں پانی کی بوتل کم از کم ایک لٹر، کلائی کی گھڑی، دھوپ کا چشمہ، موٹے تلوے والے مضبوط جوگر یا پرفارمنس ایتھلیٹک فٹ ویئر، پی کیپ، ہیٹ یا کوئی اور ٹوپی، پھل یا کھانے کی چیزیں، ٹریکنگ پولز یا ہائیکنگ اسٹک، موبائل فون، جیبی چاقو، دستانے، چند سنی پلاست، نماز کے لیے مصلیٰ وغیرہ شامل ہیں۔

کئی ہائیکر ہاتھوں میں بیگ پکڑنا یا اُسے کندھوں پر لٹکانا پسند نہیں کرتے۔ وہ منرل واٹر کی ایک بوتل ہاتھ میں پکڑ کر ہائیکنگ کرتے ہیں۔ پلاسٹک کی خالی بوتل کوڑے والی ٹوکری میں پھینکنے کے بجائے راستے میں پھینک دیتے ہیں یا جیب میں اُنھوں نے کھانے پینے کی چیزیں چھپا کر رکھی ہوتی ہیں جن کے پلاسٹک کے ریپر یا کور، وہ لاپروائی سے نیشنل پارک میں پھینک دیتے ہیں۔ اکثر اوقات بلندی اور تیز ہوا کی وجہ سے پلاسٹک کا یہ کچرا نشیب یا بلندی میں ایسی جگہوں پر چلا جاتا ہے جہاں پر صفائی والے عملے کو نظر نہیں آتا یا پہنچنا بہت دشوار ہوتا ہے۔ اِس عمل سے نیشنل پارک کے ماحول، صفائی

اور جنگلی حیات کو نقصان پہنچتا ہے۔

ہائیکنگ کے لیے ڈوری بیگ یا ڈے پیک بیگ لے جانے کا فائدہ یہ بھی ہے کہ اس طرح آپ نیشنل پارک میں اپنی گندگی پھیلانے کے بجائے، اپنا کوڑا کرکٹ اپنے بیگ میں ڈال سکتے ہیں۔ پھر اُسے مقررہ کوڑے کے ڈرم میں ڈال یا واپس لا سکتے ہیں۔ اگر مارگلہ نیشنل پارک کو پلاسٹک سے پاک پارک بنانا ہے، تو ہائیکرز کے لیے ڈوری بیگ یا ڈے پیک بیگ لے جانا لازم ہونا چاہیے۔ اس طرح ''میرا کچرا، میری ذمے داری'' پر بخوبی عمل ہو سکے گا۔

ہائیکنگ کے خطرات اور حفاظتی اقدامات

ہائیکنگ کے عام خطرات میں پانی کی کمی، جسمانی درد، پٹھوں کا کھچاؤ، سن برن، سن اسٹروک، ٹخنوں کی موچ، پاؤں پھسل جانا، گرنے سے چوٹ آجانا یا ہڈیاں ٹوٹ جانا، پیروں اور گھٹنوں میں درد، حشرات، خاردار جھاڑیاں، خراب موسم، بلندیوں پر آسمانی بجلی گرنے کا خطرہ، دل کا دورہ، راستہ بھول جانا، رات کا اندھیرا، جنگلی جانور کا حملہ، بلندی کی بیماری وغیرہ شامل ہیں۔

ہائیکنگ کرنے سے پہلے انٹرنیٹ پر موسم کا حال دیکھیں اور اُس کے مطابق تیار ہو کر جائیں۔ بارش کے امکان کی صورت میں اپنے لباس اور راستے کے منصوبے پر نظرِ ثانی کریں اور چھتری یا رین کوٹ (برساتی) پاس رکھیں۔ شدید بارش اور طوفان کی صورت میں ہائیکنگ ملتوی کر دیں۔

ہائیکنگ یا کوئی اور بھی ورزش اچانک شروع نہیں کرنی چاہیے، کیونکہ یہ دل کے لیے خطرناک ہو سکتی ہے۔ کمزور افراد دل کا دورہ پڑنے سے مر بھی سکتے ہیں۔ اِس لیے اپنے جسم کو پہلے وارم اپ کریں۔ اِس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ جو بھی ورزش یا ہائیکنگ آپ نے کرنی ہے، اُسے آہستہ آہستہ شروع کریں تاکہ [illegible] جا سکے۔

اگر آپ پہلی بار یا طویل عرصے بعد ہائیکنگ کر رہے ہیں، تو ضروری ہے کہ ہائیکنگ آہستہ آہستہ شروع کر کے بڑھاتے جائیں تاکہ جسمانی درد، پٹھوں کے کھچاؤ وغیرہ کے مسائل سے محفوظ رہ سکیں۔ اِس کے لیے آپ کی کلائی کی گھڑی یا آپ کے موبائل فون کا الارم آپ کا بہترین رہنما ہو سکتا ہے۔

مثال کے طور پر، آپ چاہتے ہیں کہ آپ ایک گھنٹے سے زیادہ ہائیکنگ نہ کریں، تو آپ کو شروع کرنے کے آدھے گھنٹے بعد واپسی شروع کر دینی چاہیے، چاہے آپ جہاں تک بھی پہنچے ہوں۔ اگر آپ سات بجے صبح ہائیکنگ کا آغاز کرتے ہیں، تو ساڑھے سات بجے واپسی کا سفر شروع کرنے سے آٹھ بجے تک آپ واپس ٹریل کے مقامِ آغاز تک پہنچ جائیں گے۔ چند بار ایک گھنٹے کی ہائیکنگ کے بعد دورانیہ آہستہ آہستہ بڑھاتے جائیں، حتیٰ کہ آپ ٹریل کی چوٹی تک پہنچ کر واپس آنے کے قابل ہو جائیں۔

مارگلہ پہاڑیوں میں ہائیکنگ کے لیے، راولپنڈی اسلام آباد کے شہریوں کا ایک عام اصول یہ ہے کہ اگر آپ نے صبح سویرے ہائیکنگ شروع کی ہے، تو دوپہر بارہ بجے سے پہلے واپسی شروع کر دینی چاہیے تاکہ آپ اپنی ہائیکنگ کا نظام الاوقات اچھی طرح کنٹرول کر کے، بآسانی بروقت گھر واپس پہنچ سکیں۔

ایسا کرنا اِس لیے بھی ضروری ہے، کیونکہ اسلام آباد وائلڈ لائف مینجمنٹ بورڈ کی جاری کردہ ہدایات کے مطابق، مغرب سے آدھا گھنٹہ پہلے تمام ٹریل بند کر دیے جاتے ہیں۔ مارگلہ کی پہاڑیوں میں شام اور رات کے وقت، رات کو جاگنے والے جنگلی جانور خوراک کی تلاش میں نکل آتے ہیں جو ہائیکنگ کرنے والوں کے لیے خطرہ ثابت ہو سکتے ہیں۔

جن ٹریلز پر لوگ کم جاتے ہیں، وہاں تنگ راستے میں لٹکتے مکڑی کے جالے اور سر پر لٹکتی شاخوں اور جھاڑیوں سے

اپنے سر اور آنکھوں کو بچانے کے لیے پی کیپ یا ہیٹ کا استعمال کریں۔ پی کیپ تیز دھوپ میں چہرے اور آنکھوں کی حفاظت کرنے میں بھی مدد دیتی ہے۔ حشرات، جھاڑیوں اور دھوپ سے بچنے کے لیے پوری آستین والی قمیص پہنیں۔

اپنے بٹوے میں چند سنی پلاسٹ رکھیں جو کوئی حادثاتی چوٹ لگ جانے کی صورت میں کھلے زخم پر لگائے جا سکیں۔

اپنے ہائیکنگ کے اوقات کو موسم کے لحاظ سے تبدیل کریں۔ سردیوں کی دوپہر اور گرمیوں کی صبح کا وقت ہائیکنگ کے لیے منتخب کریں۔ ہائیکنگ کرنے سے پہلے (اور ساتھ ہی بعد میں)، سٹریچنگ ورزش آپ کو حرکت اور لچک کی ایک بڑی حد فراہم کرتی ہے۔ ہائیک کے بعد ہونے والے درد کی مقدار بھی کم کرتی ہے۔ ہائیکنگ اسٹریچز ورزش، ٹریلز پر محفوظ طریقے سے سفر کرنے کی کلید ہیں اور یہاں تک کہ چوٹ کو روکنے میں بھی مدد کر سکتی ہیں۔ مزید تفصیلات کے لیے گوگل اور یوٹیوب پر hiking stretching exercise تلاش کریں۔

یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ جس طرح روزہ رکھنے کے روحانی اور جسمانی فوائد ہیں، اِسی طرح نماز کے بھی بے شمار فائدے ہیں۔ نماز پڑھنے سے بنیادی مقصد رضائے الٰہی کے ساتھ آپ کو ایک اچھی سٹریچنگ حرکت بھی مل جاتی ہے۔ اسی لیے ٹریل ۳ اور ٹریل ۵ پر جہاں کافی زیادہ لوگ جاتے ہیں، نماز کی ادائیگی کے لیے باقاعدہ مصلے بنے ہوئے ہیں۔ باقی ٹریلوں پر جاتے وقت، آپ اپنے بیگ میں مصلیٰ لے جائیں تاکہ نماز کا وقت ہونے پر فریضے کی ادائیگی میں تاخیر نہ ہو۔

اپنے دونوں ہاتھوں میں دو عدد ٹریکنگ پولز یا ہائیکنگ سٹک ضرور استعمال کریں۔ ٹریکنگ پولز ہائیکنگ کا سامان ہے جو پیدل چلنے والوں کو اپنے تال میل کے ساتھ چلنے، استحکام فراہم کرنے اور کھردری جگہوں پر جوڑوں پر دباؤ کو کم کرنے کے لیے کام کرتا ہے۔ ٹریکنگ پولز کی لمبائی اپنے قد کے حساب سے ایڈجسٹ کریں۔ ہائیکنگ جسم کے زیریں حصے اور ٹانگوں کی ورزش ہے، لیکن ٹریکنگ پولز کے استعمال سے یہ جسم کے زیریں بالائی حصے اور بازوؤں ٹانگوں کی ورزش بن جاتی ہے۔ جسم کا وزن دونوں پیروں پر پڑنے کے بجائے چاروں ہاتھوں پیروں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔

اگر آپ کسی ٹریل پر جا رہے ہیں یا راستہ ٹھیک طرح سے یاد نہیں، تو ضروری ہے کہ جانے سے پہلے، آپ گوگل ارتھ یا گوگل میپس کو اچھی طرح دیکھ کر راستہ اور منزل ذہن نشین کر لیں۔ زیادہ بہتر ہو گا اگر نقشہ کاغذ پر بنا لیں یا گوگل میپس کو آف لائن ڈاؤن لوڈ کر لیں یا کوئی آف لائن میپ ایپ جیسا کہ maps.me استعمال کریں۔ اس کے علاوہ یوٹیوب پر مارگلہ ہلز کی ہر ٹریل کی ویڈیوز موجود ہیں۔ اجنبی ٹریل سے واقفیت پیدا کرنے کے لیے یہ ویڈیوز بھی دیکھی جا سکتی ہیں۔

مارگلہ کی پہاڑیوں میں راستہ بھول جانے کا خطرہ اُس وقت بہت زیادہ بڑھ جاتا ہے جب آپ پہلی دفعہ نئی ٹریل پر جا رہے ہوں اور دو مختلف راستے یعنی دوہرا راستہ (ڈبل پوائنٹ) یا تین راستے یعنی تہرے راستے (ٹرپل پوائنٹ) آپ کے سامنے آجائیں اور آپ نے ایک راستہ منتخب کرنا ہو۔ اِس عالم میں گوگل میپس یا گوگل ارتھ جی پی ایس پوزیشن کے ساتھ آپ کی بہت مدد کر سکتا ہے۔

رات کو سونے سے پہلے اپنے ہائیکنگ بیگ میں سب ضروری چیزیں جیسا کہ ٹریکنگ پولز، دھوپ کا چشمہ، پی کیپ، کھانے کی چیزیں وغیرہ ڈال لیں تاکہ صبح کچھ بھول نہ جائیں اور بروقت ہائیکنگ کے لیے نکل سکیں۔

مارگلہ کی پہاڑیاں ہائیکنگ کے لیے نسبتاً محفوظ مواقع فراہم کرتی ہیں۔ پاکستان کے بلند و بالا شمالی علاقہ جات جہاں برف گرتی ہے، وہاں برفانی تودوں، برف باری، گلیشیئرز، فراسٹ بائٹ اور ہائپوتھرمیا کی وجہ سے خطرات بڑھ جاتے

ہیں۔ زیادہ بلند پہاڑوں میں ایک اور خطرہ اُونچائی کی بیماری ہے۔ یہ عام طور پر ۲۵۰۰ میٹر (آٹھ ہزار فٹ) سے زیادہ بلندی پر پیش آتی ہے جہاں بلندی بڑھنے کے ساتھ ساتھ آکسیجن کم ہوتی جاتی ہے۔

اس حالت میں اچانک تیز جسمانی سرگرمی یا ہائیکنگ کرنے سے اونچائی کی بیماری لاحق ہوسکتی ہے جس کی علامات میں سر درد، متلی، قے، تھکاوٹ، کمزوری، چکر آنا، بے خوابی، ہاتھوں، پیروں اور چہرے کی سوجن، نکسیر اور تیز دل کی دھڑکن شامل ہیں۔ چونکہ مارگلہ کی پہاڑیوں کی بلندی ۱۶۰۴ میٹر یا ۵۲۶۲ فٹ (ٹلہ چارونی کی بلندی) سے زیادہ نہیں، اِس لیے یہاں اونچائی کی بیماری کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔

ہائیکنگ اور کھانا پینا

برداشت کے کھیلوں جیسے ہائیکنگ، سڑک پر سائیکل چلانا اور لمبی دوڑ کی صورت میں ”بونک“ اچانک تھکاوٹ اور توانائی کی کمی کی وہ حالت ہے جو جگر اور پٹھوں میں گلائیکوجن کے ذخیرے کی کمی کی وجہ سے ہوتی ہے۔ ہلکی سی بونک کا علاج مختصر آرام اور کاربوہائیڈریٹ پر مشتمل کھانے یا مشروبات کے استعمال سے کیا جا سکتا ہے۔ ہائیک سے پہلے آپ کو بھاری مرغن غذائیں نہیں کھانی چاہئیں۔

ہائیک سے پہلے کیا کھائیں؟

ہائیک سے ایک دن پہلے (اور ہائیک کے بعد شام کو بھی) ملٹی وٹامن اور منرل والی ایک گولی لے لیں۔ ہائیک والے دن باہر جانے سے کم از کم ایک گھنٹہ پہلے کھائیں تاکہ آپ اپنا کھانا صحیح طریقے سے ہضم کرسکیں۔ صبح کی ہائیکنگ سے ایک سے تین گھنٹے پہلے کاربوہائیڈریٹ سے بھرپور ناشتا کریں۔ آپ کے پٹھوں کے لیے اہم ایندھن نشاستہ دار غذاؤں سے آتا ہے۔ کاربوہائیڈیٹ، اناج (گندم، مکئی، چاول)، آلو اور اناج کے آٹے پر مبنی پراسیس شدہ [illegible]

جیسے روٹی، پیزا یا پاستا میں وافر مقدار میں پایا جاتا ہے۔

شوگر

انسانی خوراک میں بنیادی طور پر ٹیبل شوگر (سکروز، گنے سے نکالی گئی) لیکٹوز (دودھ میں وافر مقدار میں) گلوکوز اور فرکٹوز کے طور پر ظاہر ہوتی ہے۔ یہ دونوں قدرتی طور پر شہد، بہت سے پھلوں اور کچھ سبزیوں میں پائی جاتی ہیں۔ ٹیبل شوگر، دودھ، شہد، اکثر مشروبات اور بہت سے تیار شدہ کھانے جیسے جام، بسکٹ اور کیک میں شامل کیا جاتا ہے۔

حفاظتی ہدایات کے معلوماتی بورڈ

مارگلہ پہاڑیوں کی پگڈنڈیوں کے باہر اسلام آباد وائلڈ لائف مینجمنٹ بورڈ کی طرف سے ہائیکنگ کرنے والوں کی ذمے داریوں کے لیے حفاظتی ہدایات کے معلوماتی بورڈ لگائے گئے ہیں۔ ٹریل ۴ کے باہر مندرجہ ذیل حفاظتی ہدایات اردو اور انگریزی زبانوں میں مع علامات تحریر کی گئی ہیں:

۱۔ آرام کرنے کے لیے مختص جگہوں کے علاوہ مت رکیں۔
۲۔ بنے ہوئے راستے سے ہٹ کر نہ چلیں۔
۳۔ بہتر ہے آپ کے ساتھ اور لوگ بھی ہوں، خاص طور پر اُن راستوں پر جہاں لوگ کم جاتے ہیں۔
۴۔ گرم موسم میں ایک گھنٹے کے لیے کم از کم ایک لٹر پانی ساتھ رکھیں۔
۵۔ مضبوط جوتے اور ہیٹ (ٹوپی) پہنیں اور سورج سے بچاؤ والی کریم لگائیں۔
۶۔ گرم موسم میں دن کے سب سے ٹھنڈے وقت میں چلیں۔
۷۔ اگر آپ دل یا فشارِ خون کے مریض ہیں یا سانس کی تکلیف ہے، تو تیز ہرگز نہ چلیں۔
۸۔ قیمتی اشیا اپنے ساتھ لے جانے سے گریز کریں۔

آلو بھنڈی کا سالن

معصوم اور بھولی بھالی لڑکیوں کو اُلو بنانے والے ایک دغا باز خاندان کی چشم کشا کتھا

”شینا! میں تمہاری خالہ کے گھر جا رہی ہوں۔ ہنڈیا پکا لینا۔“ امی نے باہر جاتے ہوئے کہا۔

شینا جو ڈائجسٹ میں بری طرح غرق تھی، ایک دم چونکی لیکن اٹھنے کی زحمت پھر بھی گوارہ نہیں کی۔ آخر آدھے گھنٹے بعد ہیرو، ہیروئن کا ملن کروا کر ہی اٹھی۔ جا کر دروازہ بند کیا۔ پھر سُستی سے لاؤنج میں بیٹھ گئی۔

”امی ہنڈیا بنانے کا بول کر گئی ہیں۔ کیا بناؤں؟“ وہ سوچتے ہوئے فریج کی طرف بڑھی۔ کھول کر دیکھا، تو سامنے تھوڑی سی بھنڈیاں نظر آئیں۔ ”اتنی کم بھنڈیوں میں تو کچھ نہیں بنے گا۔“ کچھ تلاش کے بعد وہ آلو برآمد کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ ”اب اِسے پکاؤں کیسے؟“ اُس نے سر کھجاتے ہوئے سوچا۔ (ویسے بھی اُسے اتنی اچھی کوکنگ نہیں آتی تھی۔) ”نیٹ پر دیکھتی ہوں۔“ پورا نیٹ کھنگال ڈالا لیکن بھنڈی، آلو کی ترکیب کہیں نظر نہیں آئی۔

”کیا مصیبت ہے۔ آلو کا ہر ایک کے ساتھ جوڑ موجود ہے لیکن بیچاری بھنڈی کو تنہا چھوڑا ہوا ہے۔ اُس نے کیا قصور کیا ہے۔“ اُس نے سر پکڑ کر سوچا۔ آخر جیسے تیسے اُس نے سالن تیار کر لیا۔ تھک کر باورچی خانے سے نکلی ہی تھی کہ دروازہ بجنے کی آواز آئی۔

”اس وقت کون آ گیا۔“ سوچتے ہوئے اُس نے دروازہ کھول کر دیکھا، تو اُس کا ماموں زاد برہان کھڑا تھا۔

”کیا ہے؟ امی گھر پر نہیں ہیں۔“ شینا نے لٹھ مار انداز میں کہا اور دروازہ بند کرنے لگی۔

”ارے ارے! اندر تو آنے دو۔ بڑی خوشبوئیں آ رہی ہیں۔“ برہان اُسے ہٹاتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ سیدھا باورچی خانے میں جا کر پتیلے کا ڈھکن ہٹایا۔ پتیلے سے شوربے میں بڑی بڑی بھنڈیاں اور آلو تیر رہے تھے۔

”یہ کیا چیز ہے؟“ برہان نے پتیلے میں ایسے چمچ چلایا جیسے کشتی میں چپو چلایا جاتا ہے۔

”بھنڈی، آلو کا سالن!“ شینا نے بڑے فخر سے اپنا

توجہ فرمائیے

شمارہ مارچ میں زیرِ نظر کہانی جزانی کی غلطی کے باعث مکمل نہیں لگ سکی تھی جس پر ادارہ معذرت خواہ ہے۔ یہ کہانی اب ازسرِنو پیشِ خدمت ہے۔

کارنامہ بتایا۔

"ہیں! ہم نے تو کبھی اِس نام کا سالن نہیں کھایا۔" برہان نے ناک چڑھا کر کہا۔

"نہیں کھایا، تو میں کیا کروں۔ جاؤ یہاں سے۔" شینا نے اُسے باہر دھکیلتے ہوئے کہا۔

"جا رہا ہوں۔ دھکے کیوں دے رہی ہو۔" برہان نے باہر جاتے ہوئے کہا۔ پھر پلٹ کر اُسے منہ چڑایا اور بھاگ گیا۔ شینا نے غصّے سے اُسے دیکھا پھر زور سے دروازہ بند کر دیا۔

امی خالہ کے گھر سے آئیں، تو شینا نے اُنھیں پانی پلایا۔

"خالہ کے گھر سب ٹھیک تھا۔ مریم وغیرہ کیسی ہیں۔" شینا نے امی کی چادر طے کرتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں! سب ٹھیک ہیں۔ مریم کا ایک اچھا رشتہ آیا ہوا ہے۔ سلطانہ کہہ رہی تھی لڑکے والے جلدی شادی کا کہہ رہے ہیں۔ منگنی کے چکر میں نہیں پڑوں گی، ڈائریکٹ شادی کر دوں گی۔"

امی نے بتایا پھر آرام کرنے لیٹ گئیں اور پوچھا "کچھ پکایا بھی ہے یا اُن موئے رسالوں میں اپنا دماغ کھپاتی رہی ہو؟"

"جی امی! پکایا ہے۔" شینا نے آگے بڑھ کر جوش سے کہا۔ "آلو بھنڈی کا سالن!"

"شینا! کوئی کام ڈھنگ سے بھی کرنا آتا ہے تمھیں۔ یہ بھنڈی کے ساتھ آلو کون پکاتا ہے۔" امی نے غصّے سے کہا۔ شینا نے وہاں سے کھسک جانے ہی میں عافیت جانی اور غڑاپ سے کمرے میں گھس گئی۔

شینا کے ابو بچپن ہی میں وفات پا گئے تھے۔ اُن کے گزر بسر کے لیے دو دُکانیں کرائے پر چڑھی ہوئی تھیں۔ مکان اپنا تھا جس کا آدھا حصّہ بھی کرائے پر دیا ہوا تھا۔ اُن کا گزارا آرام سے ہو جاتا تھا۔ شینا کے دو بہن، بھائی اسکول میں زیرِ تعلیم تھے۔ خود وُہ مقامی کالج میں بی ایس سی کی طالبہ تھی۔

اِسی شہر میں اُس کے ماموں اور خالہ بھی رہتے تھے۔ ماموں کے دو بیٹے، برہان اور سلمان تھے اور خالہ کے تین بچے تھے۔ ثمن آپی اور کمال بھائی شادی شدہ تھے۔ تیسری بچی، مریم کی عنقریب شادی ہونے والی تھی۔ ماموں کا گھر قریب ہی تھا، اِسی لیے برہان ہر دوسرے دن آ دھمکتا۔

سلمٰی مامی شروع سے ملازمت کرتی تھیں۔ جب برہان، سلمان چھوٹے تھے، تو ایک محلے میں رہنے کی وجہ سے زیادہ تر پھوپھی کے گھر ہی رہا کرتے۔ اِس لیے دونوں بھائیوں، خاص طور پر برہان کو اَپنی پھوپھی سے بہت لگاؤ تھا۔ پھوپھی بھی اُن پر جان چھڑکتی تھیں۔ ماموں جان کی شروع سے یہ خواہش تھی کہ بھانجی کو اَپنی بہو بنائیں۔ تسلیم بیگم بھی اِس رشتے پر دل و جان سے تیار تھیں۔ برہان سے بہتر داماد اُنھیں کہاں ملتا۔ بچپن سے دیکھا بھالا۔ لیکن شینا کو برہان سے ازلی بیر تھا۔ بچپن میں جب برہان شینا کے گھر آتا تھا، تو اَپنی شرارتی طبیعت کی وجہ سے شینا کو بہت تنگ کرتا۔ اُس کی پونی کھینچتا، اُس کی گڑیا چھپا دیتا لیکن تسلیم بیگم کو بھتیجے کی کوئی بات بری نہ لگتی۔ شینا کو بھول کر وہ بھتیجوں کی خاطر مدارت میں لگ جاتیں۔ شینا چڑ کر رونے لگتی۔ بڑے ہونے پر بھی یہ چڑ برقرار رَہی۔

شینا صحن کی صفائی کر رہی تھی کہ اُس کی دوست ردا آ گئی۔ جلدی جلدی صفائی مکمل کر کے وہ اُسے کمرے میں لے آئی۔

"اور! کیا ہو رَہا ہے آج کل؟" شینا اُس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی۔

"کچھ نہیں یار! بہت بوریت ہو رَہی ہے۔ اِسی لیے تو تمہارے پاس آئی تھی کہ تم سے کچھ مشورہ کروں۔" ردا نے کہا۔

"کیا مشورہ؟"

"میں سوچ رہی تھی کہ کیوں نہ ہم کوئی کورس کر لیں کیونکہ امتحان میں تو ابھی کافی وقت ہے۔"

"کون سا کورس؟" شینا نے اُس کی بات میں دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

"کورس تو کئی طرح کے ہوتے ہیں۔ کمپیوٹر کورس، انگلش لینگویج کورس، شارٹ ہینڈ کورس وغیرہ وغیرہ۔" شینا نے انگلیوں پر گنواتے ہوئے کہا۔

"یار! میں چاہ رَہی تھی کہ ہم کمپیوٹر کورس کر لیں۔ اِس کی آج کل مانگ بھی بہت ہے۔"

اتنے میں شینا کی بہن مینا چائے کی ٹرے لے کر کمرے میں داخل ہوئی۔ چائے کے ساتھ بسکٹ، سموسے، پکوڑے اور اِملی والی چٹنی بھی تھی۔ ردا، مینا کو دیکھ کر خوش ہو گئی اور سموسوں سے انصاف کرنے لگی۔

"تم سے تو اچھی تمہاری بہن ہے۔ اتنی دیر سے باتیں مٹھار رَہی ہو۔ یہ نہیں کہ چائے کا ہی پوچھ لو۔" ردا نے سُوں سُوں کرتے ہوئے ٹشو سے ناک رگڑی۔

"تم موقع دو گی، تو جاؤں گی نہ چائے بنانے۔ اتنی دیر سے باتوں میں الجھا رکھا ہے۔" شینا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ارے باتوں سے یاد آیا۔ ہم کیا بات کر رہے تھے۔" ردا نے چائے پیتے ہوئے پوچھا۔

"کمپیوٹر کورس کی بات!"

"ہاں یاد آیا۔" ردا نے چٹکی بجائی۔

"لیکن امی سے اجازت کون لے گا۔ وہ ہرگز اجازت نہیں دیں گی۔ ویسے بھی وہ ہر وقت گھرداری سیکھنے پر زور دَیتی رہتی ہیں۔" شینا مایوسی سے بولی۔

"ارے آنٹی کی تم فکر مت کرو، مَیں منا لوں گی اُنھیں۔"

ردا کو اَپنی صلاحیتوں پر پورا بھروسا تھا۔ (جو اِتنا غلط بھی نہ تھا۔) چائے پی کر وہ تسلیم بیگم کے پاس بیٹھ گئی اور اُنھیں قائل کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ وہی ہوا جس کا شینا کو ڈر تھا۔ امی نے سنتے ہی صاف انکار کر دیا اور کہا:

"کورس کرنا ہی ہے، تو کوئی گھرداری والا کورس کرو تا کہ آگے جا کر کام بھی آئے۔ اِس موئے کمپیوٹر کورس کا کیا اچار ڈالنا ہے۔" امی نے تنک کے کہا۔

"ارے آنٹی! گھرداری بھی سیکھ لے گی۔ بس چند مہینوں کی تو بات ہے۔ مہربانی کر کے آپ اجازت دے دیں۔" ردا نے اُن کے پاؤں دباتے ہوئے کہا۔

امی کا دل نرم پڑ گیا اور کچھ شینا کی رونی صورت دیکھ کر رحم آ گیا۔ "اچھا چلو تم اتنا اصرار کر رَہی ہو، تو اجازت دے دیتی ہوں لیکن ساتھ ساتھ اِس نے گھرداری بھی سیکھنی ہے۔" امی کی سوئی گھرداری پر ہی اٹکی ہوئی تھی۔

"جی جی آنٹی ضرور!" ردا نے خوشی سے بھرپور آواز میں کہا اور شینا کو دیکھ کر فتح کا نشان بنایا۔

کورس شروع ہونے کے بعد شینا، ردا دونوں مصروف ہو گئیں۔ صبح کالج اور شام کو کمپیوٹر کورس۔ واپسی پر اتنی تھکن ہو جاتی کہ کچھ کرنے کی ہمت ہی نہیں ہوتی تھی۔ لیکن چونکہ اُس نے امی سے گھرداری سیکھنے کا وعدہ کیا تھا، اِس لیے وہ باورچی خانے میں اُن کا کچھ ہاتھ بھی بٹا دیتی۔ شینا کی چھوٹی بہن مینا میٹرک کی طالبہ تھی۔ اُسے شروع ہی سے گھر کے کام کاج میں شینا کی نسبت کافی دلچسپی تھی۔ اسکول سے آ کر وہ اَمی کا باورچی خانے میں ہاتھ بھی بٹاتی تھی۔ شام کو محلے کے بچوں کے ساتھ ساتھ اپنے چھوٹے بھائی کو بھی ٹیوشن دیتی تھی۔ اِسی لیے وہ اَمی کو زیادہ پسند تھی۔

ایسے ہی بے کیف دنوں میں شینا کی فیصل آباد والی پھوپھی کی آمد نے ہلچل مچا دی۔ یہ وہ پھوپھی تھیں جنھوں نے شینا کے والد کے انتقال کے بعد اُنھیں مڑ کر نہیں دیکھا تھا۔ اب اتنے برسوں بعد جب یہ بچے جوانی کی سرحد پر کھڑے تھے، تو نہ جانے کیسے پھوپھی کو اِن کی یاد آ گئی۔ درمیان کا یہ

وقت تسلیم بیگم نے کیسے گزارا، یہ وہی جانتی تھیں یا اُن کا اللہ۔ (کسی نے سچ کہا ہے کہ انسان پر برا وقت نہ آئے، تو کیسے اپنوں میں چھپے غیر اور غیروں میں چھپے اپنے نظر آئیں۔) لیکن تسلیم بیگم نے پچھلی تمام باتیں بھلا کر عرصے بعد آئی نند کا کھلے دل سے استقبال کیا اور اُن کی خاطر مدارت میں لگ گئیں۔

ارسلہ پھپھو کا بڑا بیٹا ارسلان عرصے سے کینیڈا میں مقیم تھا۔ اپنی پڑھائی مکمل کرنے کے بعد اب وہاں ملازمت کر رہا تھا۔ چھوٹا بیٹا فاران انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ اُسی کے ساتھ پھپھو آئی تھیں۔ اُن کے آنے کے اگلے ہی دن یہ عقدہ بھی کھل گیا کہ اتنے عرصے بعد اُن کی آمد کا مقصد کیا ہے۔ اُنھوں نے بڑے بیٹے کے لیے شینا کا ہاتھ مانگا تھا۔

حالانکہ شینا اور ارسلان کی عمروں میں تقریباً بارہ سال کا فرق تھا۔ بظاہر تو اس رشتے میں کوئی قباحت نہیں تھی لیکن تسلیم بیگم کا دل کسی طرح آمادہ نہیں ہو رہا تھا۔ اُن کی دلی خواہش برہان کو داماد بنانے کی تھی۔ بھائی نے ہمیشہ آڑے وقت میں اُن کا ساتھ دیا تھا۔ وہ صاف انکار کرنا چاہتی تھیں لیکن شینا کو جب اس رشتے کا پتا چلا، تو وہ خوشی سے جھوم اُٹھی۔

اُسے شروع ہی سے باہر جانے کا شوق تھا۔ جب قسمت اُسے موقع دے رہی تھی، تو وہ کیوں کفرانِ نعمت کرتی۔ اُس نے تسلیم بیگم پر اس رشتے کو 'ہاں' کہنے پر زور دیا۔ اُنھوں نے بہت سمجھانے کی کوشش کی مگر شینا کے مسلسل اصرار پر وہ بجھ کے رہ گئیں لیکن یہاں کسے پروا تھی۔ ویسے بھی اُسے برہان میں کوئی دلچسپی نہیں تھی بلکہ ایک قسم کی چڑ تھی۔ (ہوتے ہیں نہ کچھ ایسے لوگ جن سے خواہ مخواہ چڑ ہو جاتی ہے۔) حالانکہ برہان میں کوئی خامی نہیں تھی بلکہ وہ ایک تعلیم یافتہ نوجوان تھا۔ حال ہی میں اُس نے ایک اعلیٰ کمپنی میں ملازمت شروع کی تھی۔ شینا اپنی ماں سے فوراً ہاں کروانا چاہتی تھی لیکن تسلیم بیگم نے سوچنے کے لیے کچھ وقت مانگنا چاہا۔ ارسلہ بیگم تو لگتا تھا کہ ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو کر آئی ہیں۔ اُن سے ہاں کروا کر ہی دم لیا اور فوراً اپنی انگوٹھی اتار کر شینا کو پہنا دی۔ دو مہینے بعد بارات لانے کا اعلان کر دیا۔ اُن کی بات سن کر تسلیم بیگم گھبرا گئیں۔

''ارے آپا! اتنی جلدی میں شادی کی تیاری کیسے کروں گی؟ کچھ تو مہلت دیں۔''

لیکن ارسلہ بیگم کے اطمینان میں کوئی فرق نہیں آیا۔

''ارے بھابی بیگم تیاری کیسی؟ گھر کی ہی تو بات ہے۔ ویسے بھی ارسلان نے کچھ بھی لینے سے سختی سے منع کیا ہے۔ اس لیے جہیز کی خاطر آپ پریشان نہ ہوں۔ ویسے بھی شینا نے کون سا یہاں رہنا ہے۔ باہر ہی چلے جانا ہے۔'' اُنھوں نے تسلیم بیگم کی ہر دلیل کو ہوا میں اڑا دیا۔ شینا کے ہاتھ میں کچھ پیسے دے کر وہ واپس روانہ ہو گئیں۔ شینا تو جیسے ہواؤں میں اڑ رہی تھی۔ اُسے اپنی قسمت پر رشک آ رہا تھا۔ گھر میں مگر اس رشتے سے کوئی خوش نہیں تھا۔ بینا اور طارق بھی چپ چپ سے تھے لیکن شینا کو کوئی پروا نہیں تھی۔

دوسرے دن شینا نے کالج میں ردا کو جب یہ خوشخبری سنائی، تو وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئی۔

''کیا ہوا ردا! تمھیں خوشی نہیں ہوئی؟'' شینا نے ردا کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

''نہیں یہ بات نہیں۔ تمھاری زندگی کی اتنی بڑی خوشی ہے۔ میں خوش کیوں نہیں ہوں گی لیکن تم نے اس رشتے کے لیے 'ہاں' کرنے میں کچھ زیادہ ہی جلدی نہیں دکھائی۔'' ردا نے پوچھا۔

''جلدی کیسی! میری پھپھو کا بیٹا ہے۔ کینیڈا میں سیٹ ہے اور کیا چاہیے۔'' شینا نے کندھے اچکا کر کہا۔

''بس یہی معیار ہے جیون ساتھی کے بارے میں تمھارا۔'' ردا نے اُسے ملامتی آنکھوں سے دیکھا جسے شینا نے نظر انداز کر دیا۔ (آج کل وہ کچھ اور ہی ہواؤں میں تھی۔)

''اور وہ برہان، اُس کا کیا ہوگا؟ اتنا پسند کرتا ہے تمھیں۔''

''اُس کا یہاں کیا ذکر؟'' شینا نے ناگواری سے کہا۔

''اُسی کا تو ذکر ہونا چاہیے۔ ہمیشہ اُس کی نظروں میں تمھارے لیے پسندیدگی دیکھی ہے میں نے اور تمھاری امی کی بھی ہمیشہ سے یہی خواہش رہی ہے۔ مجھے تو حیرت ہے وہ اتنی آسانی سے مان کیسے گئیں۔''

''وہ کب مان رہی تھیں، زبردستی منوایا ہے میں نے۔'' شینا کے منہ سے سچ نکل ہی گیا۔

ردا نے یہ سُن کر اپنا سر پیٹ لیا۔ ''کتنی بے وقوف ہو تم۔ ایک ایسے شخص کو برہان پر ترجیح دے رہی ہو جسے ایک مدت سے تم نے دیکھا ہی نہیں۔ وہ کیسا ہے؟ کیا عادات ہیں اُس کی؟ صحت کیسی ہے؟ اور کیا معلوم اُس نے وہاں شادی کر رکھی ہو۔'' ردا نے اُسے احساس دلانا چاہا۔

''اللہ نہ کرے! کیسی دوست ہو تم؟ کم از کم بددعائیں تو نہیں دو۔'' شینا نے غصے سے اُسے گھورا۔

''دوست ہوں جبھی صحیح راستہ دکھانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ ہر چمکتی چیز سونا نہیں ہوتی۔ برہان اور تم ایک ساتھ پلے بڑھے ہو۔ اُس کی ہر اچھی، بری عادت سے تم واقف ہو۔ اُس کا مستقبل بھی بہت روشن ہے۔'' ردا نے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''اچھا بابا! اب یہ برہان نامہ بند کرو۔ مجھے زور سے بھوک لگی ہے۔ کینٹین چلتے ہیں۔'' شینا نے ردا کو اُٹھاتے ہوئے کہا۔ ردا بھی مردہ دلی سے شینا کے ساتھ اُٹھ گئی۔ وہ سمجھ گئی کہ شینا کو کچھ سمجھانا بیکار ہے۔ (ہوتے ہیں کچھ لوگ جو ٹھوکر کھا کر ہی سنبھلتے ہیں۔) اللہ نہ کرے کہ شینا کے ساتھ کچھ برا ہو۔ وہ ایک مخلص دوست کی طرح سوچتے ہوئے اُس کے ساتھ چل پڑی۔

☆☆

شینا کی خالہ زاد بہن مریم کی شادی تھی۔ مایوں کی رسم تو گھر ہی پر ہو گئی تھی۔ آج شادی کی تقریب میں ردا کی فیملی بھی آئی تھی۔ ردا کی امی سے خالہ کی پرانی جان پہچان تھی۔ مقررہ وقت پر سب شادی ہال پہنچے۔ سب مہمان آ چکے تھے۔ دلہا، دلہن کے ساتھ سب کے گروپ فوٹو بن رہے تھے۔ شینا کے گھر والوں نے بھی گروپ فوٹو بنوایا۔ اتنے میں ردا آتی دکھائی دی۔ شینا، ردا کا ہاتھ پکڑ کر اپنی کزنز سے ملوانے لگی۔ ماموں کی فیملی بھی آ چکی تھی۔ ماموں نے شینا کے سر پر ہاتھ رکھ کر ڈھیروں دعاؤں سے نوازا۔ مامی بھی اچھی طرح سے ملیں۔ اُن کے رویّے سے کسی قسم کی ناراضگی ظاہر نہیں ہو رہی تھی۔ بلاشبہ وہ بڑے ظرف کے مالک تھے۔

تھوڑی دیر بعد کھانا کھل گیا۔ شینا اپنی پلیٹ میں کھانا نکال کر پلٹی، تو اُسے اپنے سامنے برہان نظر آیا۔ شینا اُسے نظر انداز کر کے ردا کے پاس بیٹھ گئی۔ دونوں کھانا کھاتے ہوئے باتیں کرنے لگیں۔ تھوڑی دیر بعد برہان بھی شینا کے سامنے ایک خالی کرسی پر آ کر بیٹھ گیا۔ ردا نے اُسے دیکھ کر گرم جوشی سے سلام کیا جس کا برہان نے خوش دلی سے جواب دیا۔ ردا نے محسوس کیا کہ برہان شینا سے کوئی بات کرنا چاہتا ہے۔ ردا کھانا نکالنے کے بہانے وہاں سے اُٹھ گئی۔ شینا برہان سے نظریں چرا کر چمچ سے چاول اِدھر اُدھر کرنے لگی۔

''شینا! یہ تم نے اچھا نہیں کیا میرے ساتھ۔'' برہان نے شکوہ بھری نظروں سے شینا کو دیکھا۔

''کیا اچھا نہیں کیا؟ ہر انسان کو اپنا مستقبل بہتر بنانے کا حق ہے۔'' شینا نے سردمہری سے جواب دیا۔

''تھوڑا تو انتظار کیا ہوتا۔ میں تمھاری مرضی کے مطابق لائف اسٹائل دینے کی کوشش کرتا۔'' برہان نے غمگین لہجے

''کیا مصیبت ہے۔ آلو کا ہر ایک کے ساتھ جوڑ موجود ہے لیکن بیچاری بھنڈی کو تنہا چھوڑا ہوا ہے۔ اُس نے کیا قصور کیا ہے۔''

میں کہا۔

"اب اِن باتوں کا کوئی فائدہ نہیں۔ بہتر ہے کہ ہم اپنی اپنی زندگیوں میں آگے بڑھ جائیں۔" شینا وہاں سے اٹھ گئی اور رِدا کو تلاش کرنے لگی۔ برہان بھی مایوسی سے آگے بڑھ گیا۔

جُوں جوں شادی کے دن قریب آ رہے تھے تسلیم بیگم کے ہاتھ، پیر پھول رہے تھے۔ کیا تیاری کریں اور کیا نہ کریں۔ آخر اتنی امیر کبیر نند کو بیٹی دینے جا رہی تھیں۔ حالانکہ اُنھوں نے کچھ بھی لینے سے منع کیا تھا لیکن اپنی حیثیت کے مطابق تیاری تو کرنی تھی۔ ارسلہ بیگم نے بری کی خریداری کے لیے ایک خطیر رقم بھجوائی تھی تاکہ شینا اپنی پسند سے شادی کی خریداری کر سکے۔ شینا روز ہی خریداری کرنے نکل جاتی۔ ساتھ ہی رِدا کو بھی گھسیٹ لیتی۔ آج بھی شام ڈھلے بازار سے یہ لوگ لوٹی تھیں۔ ابھی آرام کرنے بیٹھی ہی تھیں کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ "اِس وقت کون آ گیا۔ شینا ذرا دیکھنا۔" تسلیم بیگم نے پانی پیتے ہوئے کہا۔

شینا کے دونوں بہن بھائی اُس وقت کوچنگ گئے ہوئے تھے۔ شینا نے جا کر دروازہ کھولا، تو ایک ادھیڑ عمر آدمی کو کھڑا پایا۔ "نواز صاحب کا گھر یہی ہے؟" اُن صاحب نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"جی! لیکن آپ کون ہیں؟" شینا نے اُنھیں پہچاننے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"شینا! کون آیا ہے؟" اُس کی امی نے اندر سے پکار کر پوچھا۔

"بیٹا! مَیں آپ کے ابو کا دوست ہوں۔" اُن صاحب نے اپنا تعارف کروایا۔ اتنی دیر میں تسلیم بیگم بھی دروازے پر آ گئی تھیں اور اُنھیں پہچان کر ڈرائنگ روم میں لے گئیں۔

ارشاد صاحب، نواز درانی (شینا کے ابو) کے بچپن کے دوست تھے۔ وہ طویل مدت سے کینیڈا میں مقیم تھے۔ آج کل کچھ عرصے کے لیے پاکستان آئے ہوئے تھے۔ چونکہ انتقال کے وقت وہ یہاں موجود نہ تھے، اِس لیے اُنھوں نے سوچا کہ تعزیت کے ساتھ ساتھ دوست کے گھر والوں کا حال چال بھی معلوم کر لیں۔ شینا جلدی سے چائے بنا کر لے آئی۔ چائے پیتے ہوئے وہ شینا سے اُس کی پڑھائی کے متعلق پوچھنے لگے۔

تسلیم بیگم نے اُنھیں بتایا کہ شینا کا رشتہ اُنھوں نے اپنی نند کے بیٹے سے طے کر دیا ہے۔ ساتھ ہی شادی میں شرکت کی دعوت بھی دے دی۔ ارشاد صاحب نواز درانی کے پورے خاندان سے واقف تھے، اِس لیے پوچھنے لگے۔

"ارسلہ کے کون سے بیٹے سے شینا کی بات طے کی ہے آپ نے؟ میرے خیال سے چھوٹے بیٹے فاران سے طے کی ہوگی۔"

"ارے نہیں بھائی صاحب! بڑے ارسلان سے جو کینیڈا میں رہتا ہے اور ماشاء اللہ اپنا کاروبار سنبھال رہا ہے۔"

"کیا! ارسلان سے؟" ارشاد صاحب نے چائے کا کپ میز پر رکھا اور پریشانی سے کہا۔ "کیا کہہ رہی ہیں آپ؟ وہ تو شادی شدہ اور دو بچوں کا باپ ہے۔"

تسلیم بیگم کی سماعتوں پر اُن کی آواز بم بن کر گری۔ شینا بھی اپنی جگہ منجمد ہو گئی۔ پل بھر میں اُس کی آنکھوں میں سجے خواب خزاں رسیدہ پتوں کی مانند بکھر گئے۔ ابھی تو بہاروں کے قافلے کے ساتھ قدم ملا کر اُس نے چلنا سیکھا تھا۔ ایک دم غم کی کیسی آندھی چلی کہ ہر طرف اندھیرا چھا گیا اور خزاں نے اُسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ وہ ٹرانس کی کیفیت میں اُٹھی اور اپنے آپ کو کمرے میں بند کر لیا۔

اِدھر ارشاد صاحب تسلیم بیگم کو بتا رہے تھے کہ کینیڈا میں اُن کا بیٹا اور اَرسلان ایک ہی یونیورسٹی سے پڑھے ہیں۔ آپس میں دوست بھی ہیں۔ ارسلان نے تو چھ، سات سال پہلے شہریت کے لیے وہاں شادی کر لی تھی۔ ارشاد صاحب کے بیٹے شیراز کو کچھ عرصے پہلے ہی ارسلان نے بتایا تھا کہ میری امی چاہتی ہیں، مَیں پاکستان میں رہوں اور وہیں شادی کروں۔ مَیں یہ سب کیسے کر سکتا ہوں؟ مَیں یہاں پر سیٹ ہوں۔ یہاں بیوی، بچے ہیں میرے۔ لیکن جب ارسلہ بیگم نے بہت بلیک میل کیا، تو ارسلان مجبور ہو گیا اور اپنی امی کا دل رکھنے کے لیے اِس شادی پر رضامند ہو گیا۔ اُس وقت شیراز نے اُسے کافی سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ کسی لڑکی کی زندگی محض اپنی امی کو خوش کرنے کے لیے برباد نہ کرے۔ کیونکہ اپنی دوسری بیگم کو کینیڈا لانے کا اُس کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وہ اُسے اپنی امی کے پاس چھوڑ کر خود باہر اپنے بیوی، بچوں کے ساتھ رہنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ ارشاد صاحب ہرگز نہیں جانتے تھے کہ ارسلان کی پاکستان میں جس لڑکی سے شادی ہو رہی ہے وہ اُن کے مرحوم دوست کی بیٹی ہوگی۔

تسلیم بیگم بے آواز رو رہی تھیں۔ ارشاد صاحب نے اُنھیں تسلی دی اور اَپنے ہر ممکن تعاون کا یقین دلایا۔

☆☆

سجی سجائی سیج پر شینا دلہن بنی بیٹھی تھی۔ گلاب اور موتیے کی خوشبو سے پورا کمرا مہک رہا تھا۔ آہٹ پر اُس کا دل دھڑک اٹھا۔ کوئی خاموشی سے اُس کے پاس آ کر بیٹھ گیا اور اُس کے مہندی لگے ہاتھ تھام کر حنا کی خوشبو کو اَپنے اندر اُتارا۔

"مجھے یقین نہیں آ رہا کہ تم میری ہو گئی ہو۔ یہ سب ایک خواب کی مانند لگ رہا ہے۔" برہان نے مخمور لہجے میں کہتے ہوئے اُس کا گھونگھٹ اٹھایا اور اُس کا چہرہ اُوپر کیا۔ شینا نظر لگنے کی حد تک حسین لگ رہی تھی۔ آج اُس پر ٹوٹ کر روپ آیا تھا۔ شینا نے نظریں اٹھا کر برہان کو دیکھا۔ پھر شرمندگی سے چہرہ جھکا لیا۔

"برہان! مَیں آپ سے بہت شرمندہ ہوں۔ پلیز مجھے معاف کر دیں۔" شینا نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

"کچھ مت کہو۔ گزری ہوئی باتیں بھول جاؤ۔ تم میرے نصیب کا چاند تھیں پھر کیسے اِس چاند کی روشنی کسی اور آنگن میں اترتی۔" برہان نے اُس کی زلفوں سے کھیلتے ہوئے کہا۔ "اچھا میری ایک بات مانو گی؟"

"جی بولیں۔"

"میرے لیے پھر ویسا ہی بھنڈی، آلو کا سالن بناؤ گی۔" برہان نے شرارتی نظروں سے شینا کو دیکھتے ہوئے کہا۔

شینا نے اُسے گھور کر دیکھا۔ پھر دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ باہر چاندنی چٹکی ہوئی تھی۔ سرور سی البیلی ہوا کے ٹھنڈے جھونکے نہایت فرحت بخش لگ رہے تھے۔ کائنات کا تمام حسن اِس ایک کمرے میں سمٹ آیا۔

آپ دیکھتے ہیں

شیخ ناسخ ایک دن اپنے خانہ باغ کے بنگلے میں بیٹھے تھے اور فکرِ مضموں میں غرق تھے۔ ایک شخص آ کر بیٹھا۔ اُن کی طبیعت پریشان ہوئی۔ اٹھ کر ٹہلنے لگے کہ یہ اٹھ جائیں۔ ناچار پھر آ بیٹھے، مگر وہ نہ اُٹھے۔ کسی ضرورت کے بہانے پھر گئے کہ یہ سمجھ جائیں گے۔ وہ پھر بھی نہ سمجھے۔ اِنھوں نے چلم میں سے چنگاری اٹھا کر بنگلے کی ٹٹی میں رکھ دی اور آپ لکھنے لگے۔ ٹٹی جلنی شروع ہوئی۔ وہ شخص گھبرا کر اٹھا اور کہا:

"شیخ صاحب! آپ دیکھتے ہیں، یہ کیا ہو رہا ہے؟"

اِنھوں نے اُن کا ہاتھ پکڑ لیا کہ جاتے کہاں ہو؟ اب تو مجھے اور تمھیں جل کر راکھ کا ڈھیر ہوتا ہے۔ تم نے میرے مضامین کو خاک میں ملایا ہے، میرے دل کو جلا کر خاک کیا ہے، اب کیا تمھیں جانے دوں گا؟

علامہ نیاز فتح پوری

روما کا انوکھا بادشاہ
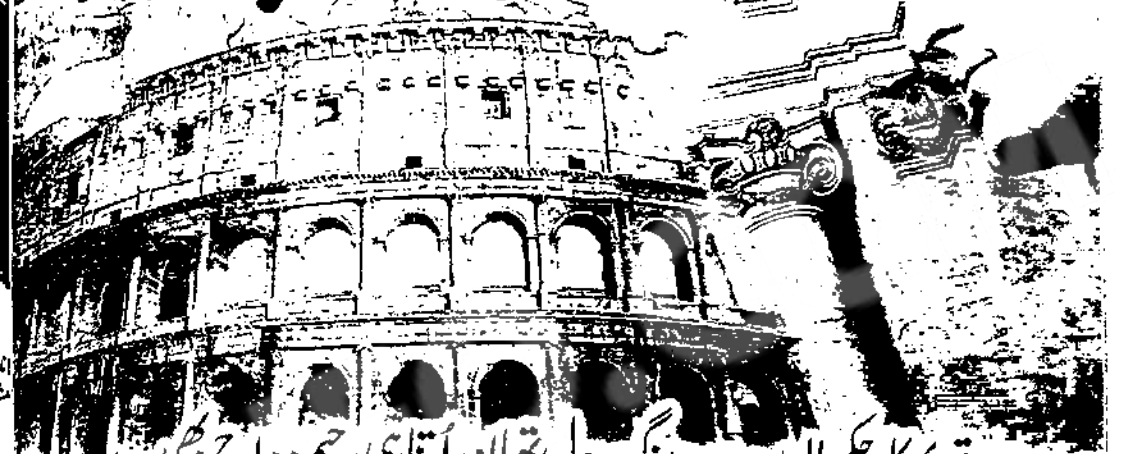
دورِ قدیم کا یہ حکمران حد درجہ سنگ دل تھا اور اُتنا ہی رحیم مزاج بھی.....

آگ، آگ، آگ.....!!

یہی ایک کلمہ تھا جو ہزاروں خشک زبانوں پر جاری رُوما کے گوشے گوشے میں گونج رہا تھا۔ لوگوں کے حلق میں کانٹے پڑ گئے تھے۔ لب ہلانے کی بھی طاقت اُن میں باقی نہ تھی لیکن اب بھی ایک خشک چیخ کی صورت میں جو آواز پیدا ہوتی، وہ یہی تھی کہ آگ، آگ!!

کامل تین گھنٹے آتشزدگی کو ہو چکے تھے۔ لوگوں کے ہنگامے و اِضطراب، شور و شیون کا یہ عالم تھا، گویا کرۂ زمین کا دل دھڑک رہا تھا اور نہیں کہا جا سکتا کہ کس وقت باہر نکل پڑے۔

آگ نے شہر کے تمام مکانوں اور معبدوں کو اندر باہر چاروں طرف سے گھیر لیا اور دُھوئیں کے بادلوں سے جولال لال شعلے بلند ہو کر نمودار ہو رہے تھے، تو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا پہاڑ سے خون کے فوارے چھوٹ رہے ہیں۔ ''رگِ سنگ'' کا ہر ہر شرارہ لہو میں تبدیل ہو گیا ہے۔

مکانوں کی چھتیں عجیب و غریب دھماکوں کی آوازوں سے گر رہی تھیں۔ بچوں، بوڑھوں اور عورتوں کی چیخیں مل کر ایسا ہیبت ناک منظر پیش کر رہی تھیں کہ اُسے کوئی صبر و سکون سے دیکھ ہی نہ سکتا تھا۔ شہر کے معابد اور وہاں کے قیمتی سامان، ہیکلوں کی قربان گاہیں اور وہاں کے مقدس ہدایا سب آگ کی نذر ہو چکے تھے اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ آسمان و زمین کے سب سے بڑے دیو کے سامنے آج سب سے بڑی قربانی پیش کی جا رہی ہے۔

ٹھیک یہی وقت تھا کہ نیرو، روما کا شہنشاہِ اعظم، قصر کے اندر سے مسکراتا ہوا، اٹھکیلیاں کرتا برآمد ہوا۔ سیکڑوں خدام مشعلیں لیے ہوئے اُس کے آگے آگے تھے اور اُمرائے دربار زرق برق لباسوں کے ساتھ اُس کے جلو میں۔ اُس کی آنکھوں میں مسرت کی چمک تھی اور رُخساروں پر خوشی کی لہک، لبوں پر اطمینان و سکون کا تبسم تھا اور رفتار میں عجیب و غریب ''اندازِ گلگشت''، ہاتھوں میں اُس کا محبوب سرود تھا جس کے تاروں پر اُس کی انگلیاں اِس طرح چل رہی تھیں گویا اِس سے بہتر فرصتِ نغمہ اُسے کبھی مل ہی نہیں سکتی۔ شعلوں کی لپٹیں گویا اُس کے لیے بادِ نسیم کے جھونکے تھے جو اُسے مست کیے ہوئے تھے۔ مخلوق کی چیخ و پکار گویا نغمۂ الوہیت تھی جس کے ساتھ سرود کے تاروں کو چھیڑنے میں وہ سماوی سکون محسوس کرتا تھا۔

یہ واقعہ ۶۷ء کا ہے جبکہ روما پر حکمرانی کرتے ہوئے نیرو کا گیارھواں سال گزر رہا تھا۔

جب آگ کا دیوتا اپنی نذریں لے کر رخصت ہو گیا اور سارا شہر خاکستر کا ڈھیر نظر آنے لگا، تو نیرو بھی اپنے قصر میں واپس آیا اور ہاتھ سے سرود رکھ کر مسند پر بیٹھ گیا جس کے سرخ اطلس کو فینیقا کی خوب صورت لڑکیوں کے خوب صورت ہاتھوں نے بنایا تھا۔

نیرو نے امرائے دربار سے مخاطب ہو کر کہا:

''آج مَیں نے شہرِ روما کا خاکِ سیاہ کر کے واقعاتِ عالم میں ایک ایسے واقعہ کا اضافہ کیا ہے جسے دنیا کبھی فراموش نہیں کر سکتی اور جو تاریخ کے صفحات پر جلی سرخ حروف سے لکھا جائے گا لیکن اِسی کے ساتھ روما کی خاک پر ایک اور دُوسرا شہر بناؤں گا جس کی عظمت و جمال کے سامنے تم قدیم شہر کو بھول جاؤ گے۔''

نیرو کی شخصیت کو تاریخ نے جس طرح پیش کیا ہے، اُس سے ہر شخص واقف ہے اور جہاں کہیں اُس کا نام آتا ہے، آتشزنِ روما کی صفت بھی ضرور اِستعمال کی جاتی ہے۔ دنیا میں بڑے بڑے ہیبت و جبروت والے بادشاہ گزرے ہیں۔ ظلم و ستم سے کھیلنے والی بڑی بڑی ہستیاں گزر چکی ہیں لیکن آگ اور خون کی جتنی پیاس نیرو کو تھی، اتنی کسی کو نہ تھی۔

نیرو کی شخصیت صرف اپنی سنگ دلی اور شقاوت و بے رحمی ہی کے لیے مشہور نہ تھی بلکہ مجموعہ اضداد ہونے کی حیثیت سے بھی دنیا نے اُسے حیرت کی نگاہوں سے دیکھا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ نیرو مجموعہ تھا بہت سے آدمیوں کا جو ایک دوسرے سے بالکل متضاد طبیعت رکھتے تھے اور نہیں کہا جا سکتا تھا کہ خود اُسے کیا سمجھا جائے۔

وہ حد درجہ سنگ دل تھا اور اُتنا ہی رحیم المزاج، وہ بے انتہا غضب ناک شخص تھا اور اتنا ہی محبت کرنے والا۔ وہ ایک مصلح تھا خرابات پسند۔ وہ ایک شاعر تھا دشمن شعر و شاعری۔ وہ ایک موسیقار تھا عدوئے نغمہ و موسیقی۔ الغرض یہ کچھ تھا نیرو جو روما کو آگ لگا کر سرود بجانے میں مصروف تھا۔

کہا جاتا ہے کہ اُس نے اپنی زندگی میں کبھی لطف و کرم سے کام نہیں لیا مگر صرف ایک بار لیکن اُس لطف کا کتنا بڑا معاوضہ وہ پہلے ہی وصول کر چکا تھا۔ اُس کا حال ذیل کے واقعہ سے معلوم ہوگا۔

نیرو اپنے تخت پر جلوہ افروز ہے۔ امرا چاروں طرف

> ظلم و ستم سے کھیلنے والی بڑی ہستیاں گزر چکی ہیں
> لیکن آگ اور خون کی جتنی پیاس نیرو کو تھی،
> اتنی کسی کو نہ تھی

بیٹھے ہوئے ہیں۔ غلامانِ زریں کمر سیکڑوں کی تعداد میں تعمیلِ احکام کے لیے سر جھکائے ہوئے کھڑے ہیں اور فرطِ ہیبت سے قصر میں سناٹا چھایا ہوا ہے۔ دفعتاً اُس کی شیر کی سی آواز بلند ہوتی ہے اور حکم دیتا ہے کہ شراب حاضر کی جائے۔

خادموں میں ایک شخص یونانی الاصل بھی تھا جو اَپنے آقا کے وطن ایتھنز سے بھاگ کر یہاں آ گیا تھا اور جسے نیرو نے آبدار خانہ کا داروغہ بنا دیا تھا۔ اُس کا نام دیوموس تھا۔

نیرو نے غلاموں سے کہا ''حاضرین کو خوب جام بھر بھر کر شرابیں پلاؤ کیونکہ آج کا دن میری انتہائی مسرت کا دن ہے اور آگ کے خوب صورت منظر سے جو سکر پیدا ہوا ہے، اُسے اِس قدر جلد ختم نہ ہونا چاہیے۔''

پیالے جام بھر بھر کے دیے جانے لگے۔ لوگوں نے جلدی جلدی جام خالی کرنا شروع کیے اور نشے کی سرخیاں حاضرین کے چہروں پر دوڑ گئیں لیکن دیوموس اُس وقت موجود نہ تھا۔ وہ باہر آبدار خانہ کے انتظام میں مصروف تھا۔ نیرو کو دفعتاً خیال آیا اور اُس نے پوچھا ''دیوموس آج یہاں نظر نہیں آتا، کہاں ہے؟''

جواب ملا ''باہر انتظام میں مصروف ہے۔''

یہ سنتے ہی نیرو کی آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں اور محافظوں کا افسر جو دروازے پر کھڑا تھا، اُس سے مخاطب ہو کر کہا ''مَیں نے دیوموس کو یہ حکم نہیں دیا تھا کہ وہ دعوتوں میں مجھے ہمیشہ اپنے ہی ہاتھ سے شراب پلائے۔ پھر کیوں نہیں آیا۔ جاؤ اُس ملعون یونانی کو اَبھی پکڑ کر حاضر کرو۔''

دیوموس کانپتا ہوا سامنے آیا اور قدموں پر گر کر معافی چاہی ''مَیں نے عمداً یہ خطا نہیں کی بلکہ باہر کے انتظام میں اتنا مصروف تھا کہ حاضری کا خیال دل سے نکل گیا۔''

لیکن نیرو جس نے آج تک کبھی کسی کا عذر نہیں سنا تھا، اُس کا عذر کیوں سنتا۔ اُس نے عصائے شاہی اٹھایا اور اِس زور سے اُس کے سر پر مارا کہ خون کا فوارا سر سے جاری ہو گیا اور وُہ بے ہوش ہو کر وہیں گر پڑا۔

نیرو نے حکم دیا ''ہاتھ پاؤں باندھ کر اِسے ایک طرف ڈال دیا جائے۔''

جب دعوت ختم ہونے کا وقت قریب آیا اور ہر شخص کے دماغ پر شراب پوری طرح مسلط ہو گئی، تو نیرو نے حکم دیا کہ ''دیوموس کو سامنے لایا جائے'' اور پھر جلاد کو بلا کر حکم دیا کہ ''اِس کے دونوں ہاتھ کاٹ دے۔''

چنانچہ جلاد نے اُس کے دونوں ہاتھ تلوار کی ایک ضرب سے جدا کر دیے۔ اِس حال میں کہ نیرو اَور تمام اُمرا اُس کی تکلیف اور تڑپ کو دیکھ دیکھ کر قہقہے لگا رہے تھے۔

☆☆

''کیا تمہیں بہت تکلیف ہے؟''

''ہاں! یہ اذیت ناقابلِ برداشت ہے اور اِس لیے مَیں نے تم سے کہا تھا کہ تم چھری لے کر میرا کام تمام کر دو تا کہ اِس عذاب سے مجھے نجات مل سکے۔''

''لیکن مَیں ایسا نہیں کر سکتا کیونکہ ہم غلام سب ایک دوسرے کے بھائی ہیں اور میرا فرض ہے کہ جس طرح ممکن ہو تمہیں زندہ رہنے دوں اور تمہاری خدمت کروں۔''

جس وقت دیوموس کے ہاتھ کاٹے گئے، تو اُس نے اپنے ایک ساتھی افریقی غلام سے کہا ''تم مجھے ہلاک کر ڈالو کیونکہ ایسی زندگی سے موت بہتر ہے۔''

لیکن اُس نے اِس پر عمل نہیں کیا بلکہ قصر کے ایک گوشے میں لے جا کر دوست کی خدمت و تیمارداری شروع کی۔ یہاں تک کہ اُس کے زخم اچھے ہو گئے اور رَفتہ رفتہ تمام وہ کام جو ہاتھ سے کیا کرتا تھا، پاؤں کی مدد سے انجام دینے لگا۔

نیرو کا معمول تھا کہ کبھی کبھی وہ خود قصر کے مختلف حصوں میں جا کر دیکھا کرتا تھا کہ کون کیا کر رہا ہے۔ چنانچہ ایک دن اتفاق سے اُس کا گزر وہاں بھی ہوا جہاں دیوموس پاؤں سے برتن صاف کر رہا تھا۔ نیرو اُس کے سامنے کھڑا ہو گیا اور حیرت سے دیکھنے لگا کہ یہ کون ہے جو پاؤں سے ہاتھ کا کام لے رہا ہے۔ وہ بالکل بھول گیا تھا کہ دیوموس یہی ہے جس کے ہاتھ اُس نے کسی وقت قطع کرائے تھے۔

نیرو نے محل واپس جا کر داروغہ کو بلایا اور پوچھا ''وہ کون تھا جو پاؤں سے برتن صاف کر رہا تھا؟''

اُس نے ڈرتے ہوئے جواب دیا ''اے آقا! یہ آپ ہی کا دیرینہ غلام دیوموس یونانی ہے جس کے ہاتھ کاٹے جانے کا آپ نے حکم دیا تھا۔ موت اُس کی قسمت میں نہ لکھی تھی، اِس لیے بچ گیا اور بدستور اَپنے آقا کی خدمت میں مصروف ہے۔''

نیرو یہ سن کر بہت متاثر ہوا (اُس کی زندگی کا یہ بالکل پہلا اور آخری تاثر تھا) اور حکم دیا ''دیوموس کو حاضر کیا جائے۔''

دیوموس سامنے آیا تو نیرو نے اُس سے مخاطب ہو کر کہا:

''اے میرے بھائی! اِس میں شک نہیں کہ مَیں نے تمہارے ساتھ بہت برا سلوک کیا تھا، لیکن امید ہے کہ اب تم مجھے معاف کر دو گے۔''

نیرو کی زندگی کا یہ بالکل پہلا واقعہ تھا کہ اُس نے کسی سے معافی چاہی ہو۔ دیوموس اُس کے قدموں پر گر پڑا اَور بولا:

''اے آقا! آپ میری جان کے مالک تھے اور ہیں۔ آپ نے جو کچھ کیا وہ بھی حق بجانب تھا اور اَب جو کچھ کریں گے وہ بھی بالکل درست ہوگا۔''

نیرو نے کہا ''آج مَیں تمہیں آزاد اَور اَپنے قصر کا محافظ مقرر کرتا ہوں۔''

یہ کہہ کر اُس نے دیوموس کو رخصت کیا اور متعدد غلام اُس کی خدمت کے لیے مامور ہو گئے۔

اِس کے بعد دس سال تک دیوموس مزید زندہ رہا اور پاؤں سے کام کرنے کی ایسی مشق بہم پہنچائی کہ نقاشی و بت تراشی میں بھی اُس نے خاص شہرت حاصل کی۔ چنانچہ اُس نے نیرو کا بھی ایک مجسمہ تیار کیا جو اُس کی خواب گاہ میں ہر وقت رکھا رہتا تھا۔ جب ۶۸ء میں نیرو کا انتقال ہوا، تو وہ مجسمہ بھی توڑ دیا گیا لیکن دیوموس بدستور اَپنی خدمت پر مامور رہا کیونکہ سارا رُوما اُس کے کمالِ نقاشی کا معترف تھا۔

نہ اب نیرو باقی ہے نہ دیوموس لیکن ایک کے ظلم و ستم اور دُوسرے کے صبر و تحمل کی داستان ہنوز زندہ ہے۔ ممکن ہے نیرو کی روح اب بھی اِس بات پر نازاں ہو کہ اُس کی وجہ سے روما کو اِتنا بڑا صاحبِ کمال نقاش میسر ہوا۔

نام کی مماثلت

جب ملتے جلتے ناموں نے انوکھی اور مضحکہ خیز صورتِ حال پیدا کر ڈالی

دلچسپ و عجیب — حبیب اشرف صبوحی

بعض اوقات نام کی مماثلت بڑے عجیب قسم کے واقعات پیدا کر دیتی ہے جو انسان کے لیے مشکلات پیدا کرتے اور خوش کُن بھی ہوتے ہیں۔ کچھ واقعات کا تذکرہ کرنا چاہوں گا۔

ہم بہن بھائیوں میں ہماری ہمشیر ماشاء اللہ سب سے بڑی ہیں۔ سن ساٹھ کی دہائی میں اُنھوں نے اعلیٰ نمبروں سے ایجوکیشن ٹیچنگ کی ڈگری اعلیٰ نمبروں سے حاصل کی۔ فوری طور پر اندرون شہر کے ہائی اسکول میں استانی کی ملازمت مل گئی جو گھر سے بالکل نزدیک تھا۔ محلے کی بچیاں شام کو اور اکثر چھٹی والے دن بھی اپنے تعلیمی مسائل حل کرانے آتی تھیں۔ بعض اوقات اُن طالبات کی والدہ وغیرہ بھی بچیوں کی تعلیم کے سلسلے میں رہنمائی حاصل کرنے کے لیے آجایا کرتیں اور مطمئن ہو کر جاتی تھیں۔ ہمشیر صاحبہ پورے محلے میں مس صبوحی کے نام سے مشہور تھیں۔

چند سال بعد اُن کی شادی ہو گئی اور وہ کراچی چلی گئیں۔ اُس کے بعد وہ پاکستان سے باہر بھی چلی گئیں۔ اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد مجھے بھی ایک کمپنی میں ملازمت مل گئی۔ ہمشیر کی شادی کے دس بارہ سال بعد مَیں ایک روز اپنے دفتر میں بیٹھا ہوا کام کر رہا تھا کہ ہماری کمپنی کے مینیجنگ ڈائریکٹر کا قاصد آیا کہ صاحب آپ کو بلا رہے ہیں۔ مَیں پریشان ہو گیا کہ ایم ڈی صاحب کو مجھ سے کیا کام پڑ گیا؟ اگر اُنھیں مجھ سے کوئی کام تھا، وہ جنرل مینیجر صاحب سے بھی کہہ سکتے تھے یا میرے کسی اور بڑے افسر کو بھی۔

ایک بات واضح کرنا چاہتا ہوں کہ ہمارے ایم ڈی جنہیں مَیں خان صاحب ہی کہوں گا، پیپلز پارٹی کے بہت بڑے جیالے تھے۔ اِسی وجہ سے اُن کی اِس عہدے پر ترقی ہوئی تھی۔ وہ مجھے ایک دو حوالوں سے جانتے تھے اور ہمیشہ پنجابی زبان میں گفتگو کرتے۔ مَیں ڈرتا ہوا اُن کے کمرے میں گیا اور سلام کیا۔

وہ کہنے لگے کہ میرے سامنے جو صاحب بیٹھے ہیں، پیپلز پارٹی اندرون شہر کے صدر ہیں۔ اِن کے ساتھ اِن کے والد ہیں۔ اِن کا ایک مسئلہ آپ کی ہمشیر کے ہاتھ میں ہے۔ اِن کے ساتھ جا کر اِن کا مسئلہ حل کرواؤ۔ مَیں نہ سننے کا عادی نہیں ہوں۔ مجھے یہ بات سن کر چکر سا آیا۔ مَیں بڑی مشکل سے سنبھلا۔ مَیں بڑی ہمت کر کے کہنا چاہتا تھا کہ ”جناب! میری ہمشیر کی.....“

ابھی میری بات نامکمل ہی تھی کہ اُنھوں نے سنی اور اَن سنی کرتے ہوئے اُن صاحب سے کہا کہ آپ اِن کے ساتھ جائیں۔ آپ کا کام ہو جائے گا۔ مَیں عجیب کشمکش کی حالت میں کمرے سے باہر آ گیا اور وُہ دونوں حضرات بھی میرے ساتھ تھے۔ مَیں نے باہر آ کر اُنھیں ایک جگہ بٹھایا اور خود پانی پیا۔ اپنے حواس درست کیے اور اُن سے پوچھا، مسئلہ کیا ہے۔ مجھے تفصیل سے بتائیں۔ اُس لڑکے نے بتایا کہ پہلے آپ اندرون شہر رہتے تھے۔ مَیں نے اثبات میں جواب دیا۔

وہ کہنے لگا کہ آپ کا ایک پڑوسی جس کا نام حمید بٹ ہے، وہ بھی پیپلز پارٹی کا ایک عہدے دار ہے۔ مَیں نے اپنی ایک پریشانی اُسے بتائی کہ میرا بڑا بھائی جو لاہور میونسپل کارپوریشن میں ملازم ہے، اُس کا تبادلہ لاہور سے باہر کر دیا ہے اور یہ تبادلہ کارپوریشن کی چیئرپرسن مس صبوحی نے کیا ہے۔ اُن کی کوئی سفارش نہیں مل رہی، تو حمید بٹ نے بتایا کہ وہ کئی سال پہلے ہماری پڑوسن اور ایک اسکول کی ہیڈ مسٹریس تھیں۔ وہ ترقی کرتے کرتے میونسپل کارپوریشن کی چیئرپرسن ہو گئی ہیں۔ اِس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ خان صاحب جس کمپنی کے ایم ڈی ہیں، اُس میں مس صبوحی کا بھائی اُن کا ماتحت ہے۔ تم خان صاحب سے کہو، وہ اُس کا کان پکڑ کر تمہارا کام کروادیں گے۔

مَیں نے کہا، حمید بٹ نے غلط بیانی سے کام لیا ہے۔ کئی سال پہلے میری باجی کی شادی ہو گئی تھی اور حمید بٹ بھی اُس میں شریک ہوا تھا۔ وہ کہنے لگا کہ مَیں کچھ نہیں جانتا، آپ کو یہ کام کرنا ہے۔ مَیں نے اُسے بتایا کہ کوئی کام اختیار میں ہوتا ہے اور کوئی کام اختیار سے باہر۔ وہ کہنے لگا کہ آپ بہانے بازی کر رہے ہیں۔ مَیں کئی لوگوں سے پتا کر کے آیا ہوں کہ ”صبوحی“ ایک برادری ہے اور یہ لوگ ایک دوسرے کے کام آ جاتے ہیں۔ آپ اُس سے کوئی ڈاک خانہ ملائیں۔ اگر میرے بھائی کا تبادلہ نہ رکا، تو آپ کا تبادلہ مَیں لاہور سے باہر کروا دوں گا۔ یہ دھمکی دیتے ہوئے وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ مَیں نے اُسے دو روز بعد آنے کو کہا۔

اب تو مجھے دن میں تارے نظر آنے لگے، چنانچہ مَیں فوری طور پر کارپوریشن کے دفتر گیا۔ وہاں جا کر پتا چلا کہ اُن خاتون کا نام ”عارفہ صبوحی“ ہے۔ مَیں نے اپنا تعارفی کارڈ نکالا جس پر میرا نام اور عہدہ وغیرہ لکھا ہوا تھا۔ اُس کے نیچے پین سے لکھ دیا ”پسر (s/o) اشرف صبوحی“ اور وُہ کارڈ مَیں نے چپراسی کو دیا کہ اِسے چیئرپرسن صاحبہ کو پہنچا دے۔ اُس نے کہا کہ اندر میٹنگ ہو رہی ہے۔ بیس، پچیس کونسلرز بیٹھے ہوئے ہیں۔ مَیں نے اُسے کہا کہ تم اُنھیں پہنچا تو دو۔ مَیں باہر بینچ پر بیٹھا رہوں گا، جب وہ فارغ ہوں گی، تو بلوا لیں گی۔

مَیں باہر بیٹھ کر اللہ کو یاد کرنے لگا۔
میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ چند لمحوں
بعد میری طلبی ہو گئی

مَیں باہر بیٹھ کر اللہ کو یاد کرنے لگا۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ چند لمحوں بعد میری طلبی ہو گئی۔ اُن کی عظمت تھی کہ اتنے لوگوں کی موجودگی میں مجھے بلا لیا اور اَپنے نزدیک نشست کا انتظام کروایا۔ مَیں نے اپنے والد کے حوالے سے تعارف کروایا۔ اُنھوں نے کہا کہ مَیں نے اُن کی تحریریں پڑھی ہیں، آپ کام بتائیے۔

مَیں نے بتایا کہ ہمارے ادارے کے ایم ڈی نے مجھے آج بلوایا اور کہا کہ تمہاری بہن کے پاس میرے ایک ملنے والے کا کام ہے۔ یہ کام کروا کر آؤ۔ مَیں نے ایم ڈی صاحب کو بتایا تھا کہ وہ میری بہن نہیں ہیں، لیکن اُنھیں یقین نہیں آیا۔ اب سماج نے ہمیں بھائی بہن کے مقدس رشتے میں باندھ دیا ہے، تو اِس رشتے کو آپ نبھائیں، ورنہ میری ملازمت خطرے میں پڑ جائے گی۔ اِس پر وہ تھوڑا سا مسکرائیں اور بولیں کہ کیا کام ہے۔

مَیں نے کہا کہ آپ کے محکمے کے فلاں کارندے کا تبادلہ آپ نے لاہور سے باہر کر دیا ہے۔ اُسے رکوانا ہے۔ کہنے لگیں کہ وہ شخص انتہائی بےایمان اور کرپٹ ہے۔ آپ کے ایم ڈی اُس کی سفارش کر رہے ہیں۔ مَیں نے کہا، محترمہ جہاں آپ کے محکمے میں بےانتہا کرپٹ لوگ ہیں، ایک اور سہی۔ آپ کس کس کا تبادلہ کریں گی۔ اِس کے بعد اور بھی باتیں ہوئیں۔ کہنے لگیں کہ اگلے ہفتے اُسے اپنے ساتھ لے کر آئیں۔ اگر اُس نے میرے شکوک دور کر دیے، تو مَیں اُس کا تبادلہ منسوخ کر دوں گی۔ مَیں نے اُن کا شکریہ ادا کیا اور چلا آیا۔

دوسرے دن وہ شخص آیا، تو اُسے بتا دیا۔ اُس نے کہا، ٹھیک ہے۔ چند روز بعد اخبار میں خبر آئی کہ عارفہ صبوحی صاحبہ کا تبادلہ فوری طور پر کسی اور محکمے میں کر دیا گیا ہے اور اُن کی جگہ کوئی بریگیڈیئر صاحب آ گئے تھے۔ اِس طرح یہ مصیبت میرے گلے سے دور ہوئی۔ مَیں نے اللہ کا شکر ادا کیا۔

☆☆

ملازمت کے دوران میری شادی سے قبل میرے دفتر کے ایک ساتھی تھے جن کا نام محمد اشرف تھا۔ اُنھوں نے اخبار میں ضرورتِ رشتہ کا ایک اشتہار دیکھا اور اپنی خدمات کے لیے درخواست بھیج دی جس میں اپنی تنخواہ، تعلیم اور خاندانی پس منظر بتا دیا۔ رابطے کے لیے دفتر کا پتا لکھ دیا کہ یہاں آ کر آپ مجھ سے مل اور میرے بارے میں معلومات بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ اتفاق سے درخواست بھیجنے کے بعد اُن کا تبادلہ گلبرگ دفتر میں ہو گیا۔

اُن کے جانے کے کچھ عرصے بعد اُن سے ملاقات کرنے لڑکی کے خاندان سے دو معزز اَفراد آ گئے۔ اُنھوں نے دفتر میں آ کر پوچھا کہ ہمیں اشرف صاحب سے ملنا ہے۔ جس لڑکے سے پوچھا وہ اُنھیں نام سے نہیں جانتا تھا کیونکہ موصوف دفتر میں خواجہ صاحب کے نام سے جانے جاتے تھے۔ اُس لڑکے نے میری میز کی طرف اشارہ کیا کہ وہ وَہاں بیٹھتے ہیں۔ ہم ایک بڑے ہال میں بیٹھتے تھے۔ جب وہ لوگ میری نشست پر پہنچے، تو مَیں موجود نہیں تھا۔ اُنھوں نے میرے ساتھی سے پوچھا کہ یہاں اشرف صاحب بیٹھتے ہیں۔ اُس نے کہا، جی۔ میرے ساتھی نے اُنھیں بتایا کہ اُن کی ڈیوٹی دفتر کے باہر ہوتی ہے۔ وہ حاضری لگا کر چلے جاتے اور چھٹی کے وقت آتے ہیں۔

اُن لوگوں نے بتایا کہ ہمیں اُن سے ضروری ملنا ہے۔ میرے ساتھی نے پوچھا، کس سلسلے میں؟ اُنھوں نے کہا، رشتے کے سلسلے میں۔ میری بچی کے لیے اُن کا رشتہ آیا ہے۔ اِس پر میرے ساتھی نے اُنھیں بٹھایا، چائے وغیرہ سے تواضع کی اور بےانتہا تعریف کی۔ اُنھوں نے دفتر سے میرے گھر کا پتا لیا اور میرے محلّے میں آ کر پڑوسیوں اور مسجد کے نمازیوں سے میری معلومات لیتے رہے۔ مجھے محلّے والوں نے بتایا کہ آپ کی شادی کے سلسلے میں آپ کے بارے میں معلومات ہو رہی ہیں۔ مَیں بڑا پریشان ہوا کیونکہ جہاں میری منگنی ہوئی تھی، وہ بہت قریبی ملنے والوں میں سے تھے اور اُن سے اِس قسم کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔

اتفاق سے ایک روز وہ لوگ صبح ہی دفتر میرے باہر نکلنے سے پہلے پہنچ گئے۔ مجھ سے ملے اور اَپنا تعارف کروایا۔ مَیں نے اُنھیں خوش آمدید کہا، چائے وغیرہ منگوائی اور اُنھیں بتایا کہ آپ نے جو معلومات میرے دفتر اور محلّے سے لیں، اُس کا مجھے علم ہوا لیکن یہ سب غلط فہمی کی وجہ سے ہوا ہے۔ اصل میں جن صاحب کی آپ نے معلومات حاصل کرنا تھیں، وہ محمد اشرف ہیں اور مَیں حبیب اشرف ہوں۔ وہ پہلے اِس دفتر میں تھے لیکن اب اُن کا تبادلہ گلبرگ دفتر میں ہو چکا۔ آپ وہاں جا کر معلومات حاصل کریں اور اُن سے ذاتی طور پر ملیں۔ اللہ کرے کہ وہ آپ کے معیار پر پورا اُتریں۔

وہ کہنے لگے کہ ہم آپ کی شخصیت اور اَخلاق سے متاثر ہوئے ہیں اور اَپنی بچی کی تعلیم وغیرہ اَور بےحد سلیقہ مند ہونے کی تعریف کی۔ اپنا تعارفی کارڈ بھی دیا۔ مَیں نے اُنھیں بتایا کہ میری منگنی ہو چکی۔ بہرحال مَیں آپ کی بچی کا نام ویٹنگ لسٹ میں لکھ لوں گا۔

☆☆

میرے والد اشرف صبوحی ایک ادارے میں تعلقاتِ عامہ (P.R.) افسر تھے۔ ایک دفتری کام کے سلسلے میں لیڈی مکلیگن کالج کی پرنسپل آنسہ نور محمد کے پاس جانا ہوا جو ایک علمی، ادبی شخصیت تھیں۔ جب والد وہاں پہنچے، تو اتفاق سے کھانے کا وقفہ تھا۔ والد نے اپنا تعارفی کارڈ چوکیدار کو دیا کہ پرنسپل صاحبہ کو پہنچا دو۔ اُس نے کہا کہ اِس وقت کھانے کا وقفہ ہے۔ والد نے کہا کہ مجھے علم ہے، تم جا کر اُنھیں دے آؤ۔ جب تک وقفہ ہے، مَیں گاڑی میں بیٹھا رہوں گا۔ اُس نے کارڈ پرنسپل صاحبہ کو پہنچا دیا۔ اُنھوں نے کارڈ دیکھتے ہی والد کو بلوا لیا۔ جب وہ اُن کے کمرے میں داخل ہوئے، تو محترمہ احتراماً کھڑی ہو گئیں۔ سلام کیا اور اُنھیں بغور دَیکھتی رہیں۔ پھر کہنے لگیں تشریف رکھیں۔ والد کو ''خوش آمدید'' کے الفاظ کہے۔

والد صاحب نے کہا کہ مَیں آپ سے پہلی بار مل رہا ہوں لیکن آپ ایک خاص نظر سے مجھے دیکھ رہی تھیں۔ اِس کی کیا وجہ ہے؟

وہ کہنے لگیں کہ مَیں آپ کی کتابیں اور تحریریں بہت عرصے سے پڑھ رہی ہوں اور آپ کو ایک خاتون سمجھتی تھی۔ مَیں سوچتی تھی کہ کاش کبھی آپ اپنی کسی بچی، نواسی یا پوتی وغیرہ کو لے کر آتیں۔ مَیں آپ سے ملاقات کرتی۔ آپ کی تحریروں کے بارے میں بےشمار سوالات کرتی لیکن آج آپ کو دیکھ کر حیرت ہوئی کہ آپ تو مرد ہیں۔

والد نے کہا، پرنسپل صاحبہ! آپ مجھے ایک خاتون ہی سمجھیں کیونکہ مَیں نے آج تک کوئی مردانگی کا کام نہیں کیا۔ اِس بات پر اُنھوں نے قہقہہ لگایا اور کسی کو چائے لانے کا کہا۔ وہ کھانا کھا چکی تھیں اور پلیٹ میں سے کوئی میٹھی چیز کھا رہی تھیں، شاید کشمش تھی۔ اتنے میں چائے کی پیالی والد کے سامنے آ گئی۔ پرنسپل صاحبہ نے کہا کہ چائے نوش فرمائیے۔ والد نے بےساختہ اُن سے کہا کہ ہم اپنے بچپن میں ایک لوری سنتے تھے جس کے بول تھے ؎

چندا ماموں دُور کے

بڑے پکائیں بُور کے

آپ کھائیں تھالی میں

ہمیں دیں پیالی میں

موقع کی مناسبت سے یہ اشعار اُنھیں بہت پسند آئے۔ اِس کے علاوہ اَور بھی دلچسپ باتیں ہوئیں۔

☆☆

میرے والد کے ایک دوست کا نام عبدالعزیز تھا۔ وہ اُن کے ڈاک خانے کے ساتھی تھے۔ جب والد پوسٹ ماسٹر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے، تو عبدالعزیز تقریباً چھ، سات سال کام کرتے رہے۔ وہ اَکثر گھر آتے اور پرانی یادیں تازہ کرتے رہتے۔ ایک دفعہ آئے، تو اپنے بیٹے کے ولیمے کا کارڈ دیا اور آنے کے لیے کہا۔ والد کو یہ بھی یاد کروایا کہ اِس بچے کی

پیدائش پر آپ نے اُس کے کان میں اذان دی اور اُس کے بہتر مستقبل کے لیے دعا بھی کی تھی۔ وہ آپ کی دعاؤں اور اَللہ کے فضل سے بڑا سعادت مند اور اَعلیٰ تعلیم یافتہ ہے۔

والد نے آنے کی ہامی بھر لی۔ مقررہ تاریخ پر مَیں اُنھیں لے کر تقریب میں شامل ہوا۔ اتفاق سے اُس محفل میں میرا ایک کالج کا دوست مل گیا۔ اُس سے بڑے عرصے بعد ملاقات ہوئی تھی۔ اُس نے بتایا کہ وہ لاہور ریلوے اسٹیشن پر اسٹیشن ماسٹر ہے۔ جب کبھی اسٹیشن آنا ہو، تو مجھ سے ضرور ملنا۔

اتفاق سے کافی عرصے بعد مجھے ایک روز کسی کام سے اسٹیشن جانا پڑ گیا، تو اُس سے ملنے بھی چلا گیا۔ بہت سی پرانی باتیں ہوئیں۔ مَیں نے اُن سے پوچھا کہ آپ کے محلّے میں ایک پوسٹ ماسٹر رہتے ہیں جن کا نام عبدالعزیز ہے، اُن کا کیا حال ہے؟ اُس نے بتایا کہ تقریباً ایک سال قبل اُن کا انتقال دل کے دورے سے ہوگیا تھا۔ مَیں نے افسوس کا اظہار کیا اور اُن کی باتیں کرتا رہا۔

گھر آ کر والد کو اُن کے انتقال پُر ملال کی خبر سنائی۔ اُنھوں نے بھی بڑے دکھ کا اظہار کیا۔ اُن کے گھر جا کر اُن کے بچوں سے تعزیت کا ارادہ ظاہر کیا۔ مَیں نے کہا کہ آپ کو اتوار کو لے چلوں گا۔ چنانچہ مَیں والد کو اُن کے گھر لے گیا۔ تمام راستے وہ اُن کا ذکرِ خیر کرتے رہے اور بتایا کہ اُن کے ایصالِ ثواب کے لیے کیا کچھ پڑھتے رہے ہیں۔ جب اُن کے گھر جا کر دستک دی، تو ہماری حیرانی کی انتہا ہو گئی کہ عبدالعزیز صاحب نے خود دَروازہ کھولا اور خوشی کا اظہار کیا۔

ہم پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔ کچھ دیر بعد اُنھوں نے والد سے کہا کہ آپ کے چہرے پر تاثرات کچھ عجیب سے ہیں۔ کیا بات ہے؟ والد نے کہا کہ مجھ پر شادیٔ مرگ کی کیفیت طاری ہو گئی ہے۔ میرے بیٹے کے دوست نے بتایا تھا کہ آپ کا انتقال ہو گیا ہے۔ مَیں اللہ جانے کیا کچھ پڑھ کر آپ کی روح کو ایصالِ ثواب کرتا رہا ہوں۔ اب تمھیں زندہ سلامت دیکھ کر بڑی خوشی ہو رہی ہے۔

اِس پر عبدالعزیز نے ایک قہقہہ لگایا کہ آپ کی طرح اور لوگ بھی تعزیت کے لیے آتے رہے ہیں اور مجھے زندہ سلامت دیکھ کر اُنھیں حیرت ہوتی ہے۔ دراصل میرے اِسی محلّے میں ایک اور صاحب رہتے تھے جن کا نام عبدالعزیز تھا اور وُہ بھی پوسٹ ماسٹر تھے۔ انتقال اُن کا ہوا ہے اور لوگ میرے گھر تعزیت کے لیے آتے رہے۔ اگر مستقبل میں میرے انتقال کی خبر سنیں، تو وہ دُرست ہو گی۔ کیونکہ میرا ہم نام محلّے دار اِس دنیا سے چلا گیا ہے۔

وہ پھر کہنے لگے کہ مَیں آپ کے لیے چائے منگواتا ہوں اور اُس کے ساتھ مٹھائی بھی۔ والد نے کہا، شرط یہ ہے کہ مٹھائی اور صدقے کے پیسے مَیں دوں گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایک نئی زندگی دی ہے۔ جانے کی باری میری ہے، آپ کی نہیں۔ چند سال بعد والد کا انتقال ہو گیا اور کافی برسوں بعد عبدالعزیز بھی چل بسے۔ رہے نام اللہ کا۔

لمبے بال

ایک صاحب ہوٹل میں بیٹھے تھے کہ اُنھوں نے دیکھا ایک لڑکی اندر داخل ہوئی جس کے لمبے لمبے بال تھے۔ اُن صاحب نے اپنے پاس بیٹھی ہوئی خاتون سے کہا:

"اِس لڑکی نے اپنے بال نہیں کٹوائے، اِس لیے یہ بالکل لڑکی لگتی ہے۔" جس سے وہ مخاطب تھے، اُس نے کہا "آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے، وہ میرا بیٹا ہے۔"

اُس آدمی نے کہا "معافی چاہتا ہوں مجھے علم نہیں تھا کہ آپ اُس کی والدہ ہیں۔"

"مَیں اُس کی ماں نہیں، باپ ہوں۔" جواب ملا۔

نام کتاب: ایک عہد کی سرگزشت۔ مصنّف: جمیل اطہر قاضی۔ ملنے کا پتا: قلم فاؤنڈیشن انٹرنیشنل، یثرب کالونی، بینک سٹاپ، والٹن روڈ، لاہور کینٹ۔ فون: ۰۳۰۰-۰۵۱۵۱۰۱۔

قیمت: ۴۰۰۰ روپے۔

جناب جمیل اطہر قاضی وطنِ عزیز کے معروف صحافی ہیں۔ روزنامہ 'آفاق' سے صحافتی زندگی کا آغاز کیا۔ بعدازاں روزنامہ 'تجارت' شائع کرنے لگے جو کامیابی سے نکل رہا ہے۔ زیرِ نظر کتاب اُن صحافتی، مذہبی اور علمی و اَدبی شخصیات کے خاکوں پر مبنی ہے جن سے جمیل صاحب کا تعلق خاطر رہا۔ یہ خاکے سبق آموز ہیں اور گزشتہ دور کی عظمتِ رفتہ نمایاں کرتے ہیں۔ مصنّف نے اچھوتے انداز میں اپنے ممدوحین کی شخصیت کے مختلف گوشے وا کیے ہیں۔ یہ مشاہیر کا حیات آفریں تذکرہ ہے جو آنے والی نسلوں کو اَپنی روشنی و تابناکی سے منور کرتا رہے گا۔ کتاب سے اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

"والد صاحب نے اپنی رحلت سے کچھ عرصہ پہلے ایک روز مجھے اپنے پاس بیٹھنے کے لیے کہا اور میرے بیٹھتے ہی کسی تمہید کے بغیر فرمانے لگے سجھائی نہیں دیتا تھا کہ مَیں اسے دوبارہ کیسے حاصل کروں۔ اگر اللہ تعالیٰ کسی کو دولت عطا کرے، تو اُس کے استعمال کے سلسلے میں کچھ باتیں تمھیں کہنا چاہتا ہوں۔ اگر تمہارے علم میں اپنے محلّے، اپنے رشتے داروں اور اَپنے جاننے والوں میں کوئی ایسا یتیم بچہ ہو جو تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہو، مگر اُسے وسائل میسّر نہ ہوں، تو اُسے تعلیم دلانا۔ اِسی طرح اگر تمھیں اپنے محلّے، اپنے رشتے داروں اور اَپنے جاننے والوں میں کسی ایسی خاتون کا علم ہو جو بیوہ ہو اَور زندگی گزارنے کے لیے وسائل سے محروم ہو، تو تم اُس کی خدمت کرنا اور اَگر اپنے محلّے، اپنے رشتے داروں اور اَپنے جاننے والوں میں کوئی بےآباد بچی تمہارے علم میں آئے، تو اُس کی خدمت کرنا۔

"پھر مجھ سے دریافت کیا کہ بےآباد بچی سے کیا مراد ہے۔ کیا تم سمجھتے ہو؟ مَیں نے نفی میں جواب دیا، تو فرمانے لگے کہ بےآباد بچیاں وہ ہوتی ہیں جن کے خاوند لاتعلقی اختیار کر لیتے ہیں اور وُہ والدین اور بہن بھائیوں کے پاس واپس آ جاتی ہیں اور پھر وہ بھی ایسی بچیوں کو بوجھ تصور کرنے لگتے ہیں۔ اِس کے بعد میری ایک قریبی عزیزہ کا نام لے کر کہنے لگے کہ اُس کے متعلق مَیں خاص طور پر کہنا چاہتا ہوں۔ اُن کی بات سن کر مَیں نے فوراً ہی کہا کیا مَیں اُسے تین سو روپے ماہوار بھیج دیا کروں؟

"والد صاحب نے کہا مجھے تم سے ایسی ہی بےوقوفی کی توقع تھی۔ انسان کسی کی باتیں سنتا ہے اور بغیر سوچے سمجھے اپنی استطاعت سے بڑھ کر وعدے کر لیتا ہے۔ ایک دو مہینے پیسے بھیجتا ہے۔ اُس کے بعد پیشانی پر بَل آنا شروع ہو جاتے ہیں کہ مَیں کس مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔ ایسے تین سو روپے دینے سے جو دل کی ناخوشی کے ساتھ دیے جائیں، سو روپے دینا بہتر ہے کہ آدمی باقاعدگی سے بھیجتا بھی رہے اور اُس پر کسی طرح کی پریشانی بھی لاحق نہ ہو۔"

(تبصرہ نگار: ابوصارم)

ابو صارم
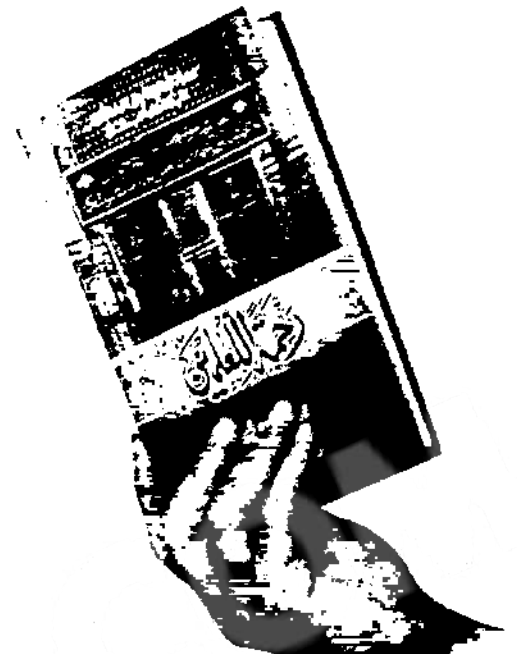
نام کتاب: رحمت للعالمین ﷺ۔ مصنف: ڈاکٹر اختر احمد۔ ناشر: گولڈن مجس، پی ایچ اے فلیٹس، نزد یو ای ٹی، لاہور۔ فون ۰۳۳۳۔۵۴۴۲۱۳۶۔

سیرت النبی ﷺ پر قلم اٹھانا اللہ تعالیٰ کا خاص فضل ہے۔ دورِ حاضر میں مادہ پرستی نے خواص و عوام اور بچے بڑے، سبھی کو جکڑ لیا ہے۔ اِس ماحول میں ضروری ہے کہ اخلاقِ نبویؐ عام کیے جائیں تاکہ ہمارے معاشرے میں اخلاقیات دوبارہ مروج پائیں اور مغربی تہذیب و تمدن نے جو یلغار کر رکھی ہے، اُس کا مداوا ہو سکے۔ ہم قناعت، سادگی، پیار و محبت، صبر و برداشت اور دیگر اخلاقی سبق بھولتے جا رہے ہیں جو رسولِ کریم ﷺ نے ہمیں دیا تھا۔ لہٰذا مصنف نے آسان فہم انداز میں زیرِ تبصرہ کتاب لکھ کر عظیم خدمتِ اسلام و پاکستان انجام دی ہے۔

اِس کتاب میں سیرت النبی ﷺ کے بیش بہا نمونے جا بجا ملتے ہیں۔ مثلاً یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

''اور بے شک آپؐ اخلاق کے اعلیٰ مرتبے پر ہیں۔'' (القلم:۴)

مولانا محمد حنیف ندوی لکھتے ہیں:

خلق سے مراد وُہ عادات و اَطوارِ حسنہ ہیں جنھیں رسول اللہ ﷺ نے اپنے کردار و سیرت میں سمو کر دکھایا۔ ''عظیم'' سے یہ مقصود ہے کہ خرد و خیر کی تکمیل و جامعیت کا کوئی بھی نقشہ ترتیب دیجیے، ایک ایک نیکی اور خوبی کا تصور کیجیے اور پھر یہ دیکھیے کہ جامعیت اور توازن کے ساتھ بجز رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ اقدس کے تاریخ میں کوئی اور شخص اُن کا حامل نظر آتا ہے، مزید براں یہ خلقِ عظیم جو آپؐ کا خاصا ہے، صرف آپؐ کی ذات ہی کی حد تک سمٹا ہوا نہیں، بلکہ اِس کی تاثیر نفوذ کا یہ کرشمہ ہے کہ آپؐ نے ایسے مثالی معاشرے کی تشکیل کی جس کا ایک ایک فرد آفتاب و ماہتاب کی طرح تاریخ کے اوراق میں دمک رہا ہے اور رضائے الٰہی کی شہادت و سند کا سزاوار ہے۔ (لسان القرآن، جلد دوم)

سید مودودی لکھتے ہیں:

رسول اللہ ﷺ نے دنیا کے سامنے محض قرآن کی تعلیم ہی پیش نہیں کی تھی، بلکہ خود اُس کا مجسم نمونہ بن کر دکھایا تھا جس چیز کا قرآن میں حکم دیا گیا۔ آپؐ نے خود سب سے بڑھ کر اُس پر عمل کیا۔ جس چیز سے روکا گیا، آپؐ نے خود سب سے زیادہ اُس سے اجتناب فرمایا۔ جن اخلاقی صفات کو اِس میں فضیلت قرار دیا گیا، سب سے بڑھ کر آپؐ کی ذات اُن سے متصف تھی اور جن صفات کو اِس میں ناپسند ٹھہرایا گیا، سب سے زیادہ آپؐ اُن سے پاک تھے۔ ایک اور روایت میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ''رسول اللہ ﷺ نے کبھی کسی خادم کو نہیں مارا، کبھی کسی عورت پر ہاتھ نہ اٹھایا، جہاد فی سبیل اللہ کے سوا کبھی آپؐ نے اپنے ہاتھ سے کسی کو نہیں مارا اور اَپنی ذات کے لیے کبھی کسی ایسی تکلیف کا انتقام نہیں لیا جو آپؐ کو پہنچائی گئی ہو، اِلّا یہ کہ اللہ کی حرمتوں کو توڑا گیا ہو اَور آپؐ نے اللہ کی خاطر اُس کا بدلہ لیا ہو۔'' (بخاری و مسلم، بحوالہ تفہیم القرآن)

پرچا آج مقامی ڈاک خانے کے عملے کی غفلت سے ۱۰ مارچ کو ملا ہے۔ اِس لیے لیٹ ہونے کے ڈر سے افراتفری میں منتخب سلسلوں، مضامین اور کہانیوں پر تبصرہ کر رہا ہوں۔

''انتخابات کے ذکر سے خوف آنے لگا ہے'' میں الطاف حسن قریشی کے خدشات، حوالے اور تجزیے درست ہیں۔ مَیں بھی کئی بلدیاتی، صوبائی اور قومی انتخابات دیکھ چکا ہوں۔ جھوٹے دعوے، الزام تراشی اور پُرجوش نعرے سننے کے علاوہ کچھ بدلا نہ سننے کو ملا ہے۔ بےحسی، بےمروتی اور اَقربا پروری اِن پر ختم ہو جاتی ہے۔ چہرے، رنگ اور قول و فعل بدلنے میں گرگٹ کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ اب کروڑوں، اربوں کے یہ مالک ہیں۔ زرعی اور شہری جائیداد شمار میں نہیں ہے۔

اب کسی میں لاکھ صلاحیتیں ہوں، ملک کو سنوارنے، بچانے کا مشن ہو اَور غریب کا مسیحا بننا چاہتا ہو، تو وہ اَیسے مضبوط ستونوں کا کیسے مقابلہ کرے گا۔ یوں جانیے جیت پیسے والے کی ہوگی اور وُہ کھیل وہاں سے شروع کرے گا جہاں ختم ہوا تھا۔ دیہاڑی دار طبقے ایسا شکنجے میں آیا ہے کہ خون نچڑ گیا ہے۔ یوں وہ چیخ چلا کر کسی کو متوجہ نہیں کر سکتا۔ کاشت کار کھاد، بیج اور ڈیزل مہنگے ہونے کی وجہ سے دھوپ، چھاؤں سے بےنیاز بیٹھے ہانپ رہے ہیں۔ تنخواہ دار محدود آمدنی اور اخراجات بڑھنے سے بیوی، بچوں، رشتے داروں اور بوڑھے بیمار والدین کے سامنے شرمندہ رہتے ہیں۔ جھکا سر اُٹھانے کی سکت نہیں۔ مَیں موجودہ حالات کو بدترین سونامی سمجھتا ہوں جس کے ذمےدار تینوں بڑی سیاسی جماعتوں کے سیاست دان تھے۔ بس دیکھیے آگے کتنے امتحان آنے والے ہیں۔

''فاخرہ سے صابرہ تک'' میں مصلحت اندیشی کا کیا خوب صلہ ملا کہ خوشی کے چند گھنٹے تک میسر نہیں۔ ایسے صبر سے توبہ ہی بھلی ہے۔ انسان گوشت پوست کا لوتھڑا ہے، اُسے مشین نہیں بننا چاہیے۔ میل، ملاقات اور گھریلو نشست و برخاست سے محبت برقرار رَہتی ہے۔ ایسی زندگی کا کیا فائدہ کہ قریبی رشتوں، دین و دُنیا اور اَپنی ذات کو سنبھالنے، غور کرنے کا ہوش نہ ہو۔ مجھے پروفیسر محمد اسلم بیگ کے خیالات سے اختلاف ہے اور ہر قاری اپنی انفرادی رائے رکھنے میں آزاد ہے۔

''امجد اسلام امجد الوداع'' میں سارا کلام دل کی آنکھوں سے پڑھا ہے، لیکن اُن کا نثری کام، پی ٹی وی کے ڈرامے جس شہرت کے حامل بنے، اُس سے انکار ممکن نہیں۔ مضافاتی، دیہاتی علاقوں میں اُنھوں نے اِسی وجہ سے شہرت پائی اور دِلوں میں بس گئے۔ اگر یہاں مختصر حالاتِ زندگی بیان کر دیے جاتے، تو معلومات میں اضافہ ہو جاتا، لیکن غزلوں، نظموں کی

افادیت سے بھی انکار ممکن نہیں۔

''ابلیس کی انگوٹھی'' خاصے کی چیز ہے جس کا سبق اور خلاصہ آخری دو لفظوں میں ہے۔ بس ذرا دماغ پر زور دینے سے سارا مقصد سامنے آجائے گا۔

''اشرف المخلوقات'' انسانیت کے منہ پر طمانچا ہے۔ حیوان بھی بھوک پیاس میں ایک دوسرے کا خیال رکھتے اور اَپنے ساتھ شامل کر لیتے ہیں، لیکن ہم انسان کتنے خودغرض ہو گئے ہیں کہ ضرورت مند کی مجبوری دیکھ کر لُوٹنے کے چکر میں لگ جاتے ہیں۔ سوچنے کی بات ہے ہم جانوروں سے بھی مات کھا کر پستی میں چلے گئے ہیں۔

''سندھ کی چڑیلیں'' میں ڈرانے اور تسلی دینے جیسے دونوں مختلف کام ایک ساتھ کیے گئے ہیں۔ واقعات، تفصیل، وضاحت اور ایک طرح سے حوالوں، ثبوتوں کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔ اِس لیے انسانی عقل پر اثرانداز ہونا لازمی ہے کیونکہ یہاں اکثریت توہم پرست مخلوق کی ہے۔ اسلامی، شرعی لحاظ سے اِس پر کوئی حتمی روشنی ڈالے، تو جہاں بات کھل جائے گی، وہاں ہم کسی قطعی نتیجے پر بھی پہنچ جائیں گے۔

''خوشی و غم'' کے واقعات دردناک ہیں۔ شکر ہے ماں مان گئی اور وقت پر بیٹی کی رخصتی کر دی۔ ایک گھر میں میت اور ساتھ کے گھر میں شہنائی بج رہی ہوتی ہے۔ یوں جانیے کہ قدرت کو یہی منظور تھا۔ انسان ہواؤں کی زد پر آیا بے بس پتا ہے۔ یوں نہ کہیے کہ ایسی شادی دیکھی نہ سنی۔ حادثات ہماری تاک میں رہتے ہیں۔ جاتے یا واپسی پر کتنے لوگ ٹریفک حادثات میں مر جاتے ہیں۔ دولہے سسرال میں عین شادی کے دن قتل ہو جاتے ہیں۔ تفصیل کی یہ کالم اجازت نہیں دیتا۔

''مقامِ ابراہیمؑ کی زیارت'' میں اُس مقام کی افادیت، تاریخ اور رُوحانیت پر کھل کر لکھا گیا ہے۔ حجرِ اسود اَور مقامِ ابراہیمؑ میں موجود پتھر جنت کے یاقوت ہیں۔ وہاں جا کر بندہ اُنھیں چھونے، چومنے کو بےتاب ہو جاتا ہے۔ خانہ کعبہ کے غلاف سے لپٹ کر رونے سے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔ کتنے پُرکیف لمحے ہوتے ہیں آنسو خود بہنے لگتے ہیں اور بندہ ساری ہدایات بھول کر صرف دل کی مانتا ہے۔ اللہ سب کے ایسے نصیب کرے کہ یہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔ متبرک مقامات کو اَپنے ہاتھوں سے چھوئیں، آمین!

''بُوا'' کو آخری عمر میں شیخیاں بکھیرنے کی کیا ضرورت تھی۔ چند گھنٹے اِترائی رہیں، لڑکیاں حسرت سے آہیں بھرتی رہیں اور بڑھیا چَس لیتی رہی۔ اب ایسی شرمندگی گلے پڑی ہے کہ کون اعتبار کرے گا۔ یہ سب سوچنے، سمجھنے اور سیدھی راہ دِکھانے والے واقعات ہیں جس نے اِس روح کو پا لیا، وہ کامیاب ٹھہرے گا۔

''میانوالی کا ایاز'' میں حنیف کی کامیابیاں اپنی جگہ اٹل حقیقت ہیں۔ والدین کتنا ڈانٹیں، سختی کریں اور حقہ پانی بند کریں، لیکن جب اپنے دل کو ٹھوکر لگے اور منزل پانے کی لگن دماغ میں رچ بس جائے، تو مشکلات بھرے راستے سمٹ جاتے ہیں اور مسافر ہنستا مسکراتا، دیکھنے، حقیقتِ حال جاننے والوں کو حیران کرتا ہوا مشن مکمل کر لیتا ہے۔ تب چہرے پر آئی کامیابی کی مسکراہٹ دلوں کو اتھل پتھل کر دیتی ہے۔ ڈاکٹر محمد حنیف کی کتھا اپنی جگہ محنت کا درس دے رہی ہے، لیکن جو اشارے، استعارے اور اَلفاظ کا ہیر پھیر دے کر محمد عنایت اللہ نے کہکشاں سجائی ہے، تو میری طرف سے دونوں اصحاب مبارک باد وُصول کریں۔

موجودہ شمارے میں معاشرتی، جرائم اور شکار کی کہانیاں نہیں ہیں۔ ''سندھ کی چڑیلیں'' کے تین صفحات ''آلو بھنڈی کا سالن'' کے صفحہ نمبر ۱۰۵ تا ۱۰۸ پر دوبارہ شائع ہو گئے۔ یوں ایک کہانی پڑھنے سے محروم رہے۔ اللہ ادارے کو ترقی دے، آمین۔

(اعجاز حسین سٹھار، نور پور تھل، خوشاب)

قومی سرمایہ کہاں گیا؟

ہمارا ملک اللہ کی عطا و کرم سے ایک ایٹمی قوت ہے۔ آج ۷۵ سال ہوئے ہماری آزادی کو مگر آج بھی ہمارا ملک مختلف النوع بحرانوں اور مسائل کا شکار ہے۔ اس کی وجوہات بہت سی ہیں۔ ان میں سے ایک سیاسی نااہلی اور عیاشی اور اقرباء پروری ہے۔ ہر آنے والا حکمران اپنی صلاحیت اور کام کی حقیقت بتانے کی بجائے سابق حکومتوں کی نالائقی کے راگ الاپنے پر مصر ہے حالانکہ اپنا کیا ہوا کام اور کارکردگی بتانا ضروری ہوتا ہے۔ آج ہر چیز کی قیمت آسمان کو چھو رہی ہے مگر حکمران یرروز سیاسی بھاؤ تاؤ کرنے کی جدوجہد میں مصروف عمل ہیں۔ عوام کا کسی کو خیال نہیں۔ ہر آنے والا وزیراعظم کابینہ کی فوج ظفر موج لیکر آتا ہے اور خوب اقرباء پروری کرکے پانچ سال بعد سابق حکمرانوں کو قصوروار ٹھہرا کر چلا جاتا ہے۔

پچھلے 75 سے ہماری قوم کے ساتھ یہ بھیانک مذاق ہو رہا ہے۔ ہماری قوم خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہی ہے۔ مہنگائی زوروں پر ہے مگر ہمارے ملک کی عدلیہ نجانے کیوں خاموش ہے، کوئی ادارہ حکمرانوں سے یہ پوچھنے کی جسارت نہیں کر رہا کہ آیا ہمارے ملک سے اکٹھا ہونے والا روزانہ کا کروڑوں روپے کا ٹیکس کہاں جا رہا ہے۔ ملک کے سرکاری افسران اور وزراء اور مشیران کتنی بندر بانٹ کر رہے ہیں۔ ہمارے ملک کی معیشت کو تباہ کرنے کا ذمہ دار کون ہے۔ کہاں ہیں وہ وزراء اور مشیر جو پاکستان کو بزنس ٹائیکون بنانے کے دعوے دار تھے۔ انہوں نے حکومت کے نام پر کتنا قومی خزانہ ہڑپ کیا؟

یہ وہ سوالات ہیں جو ہر ریاست کی عدلیہ کو حکمرانوں سے پوچھنے چاہئیں۔ ملک میں بحرانی کیفیت ہے۔ ضروری ہے کہ آئی ایم ایف سے کیے گئے تمام معاہدوں کی تفصیلات پبلک کی جائیں تاکہ پتا چلے کہ ۲۲ کروڑ عوام کے وقار کو کس کس سیاسی لالچی نے اسلام آباد کے بند کمروں میں کفار کی دجالی ٹوکری میں گروی رکھا اور لیے گئے قرض کی رقوم کدھر گئیں۔ اس کے علاوہ ترقیاتی منصوبوں، مختلف پیکجز اسکیموں، اضافی ترقیاتی بجٹ کے نام پر کتنی لوٹ مار ہوئی۔ سالانہ اربوں روپے صحت کی سہولیات کے نام پر رکھے جاتے ہیں مگر سرکاری علاج گاہوں کی حالت اب بھی دگرگوں ہے۔ آیا وہ اربوں روپیہ کدھر جا رہا ہے؟ اگر آپ کو ایمرجنسی میں کوئی مریض سرکاری ہسپتال میں لے جانا پڑے تو جتنی بھی ادویات سوائے پانی کی ڈرپس کے، میڈیکل اسٹور سے خرید کر لانا پڑیں گی تو آپ اندازہ لگائیں کہ اگر ایمرجنسی وارڈ میں بھی ادویات گورنمنٹ مہیا نہیں کر رہی تو پھر وہ اربوں روپے کا بجٹ جھوٹ ہے یا پھر یہ رقوم سیاسی پنڈتوں اور بڑے سرکاری افسران کی تجوریوں میں جا رہی ہیں۔

یہی حال محکمہ تعلیم کا ہے۔ تعلیم کا بجٹ بھی اربوں روپے سالانہ ہے۔ کام اس شعبے میں بھی اکثر ادھورے ہیں۔ ہمارے سرکاری اسکولوں کا رزلٹ پرائیویٹ اسکولوں کے مقابلے میں اب بھی صفر ہوتا ہے۔ حالانکہ حکومت پنجاب نے تو اسکولوں میں لاکھوں اساتذہ ایم اے اور ایم ایس سی اہلیت کے مقرر کر رکھے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ عدالتوں میں موجود قضاء حضرات کو انصاف کرنا چاہیے اور سیاسی لوگوں کا احتساب ہونا چاہیے تاکہ ملک کا سرمایہ ملک کے باسیوں پر خرچ ہو نہ کہ حکمرانوں کی عیاشیوں کا سامان بنے

(ربیعہ اکرام اعوان۔ جہلم)

چند تجاویز

میں اردو ڈائجسٹ کی وساطت سے چند تجاویز وزیراعظم پاکستان تک پہنچانا چاہتا ہوں

پاکستان مشکل مالی حالات سے دوچار ہے۔ اس نازک وقت میں کابینہ اراکین کو کم کر کے تعداد دس پر لائیں تاکہ قوم کا سرمایہ قوم کی مشکلات دور کرنے میں صرف ہو سکے

ہر سرکاری آفیسر جو کہ گریڈ ۱۹ سے لیکر ۲۲ تک کام کر رہا ہے وہ چاہے عدلیہ کا ہے یا آرمی کا، ان کے لیے مفت پیٹرول اور سرکاری گاڑیوں اور سرکاری رہائش گاہوں کی سہولت ختم

کریں کیونکہ ان افسران کی ماہانہ تنخواہیں لاکھوں روپے ہے
واپڈا ملازمین اور افسران کی مفت بجلی کی سہولت ختم کریں۔

پنجاب میں جن اضلاع سے وافر مقدار میں معدنی کوئلہ موجود ہے، وہاں کول پاور پلانٹ نصب کیے جائیں تاکہ ملک میں بجلی کی کمی پوری ہو سکے۔

ممبران قومی اسمبلی کی مراعات میں پچاس فیصد کمی کی جائے تاکہ قوم کا ماہانہ کروڑوں روپیہ بچ سکے

قومی شاہراہوں پر ہر دو کلومیٹر کے فاصلے پر بڑے اسپیڈ بریکر لگائیں جائیں تاکہ حادثات کی شرح میں کمی واقع ہو اور ممکنہ جانی اور مالی نقصان سے بچاؤ ممکن ہو سکے۔

دو سال کے لیے گندم برآمد کرنے پر مکمل پابندی عائد کریں تاکہ ملک کے باسیوں کو تو کم از کم آٹا مل سکے۔

کالا باغ ڈیم کی تعمیر کا حکم دیں۔ اس کی تعمیر ناگزیر ہو چکی ہے تاکہ سیلاب سے بچاؤ ممکن ہو سکے

(ملک محمد اکرام الحق بمقام گتر جہلم)

بھری بزم میں بدلنے کی بات کہہ دی

جب بھی پاکستان میں الیکشن قریب آنا شروع ہوتے ہیں ملک میں ہنگامے شروع ہو جاتے ہیں۔ تمام سیاسی جماعتیں میدان میں کود پڑتی ہیں، ایک جماعت آگ بھڑکاتی ہے اور باقی ماندہ جماعتیں اپنی اپنی بساط کے مطابق اس آگ کو تیز کرنے میں اپنا کردار ادا کرتی ہیں، اور اس آگ کو تیز کرنے میں کوئی بھی سیاسی جماعت کبھی بھی خود آگے نہیں آتی بلکہ اس کے لیے وہ عوام کا استعمال کرتی ہے۔ عوام بھی وہ جو خود پڑھا لکھا اور باشعور گردانتی ہے، یہی سمجھدار عوام اچھے برے اور غلط صحیح کی تمیز کیے بغیر صرف سیاسی جماعتوں کی اندھی تقلید کو ترجیح دیتی ہے۔ سیاسی جماعتوں کے سامنے لڑائی کے وقت ملک کی سلامتی مدنظر نہیں ہوتی بلکہ صرف اور صرف جیت ضروری ہوتی ہے اور اس سلسلے میں عوام بنا سوچے سمجھے ان کا ساتھ دیتی ہے۔

پاکستان کی تاریخ کو مدنظر رکھا جائے تو معلوم ہوگا گھما پھرا کر کم و بیش ایسے ہی حالات ہر نئی حکومت کے آنے سے پہلے دہرائے جاتے ہیں۔ سب سے زیادہ دکھ تو اس وقت ہوتا ہے جب ایک جماعت کے حامی دوسری جماعت کے قائدین کا مذاق اڑاتے ہوئے پائے جاتے ہیں اور ان کی تقلید میں ہماری پڑھی لکھی اور سمجھدار عوام مزید گالیوں کا استعمال شروع کر دیتی ہے۔ کبھی قائدین کی کردار کشی تو کبھی مذہب کا استعمال، مختلف جماعتوں کے حامیوں کا ایک دوسرے سے تصادم، سرکاری املاک کی توڑ پھوڑ، وفاقی حکومت کو ناکام ترین حکومت ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگانا وغیرہ وغیرہ یہ تمام حربے صرف آج کے دور کے نہیں بلکہ پاکستان کی تاریخ میں ان تمام حربوں کا استعمال ہوتا رہا ہے۔ سرسید احمد خان کے ایک مضمون کا اہم حصہ مجھے اکثر یاد آتا ہے:

"رعایا کبھی گورنمنٹ کے رنگ میں نہیں رنگی جاتی بلکہ گورنمنٹ رعایا کا سا رنگ بدلتی جاتی ہے۔ نہایت ٹھیک بات ہے کہ گورنمنٹ عموماً ان لوگوں کا جن پر وہ حکومت کرتی ہے عکس ہوتی ہے۔ جو رنگ ان کا ہوتا ہے اسی کا عکس گورنمنٹ میں پایا جاتا ہے۔ جو گورنمنٹ اپنی رعایا سے تہذیب و شائستگی میں آگے بڑھی ہوتی ہے، رعایا اس کو زبردستی سے پیچھے کھینچ لاتی ہے اور جو گورنمنٹ کمتر اور تہذیب و شائستگی میں پیچھے ہوتی ہے وہ ترقی کی دوڑ میں رعایا کے ساتھ کھنچ جاتی ہے۔"

اس اقتباس کو سامنے رکھوں تو فرانس کی تاریخ یاد آتی ہے جب عوام نے ظلم سے تنگ آ کر اپنے حکمرانوں کا تختہ الٹ دیا تھا۔ شاہی خاندان کے کتنے ہی افراد بے دردی سے پھانسی پر لٹکا دیے گئے تھے کیونکہ وہ اپنی عیش و عشرت میں عوام کا سکھ بھول گئے تھے۔ فرانس کا شاہی خاندان اس زعم میں مبتلا تھا کہ عوام کے ساتھ جو بھی سلوک کیا جائے وہ سہہ لے گی لیکن ہوا اس کے برعکس۔

(مادرا زیب)

جزیرے جن پر پاکستان کا حق

۱۹۴۷ء میں انگریزوں نے غیر قانونی و غیر اخلاقی طور پہ یہ جزائر بھارت کے حوالے کر دیے تھے

اگر آپ نے انڈمان، نیکوبار اور لکشادیپ کا نام سن رکھا ہے تو یہ ضرور سنا ہوگا کہ خلیج بنگال کا یہ ہمسفر ساحل قدرتی خوبصورتی اور دلفریب مناظر سے مالا مال ہے۔ اسٹریٹجک اہمیت کے حامل یہ جزائر بحر انڈو پیسیفک علاقے کو بحر ہند میں انڈونیشیا، تھائی لینڈ، میانمار اور ملاکا سے ملاتے ہیں، جب کہ دنیا کی کچھ مشہور جہاز راں راہیں بھی یہی سے گزرتی ہیں۔

گزشتہ کچھ برس سے ان جزیروں کی جغرافیائی اہمیت مدنظر رکھتے ہوئے بھارت کی جانب سے عسکری، صنعتی اور سیاحتی شعبوں کو فروغ دینے کے لیے کافی مثبت کاوشیں دیکھنے میں آئی ہیں، جس کا مقصد اپنی معیشت کو سہارا دینا ہے۔

۲۰۱۶ء میں انڈین ہوم منسٹری نے سیاحوں کے لیے بغیر کسی پابندی کے ۲۹ آباد اور غیر آباد جزائر کے راستے ہموار کر دیے، جو مل کر انڈمان اور نیکوبار جزیرے بناتے ہیں۔ ویسے تو انڈمان اور نیکوبار کل ۵۷۲ چھوٹے بڑے جزائر پر مشتمل ہے مگر ان میں سے صرف ۳۷ جزائر ایسے ہیں جہاں تک رسائی آسان ہے اور جو کولکتہ اور چنائی سے ۱۲۰۰ تا ۱۴۰۰ کلومیٹر کے فاصلے پر موجود ہیں۔

بحیرہ عرب پر واقع لکشادیپ کے جزائر جغرافیائی طور پر پاکستان کے قریب ہیں۔ ہمیشہ سے مسلم اکثریت والا علاقہ ہونے کی وجہ سے تقسیم ہند کے موقع پر انھیں پاکستان کا حصہ بنتا تھا۔ لکشادیپ جنوب مغربی بھارت سے ۲۰۰ تا ۴۰۰ کلو میٹر دور ہے۔ یہ ۳۶ جزائر کا مجموعہ ہے۔ جزیرے بھارت کی یونین ٹیریٹری یعنی مرکزی علاقے کہلاتے ہیں۔

انڈمان، نیکوبار کو دوسری جنگ عظیم کے بعد بہت سے قبائل نے آ کر آباد کیا۔ خاص طور پر ۱۹۵۰ء سے ۱۹۷۱ء تک مشرقی پاکستان سے بہت سے مسلمان مہاجرین نے اس جگہ کو رونق بخشی۔ اس سے قبل ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۵ء تک جاپانی فوج نے ان جزیروں پر قبضہ کیا تھا مگر برطانیہ نے قبضہ واپس لے کر ۱۹۴۷ء میں یہ جزائر بھارت کے حوالے کر دیے۔

اس کی ایک وجہ چاروں طرف سے سمندر سے گھرے انڈمان میں موجود ''کالا پانی'' کے نام سے ماضی کی مشہور جیل بھی ہے، جہاں ۱۸۵۷ سے لے کر بعد تک آزادی کی جنگ لڑنے والے ہندوستانی قیدیوں کو رکھا گیا اور سزا دی جاتی تھی۔

آج انڈمان، نیکوبار جزائر پر آبادی کی اکثریت بنگالی، تامل ہندو، مسلمانوں اور مسیحی لوگوں کی ہے۔ مگر جزائر میں سے بھی بہت ہی کم جزیرے ایسے ہیں جہاں باہر سے آنے والوں کو درست معنوں میں خوش آمدید کہا جاتا ہے۔ ان میں سرفہرست انڈمان کے کچھ جزیرے ہیں، جن میں دارالحکومت پورٹ بلیئر سب سے نمایاں ہے۔ ماحولیاتی لحاظ سے حساس ان جزائر میں جانوروں اور پرندوں کی کچھ ایسی نایاب نسل اور اقسام ملتی ہیں، جو شاید ہی دنیا میں کہیں اور پائی جاتی ہوں۔

جہاں ایک طرف بھارت ان جزائر پر صرف اپنی حکمرانی کا بے بنیاد دعویٰ کرتے ہوئے یہاں سے زرمبادلہ کمانے کے خواب دیکھ رہا ہے، وہیں دوسری جانب سرحد

میں ان جزائر کی سٹریٹیجک اہمیت کی وجہ سے بڑھتی چینی مداخلت مدنظر رکھتے ہوئے نئی دہلی پہلے سے موجود اپنی فوج مزید بڑھا رہا ہے۔

بھارت نے اس خطے میں چین کے خلاف امریکہ کی مدد سے اپنی بحری طاقت کافی حد تک بڑھائی ہے۔ بھارت ۱۹۸۵ء سے ان جزیروں پر اپنی دفاعی طاقت بڑھا رہا ہے۔ بحر جنوبی چین اور بحر ہند کی بدلتی صورتحال میں انڈمان جزائر کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں، جب کہ بحر ہند ملاکا سے بھی جڑا ہوا ہے۔

ویسے تو ۲۰۰۱ء میں بھارت نے اس خطے میں پہلی مرتبہ اپنی تینوں بحری، زمینی اور فضائی افواج کو ایک ساتھ تعینات کر کے دنیا کی توجہ اس طرف مبذول کروائی مگر ۲۰۰۴ء کے سونامی سے آنے والی تباہ کاریوں سے جہاں دنیا کے بہت سے ممالک بالخصوص انڈونیشیا میں بہت زیادہ نقصان ہوا، وہیں انڈمان، نکوبار اور لکشادیپ کے جزائر بھی ان تباہیوں سے بچ نہیں سکے اور ہزاروں لوگ لقمہ اجل بن گئے۔ اس کے بعد دنیا ایک مرتبہ پھر ان کی طرف متوجہ ہوئی۔

۲۰۱۲ء میں بھارت نے اس جگہ نہ صرف اپنی فضائی اور سمندری حدود کا دائرہ کار مزید وسیع کیا بلکہ مختلف ذرائع ابلاغ کے ذریعے دیگر مشرقی ایشیائی ممالک کے ساتھ تجارت، انفراسٹرکچر، صحت اور تعلیم کے شعبوں کو مزید فروغ دینے کے لیے کوششیں بھی کیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بھارت اتنی بوکھلاہٹ میں تیزی سے ان جزائر پر اپنی حکومت کا دعویٰ کرنے کے لیے کیوں کوشاں ہے؟

اس کی ایک کڑی تین جزائر کے نام کی تبدیلی بھی ہے۔ نصف صدی گزرنے کے بعد بھی بھارت کے عدم تحفظ کا یہ عالم ہے کہ ۲۰۱۸ء میں بھارت کی مرکزی حکومت نے تین جزائر کے پرانے نام بدل دیے، جس کا اعلان نریندر مودی نے پورٹ بلیئر کے دورے کے دوران کیا۔ اس فیصلے کے

نیل آئی لینڈ اور ہیولوک آئی لینڈ کے نام
نت روز آئی لینڈ، تبدیل کر کے نیتا جی سباش چندر بوس جزیرہ، شہید دویپ اور سوراج دویپ رکھ دیے گئے۔

انڈمان، نیکوبار اور لکشادیپ جزائر کا وہ گروپ ہیں جو انڈین انڈیپینڈنس ایکٹ ۱۹۴۷ء کی دفعات کے مطابق برطانوی حکومت نے بھارت کے حوالے کیے۔ انگریزوں نے ۱۹۵۰ء تک یہ جزیرے اپنے پاس رکھے اور پھر پاکستان کو اس کا حصہ دینے کے بجائے تمام جزیرے بھارت کے حوالے کر دیے۔

انڈمان اور نیکوبار پر اپنی خودمختاری کے دعوے کیے تھے۔ جب کہ انڈونیشیا نے ۱۹۶۵ء کی جنگ کے دوران انڈمان، نیکوبار اور لکشادیپ جزائر پر پاکستان کے دعوے کی حمایت کا بھی اعلان کیا تھا۔

ان جزائر کا بھارت کو دیا جانا تقسیم ہند کے بنیادی اصول (یعنی مسلم اکثریتی علاقے پاکستان کو دیے جائیں گے) کے خلاف تھا۔ بعد ازاں جزیروں کی غیر منصفانہ تقسیم کے بعد کسی بھی ابھرتے سیاسی خطرے کے پیش نظر بھارت نے ۱۹۵۶ء میں ان جزیروں کو یونین ٹیریٹری یعنی مرکزی علاقہ قرار دے

۱۹۴۷ء کی تقسیم ہند سے برطانوی راج کے خاتمے اور آزاد جنوبی ایشیا کا طلوع ہونے والا سورج بہت سے اہم جیو سٹریٹجک نتائج اور علاقوں کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ ان میں انڈمان، نیکوبار اور لکشادیپ بہت اہمیت کے حامل تھے، جن کو حاصل کرنے کے لیے بھارت، پاکستان، حتیٰ کہ آسٹریلیا تک نے کوشش کی۔

انڈونیشیا نے بھی سماترا سے قریب ہونے کی وجہ سے

دیا۔ جیسے کہ حال ہی میں مودی سرکار نے ۲۰۱۹ء میں کشمیر اور لداخ کو قرار دیا۔

تقسیم ہند کے وقت بانیِ پاکستان قائداعظم محمد علی جناح ان جزائر کو مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان کے درمیان ایک اہم ربط کے طور پر دیکھنا چاہتے تھے کیونکہ دونوں سمندری اور فضائی جہازوں کے لیے درمیان میں رکنے کے لیے استعمال کیے جا سکتے تھے۔ قائداعظم محمد علی جناح نے اپنا نقطہ نظر بہترین طور پر سیکریٹری آف سٹیٹ آف انڈیا کو لکھے گئے خط

میں بھی بیان کیا تھا۔

اس خط کے مطابق: 'انڈمان، نیکوبار اور لکشا دیپ کے جزائر تاریخی لحاظ سے کبھی ہندوستان کا حصہ نہیں تھے بلکہ یہ جزائر حکومت ہند کے زیر انتظام برطانوی ملکیت تھے جو ۱۹۳۵ء کے آئین کے ایکٹ کے تحت گورنر کیے جاتے تھے۔

مزید لکھا گیا: 'ان جزائر کے پرانے باسیوں کی بات کی جائے تو آبادی کی اکثریت بھی ان قبائل پر مشتمل ہے جو نسلی لحاظ سے کبھی ہندوستان سے جڑے ہوئے نہیں تھے بلکہ ہمیشہ سے مسلم اکثریت کے حامل رہے ہیں۔ ان علاقوں پر ایک دور میں مسلمانوں کے عظیم سپہ سالار ٹیپو سلطان کی حکومت تھی، مگر ۱۷۹۹ء میں ٹیپو سلطان کی شہادت کے بعد انگریزوں نے یہ مسلم اکثریتی علاقے ہندوستان میں شامل کر دیے۔

چنانچہ مذہبی اور ثقافتی لحاظ سے ان جزائر پر پاکستان کا دعویٰ بہت مضبوط ہے اور سمندری راستے کی اہم سٹر-یٹجک پوزیشن پر قائم یہ جزائر مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان بھی رابطے کا واحد اہم ذریعہ ہیں۔ دوسری جانب تقسیم ہند کے وقت ڈومین آف انڈیا کا ایسا کوئی دعویٰ نہیں تھا، جس کے تحت وہ پاکستان کا حصہ نہ بنتے۔'

جواہر لال نہرو نے وائسرائے ہند لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے ساتھ اپنے اچھے تعلقات استعمال کرتے ہوئے اس بات کو یقینی بنایا کہ یہ جزائر بھارت کا حصہ بن جائیں۔ بعد ازاں ایسا ہی ہوا جب کہ آغاز میں برطانوی راج ان جزائر کو کراؤن ٹیریٹری کے طور پر رکھنا چاہتے تھے۔

قوم پرست ہندو سیاستدان، سردار ولبھ بھائی پٹیل کو ڈر تھا کہ تقسیم ہند کے وقت پاکستان اپنے حق کے لیے ان جزائر پر باآسانی حملہ کر سکتا ہے۔ لہٰذا بھارتی بحریہ کے دستوں نے ان جزائر پر بھارت کا پرچم لہرا کر اپنے جھوٹے دعوے کو روح بخشنے کی ناکام کوشش کی۔ اس طرح مسلم اکثریت پر مشتمل ٹیپو سلطان کی سرزمین بھارت کے حوالے کر دی گئی۔

لکشا دیپ کو لاکادیو جزیرے کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ ۲۰۲۰ء کی مردم شماری کے مطابق لکشا دیپ جزیرے کی آبادی تقریباً ٦٦ ہزار نفوس پر مشتمل ہے۔ ان میں سے مسلمان ٩٦ فیصد سے زیادہ ہیں جبکہ ہندو آبادی تین فیصد سے بھی کم ہے۔

اب انڈین انڈیپنڈنس ایکٹ ۱۹۴۷ء کی دفعات مد نظر رکھتے ہوئے اقوام متحدہ پر لازم ہے کہ وہ ان تینوں انڈمان، نیکوبار اور لکشا دیپ میں سے مسلم اکثریت علاقوں بالخصوص لکشا دیپ کو بھارت سے لے کر پاکستان کے حوالے کر دے۔

یہ یاد رہے کہ انڈین انڈیپنڈنس ایکٹ ۱۹۴۷ء برطانیہ نے منسوخ نہیں کیا تھا اور وہ اب بھی نافذ العمل ہے۔ لہٰذا آج بھی برطانیہ کی حکومت منصفانہ تقسیم مکمل کر سکتی ہے۔ ان جزیروں کی پاکستان کو منتقلی نہ صرف اہل پاکستان کو ان کا کھویا ہوا حق دے گی بلکہ خلیج بنگال اور بحیرہ عرب میں پاکستان کے دوسرے ممالک کے ساتھ سفارتی اور اقتصادی تعلقات بھی بہتر ہوں گے۔ اس سے پاکستان کے رقبے میں سینکڑوں مربع کلومیٹر اضافہ ہوگا۔ اس نامکمل ایجنڈے کی تکمیل انڈو پیسیفک ریجن میں کشمیر، سرکریک اور جوناگڑھ جیسے فلیش پوائنٹس کو حل کرنے میں بھی مدد دے سکتی ہے

NOTICE INVITING TENDER

Sealed tenders based on item rates / percentage above or below on approved estimated (DNIT) amount are hereby invited, for the works mentioned below from the Contractors / Firms enlisted / renewed with C&W Department for the current financial year **2022-23** in the field of Highways Works for relevant category and above.

Tender documents can be obtained from the date of publication of invitation to the bids in the newspaper from any below mentioned offices, upon written request accompanied with attested copies of renewal letter of PEC License, Identity Card of Contractor / Managing Partner / Director of the firm along with registered power of attorney and on payment of prescribed Tender Fee in the form of Challan No. 32-A under C-02716-Others in the Main Branch of National Bank of Pakistan, Hafizabad.

i. Chief Engineer (North), Punjab Highway Department, Lahore.
ii. Commissioner Gujrat Division, Gujrat.
iii. Superintending Engineer, Highway Circle, Gujrat.
iv. Deputy Commissioner, Hafizabad.
v. Executive Engineer, Highway Division, Hafizabad.
vi. Assistant Commissioner, Concerned.

Tendered rates and amount should be filled in figures as well as in words and tenders should be signed as per general directions given in the Tender Document. No rebate on tendered rates will be acceptable.

Tender will be issued from the date of publication upto **11.04.2023** and will be received on **12.04.2023** from **10:30 AM** to **11:00 AM** and same will be opened on **11:30 PM** simultaneously in the offices of the **Chief Engineer (North), Punjab Highway Department, Lahore** and **Commissioner Gujrat Division** and will be opened simultaneously on fixed date and time by the respective Tenders Opening Committee at the

اُردُو ڈائجسٹ

اگر آپ کو اُردُو ڈائجسٹ اپنے قریبی بک اسٹال پر نہیں مل رہا یا ڈائجسٹ خریدنے میں کسی بھی مشکل کا سامنا ہے،
تو آپ براہِ راست ہماری ایجنسی سے رابطہ کر کے منگوا سکتے ہیں۔

نام ایجنسی	شہر	ڈیلر	فون نمبر
گلستان نیوز ایجنسی	کراچی کینٹ	جناب ارشد نون	0300-2680248
سلیمان اینڈ برادرز	حیدرآباد	جناب رضوان ترکی	0321-3060477
چوہدری برادرز	صادق آباد	جناب عاصم منیر	068-5705624
چوہدری امانت برادرز اینڈ سنز	رحیم یار خان	جناب عثمان منیر	0305-5872626
چوہدری بشیر امانت علی اینڈ برادرز	خان پور	جناب قیصر	0333-7472654
اشفاق نیوز ایجنسی	بہاولپور	جناب ملک عباس	0300-6301461
اشفاق نیوز ایجنسی	ملتان کینٹ	جناب ملک عباس	0300-6301461
رحمت بک اسٹال	اوکاڑہ	جناب ایاز	0343-6755546
افضل نیوز ایجنسی	پشاور	جناب افضل	091-2213515
شیخ محمد حسین	جھنگ	جناب عامر صاحب	0333-6752004
المسعود ڈسٹری بیوٹرز	ساہیوال	جناب عدنان صاحب	0346-8190418
نیو پنجاب نیوز ایجنسی	راولپنڈی	جناب خالد	0345-5058891
ملک اینڈ سنز	سیالکوٹ	جناب ہمایوں ملک	0300-8711949
محمد اقبال پرویز نیوز ایجنٹ	گوجرانوالہ	جناب اقبال پرویز	0333-8103489
پاکستان سٹینڈرڈ بک اسٹال	سرگودھا	جناب رضوان	0300-6040080
شفیق نیوز ایجنسی	لاہور	جناب شفیق	0300-9477121
حبیب لائبریری ترگی	واہ کینٹ	حبیب اللہ قمر	0301-5497007

براہ راست ہم سے منگوانے کے لیے اس نمبر پر رابطہ کریں۔

042-35290707 0333-4713631

above venues in the presence of intending Contractors or their representatives who opt to be present.

Conditional tenders and tenders not accompanied with Earnest Money @ 2% of the estimated cost in shape of **CDR / Bank / Cashier's Cheque of any scheduled Bank** and in favour of Executive Engineer, Highway Division, Hafizabad and attested copies of registered partnership deed and power of attorney in case of firms will not be entertained.

PPRA Rules shall be followed for rejection of tender.

Sr. No.	Name of Works	Estimated Cost Rs. in Million	Earnest Money Rs. in Million	T.S. No. & Date	Tender Fee (Rs.)	Time Limit
1	Special Repair of road from Kot Qadir Bakhsh to Kot Kameer L = 2.13 Kms in District Hafizabad.	30.000	0.600	T.S. vide C.E. H/Way Deptt. LHR Letter No. 1812/Plg dated 21.03.2023	2,000/-	03 Months
2	Special Repair of road from Kot Qadir Bakhsh to Kot Kameer L = 2.13 Kms in District Hafizabad.	190.000	3.800	T.S. vide C.E. H/Way Deptt. LHR Letter No. 1811/Plg dated 21.03.2023	2,000/-	03 Months

Executive Engineer
Highway Division, Hafizabad

Superintending Engineer
Highway Circle, Gujrat.

IPL-2366

TENDER NOTICE

1. Sealed tenders based on item rates / percentage rates above or below on approved estimated (DNIT) amount are hereby invited, for the works mentioned below from the Contractors / Firms who have enlisted from PEC for the current financial year **2022-23** in relevant category C-6 or above in accordance with PPRA Rules 2014 (with up to date amendments) valid Registration of applicant (Company / Firm) with PEC in relevant category or above having specialized codes such as CE09, CE10 etc. depending upon the type of project.

2. Tender documents can be obtained from the date of publication of invitation to bids in the newspaper from any of the below mentioned offices, upon written request accompanied with attested copies of PEC License, Identity Card of Contractor / Managing Partner / Director of the firm along with registered power of attorney and on payment of prescribed Tender Fee in the form of CDR only of any scheduled bank.

   i. Chief Engineer, Punjab Buildings Department, Central Zone, Lahore.
   ii. Commissioner Sahiwal Division, Sahiwal.
   iii. Superintending Engineer, Buildings Circle, Sahiwal.
   iv. Deputy Commissioner, Pakpattan.
   v. Executive Engineer, Buildings Division, Pakpattan.
   vi. Assistant Commissioner, Pakpattan.

3. Tendered rates and amounts should be filled in figures as well as in words and tenders should be signed as per general directions given in the Tender Document. No rebate on tendered rates will be acceptable.

4. Tenders will be received in the offices of **Chief Engineer Punjab Buildings Department, Central Zone, Lahore** and **Commissioner Sahiwal Division** and will be opened simultaneously on fixed date and time by the respective Tenders Opening Committee at the above venues in the presence of intending Contractors or their representatives and who opt to be present.

5. Conditional tenders and tenders not accompanied with Earnest Money **@ 2%** of the estimated cost in shape of CDR of any Schedule Bank and attested copies of registered partnership deed and power of attorney in case of firms will not be entertained.

   The procuring agency / Superintending Engineer reserves the right of rejecting all of the tenders without assigning any reasons thereof.

6. All bids / proposals can be rejected under PPRA Rules-35 Sub Rule (1) to (5).

   The procuring agency may reject all bids or proposals at any time prior to the acceptance of a bid or proposal.

   The agency shall upon request communicate to any bidders the grounds for its rejection of all bids of proposals, but shall not be required to justify those.

   Last date for submission of application of tenders on 12.04.2023.

   Date of issuance of tenders on 13.04.2023.

   Date of receipt / Opening of tenders on 14.04.2023 Receipt Time 11:00 PM Opening Time 11:30 PM

Sr. No.	Name of Work	Estimated Cost Rs. In Million/ Earnest Money Rs. In Million	T.S. No. & Date	Tender Fee (Rs.)	Time Limit	Last date for submission of applications	Last date for issuance of tender documents	Date for opening of tenders
1	Special Repair of Civil Rest House Arifwala District Pakpattan	12.848 0.257	C.E. PB (B) C.Z. LHR vide No. 3394/D dated 21.03.2023	2,000/-	03 Months	12.04.2023	13.04.2023	14.04.2023

EXECUTIVE ENGINEER
Buildings Division, Pakpattan

SUPERINTENDING ENGINEER
Buildings Circle, Sahiwal.

IPL-2367

غزل

پایا نہ کاوشوں کا ہم نے ثمر ابھی
وہ ہو سکے نہ ہم سے شیر و شکر ابھی

عرصہ ہوا ہے رہتے ہمیں جس مکان میں
صد حیف کہہ نہ پائے اُسے اپنا گھر ابھی

واعظ نہ گھپ اندھیروں کی ہم کو وعید دے
خود اپنے سائے سے مجھے لگتا ہے ڈر ابھی

لو آسماں بھی زد میں اندھیروں کی آ گئے
باقی ہے آندھیوں کا زمیں پہ سفر ابھی

تم کیا گئے کہ رونقِ بستی بھی لے گئے
افسردہ و اُداس ہے دل کا شہر ابھی

میل آئے بے رخی سے نہ اُن کے دل حزیں
کرتے ہیں خامیاں وہ مری درگزر ابھی

ہم اُن کی بے وفائی کا شکوہ کریں تو کیوں
باقی ہے کچھ زبیر آہی میں کسر ابھی

سو بار ہم سنا تو سکے اُنھیں حالِ دل
پھر بھی ہمارے دل سے ہیں وہ بے خبر ابھی

تم جان کے بھی بنتے ہو انجان جانے کیوں
اچھا نہیں یہ آپ کا صَرفِ نظر ابھی

وعدہ اُنھیں جو یاد دلایا، تو ہنس پڑے
پھر بے رخی سے کہنے لگے صبر کر ابھی

لو دیکھتے ہی دیکھتے نظریں بدل گئیں
شاید اُنھیں کسی کی لگی ہے نظر ابھی

بدلا ہے یوں تو مے کدۂ شوق کا نظام
پیرانِ مے کدہ کی وہی کروفر ابھی

چھو کر غلافِ کعبہ نہ اترائے میرے دوست
باقی ہے دل کے رستے کا مشکل سفر ابھی